احسن الکلام
فی
ترک القراءۃ خلف الامام
شیخ الحدیث حضرۃ مولانا محمد سرفراز خان صفدر
ناشر
مکتبہ صفدریہ
نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر
گوجرانوالہ، پاکستان

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا الآیۃ

(قرآن کریم)

وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا (الحدیث)

احسن الکلام

فی

ترکِ القرأۃ خلف الامام

جلد اوّل

جس میں قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ وتابعینؒ واتباعِ تابعینؒ اور دیگر جمہور فقہاءؒ اور محدثین عظامؒ سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی بھی قسم کی قرأت عموماً اور سورۂ فاتحہ کی قرأت خصوصاً ممنوع ہے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأت کرنا قرآن کریم، حدیث صحیح اور اجماع کے خلاف ہے اور فی نفسہٖ منکر اور شاذ ہے اور جہری نمازوں میں حضرات ائمہ اربعہؒ کا اتفاق ہے۔ نیز عقلی اور قیاسی دلائل سے اس مسئلہ پر فیصلہ کن بحث کی گئی ہے اور فریقِ ثانی کو مسکت جوابات دیے گئے ہیں اور اس طبع میں "خیر الکلام" اور "الاعتصام" میں کیے گئے اعتراضات کے جوابات کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تالیف

ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر

طبع دہم ـــــــ جون ۲۰۰۶ء

نام کتاب ـــــــ احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام

مؤلف ـــــــ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم

تعداد ـــــــ ایک ہزار

مطبع ـــــــ فائن بکس پرنٹرز لاہور

ناشر ـــــــ مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

قیمت ـــــــ دو سو پچیس روپے

ملنے کے پتے

- مکتبہ صفدریہ نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ
- مکتبہ حلیمیہ جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ العارفی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
- مکتبہ رشیدیہ حسن مارکیٹ نیو روڈ مینگورہ
- مکتبہ نعمانیہ کبیر مارکیٹ لکی مروت
- مکتبہ امدادیہ ملتان
- مکتبہ حقانیہ ملتان
- مکتبہ مجیدیہ ملتان
- مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
- اسلامی کتب خانہ اڈا کامی ایبٹ آباد
- مکتبہ فریدیہ ای سیون اسلام آباد
- دار الکتاب عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
- مدینہ کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ
- مکتبہ قاسمیہ جمشید روڈ نزد جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی
- مکتبہ فاروقیہ حنفیہ عقب فائر بریگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ
- کتاب گھر شاہ جی مارکیٹ گاجرہ

فہرست مضامین

تصدیقات علماءِ کرام

تمّ بعون اللہ تعالیٰ

تصدیقاتِ علماءِ کرام

فخر الاماثل قدوۃ الصلحاء حکیم الاسلام الحاج الحافظ

حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم، دیوبند۔

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گکھڑ سے رخصت ہو کر بعافیت لاہور اور وہاں سے دیوبند پہنچا۔ احسن الکلام کا مطالعہ یاد اور شوقِ طبعی دامن گیر تھا۔ ماشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ فاتحہ میں اسے ایک بحرِ ذخّار پایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس سعی و محنت کو قبول فرمائے اور امت کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے حسبِ وعدہ تقریظ لکھنے کا ارادہ کیا۔ لکھنے بیٹھا تو غیر متوقع طریق پر تحریر طویل ہوگئی جو احسن الکلام سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا۔ تقریباً پانچ صفحے فل سکیپ کے ہو گئے۔ اور تقریظ کی صورت نہ رہی۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو آپ اس میں سے وہ زائد حصہ حذف کر دیں جس میں غالی اہلِ حدیث کو ناصحانہ خطاب ہے اور اگر اسے غیر ضروری نہ سمجھیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ اسے تقریظ کے بجائے کتاب کا مقدمہ بنا دیجیے جو میری طرف سے ہو جائے گا۔ مقدمہ کے لیے یہ تحریر موزوں رہے گی، جو بھی صورت مناسب ہو کر لی جائے۔

میں بحمد اللہ تعالیٰ بعافیت ہوں۔ اُس شب کی مہمان نوازی کا شکر گزار ہوں۔ والسلام

محمد طیّب

دیوبند

۷۵/۴/۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ (سورۃ الزمر)

محترم الفاضل مولانا محمد سرفراز خاں صاحب دام بالمجد والفواضل کی لطیف ترین تالیف احسن الکلام فی ترک قرأۃ الفاتحہ خلف الامام سے استفادہ کا شرف میسر ہوا۔ مطالعہ کے وقت ہر اگلی سطر پر آنکھوں میں نور دل میں سرور اور روح میں ثلج یقین بڑھتا جاتا تھا، اثبات مسئلہ کے سلسلہ میں مصنّف نے سلاست بیان زور استدلال منصفانہ تنقید اور عادلانہ مدافعت سے مسئلہ کے تحقیقی اور الزامی دونوں پہلوؤں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کا مثبت حصہ بہت زیادہ دل آویز ہے جس میں متین انداز کے ساتھ مضبوط دلائل اور مؤکّد شواہد سے مسئلہ کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور ساتھ ہی مسئلہ کے دفاعی پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔ کیونکہ مثبت پہلو کے ساتھ جب تک اس کا منفی پہلو صاف نہ ہو مسئلہ من کل الوجوہ مستحکم نہیں ہوتا مصنف نے جہاں مثبت پہلو سے ماننے والوں کے لیے سینہ کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ وہیں منفی پہلو کے دفاع سے نہ ماننے والوں اور ان طعنہ زنوں کا منہ بند کر کے ان پر حجت بھی تمام کر دی ہے جنہیں فاتحہ اور ترک فاتحہ سے زیادہ صرف گروہی تعصب اور اس کا تفوّق ہی زیادہ سے زیادہ پیش نظر ہے، لیکن ان کے مقابلے میں یہ تردید مسئلہ کے کسی اجتہادی پہلو کی تردید نہیں بلکہ ان کے تخیلات اور غیر معتدل رویہ کی تردید ہے ورنہ ایک فروعی اور ایک اجتہادی اور اوپر سے مختلف فیہ مسئلہ کے ایک پہلو کے اثبات و تحقیق پر اتنا زور دیا جانا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی جانب مخالف اور اس کے ماننے والوں کی تردید یا مخالفت کے لیے نہیں ہے نہ ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے فروعی مسائل نہ تو تبلیغی ہیں کہ انہیں دوسروں تک پہنچایا جانا اور ان کا منوایا جانا ضروری ہو اور نہ معاذ اللہ تکذیبی ہیں کہ مخالف رائے رکھنے والوں کو جھٹلایا جانا اور ان کی تکذیب کیا جانا

روا ہو بلکہ محض ترجیحی ہیں جن میں حق و باطل کا نہیں محض خطا و صواب کا اختلاف ہے وہ بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ اپنا صواب بھی احتمال خطا کے ساتھ اور دوسروں کی خطا بھی احتمال صواب کے ساتھ مقید ہے اور پھر اس میں بھی دوسرے کی یہ محتمل خطا اس یقین کے ساتھ ہے کہ وہ اور اس کے ماننے والے اس پر مستحق اجر و ثواب اور مستوجب نجاۃ و فلاح بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذو جہتین مسائل میں جن میں جانب مخالف باطل بھی نہ ہو وہ خطا قطعی بھی نہ ہو اور پر سے نجاۃ و اجر کا استحقاق بھی یقینی ہو کسی فریق کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے کہ وہ مسئلہ کی مخالف سمت کے ساتھ طعنہ زنی اور تشنیع سے پیش آئے یا اسے باطل قرار دے کر ماننے والوں کو مبطل قرار دے۔ اور اس کے بالمقابل اپنی مسلمہ جانب کی دعوت و تبلیغ کرنے لگے۔ فریقین کو اگر حق پہنچتا ہے تو صرف یہ کہ وہ وجوہ دلائل سے اپنی مسلمہ جانب کو مسلک سنت ثابت کرتے ہوئے اس کی ترجیح واضح کر دیں جس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کو تہمت بدعت سے بری ثابت کر کے دائرہ سنت میں محدود کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ مسئلہ کی جس سمت کو انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ہوائے نفس سے نہیں بلکہ وجوہِ شرعیہ سے ہے۔ اس ترجیحی سلسلہ میں فریق ثانی کا ابطال یا معاذ اللہ تعالیٰ اضلال کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ اس کی طرف التفات کی کوئی وجہ ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان فروعی اختلافات میں سرے سے فریق بندی ہی نہیں ہے کہ فریق اول اور فریق ثانی کی بحث شروع کر کے ہل من مبارز کی زور آزمائیاں دکھلائی جائیں۔ فاتحہ خلف الامام ہو یا آمین بالجہر و بالسر، یا رفع یدین ہو یا ترجیع اذان وغیرہ ان میں ہر مسئلہ کا مثبت اور منفی پہلو ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ مسئلے دو نہیں ہیں اور وہ پہلو بھی روایتی اور درایتی بحث سے سامنے آتے ہیں۔ شریعت نے بالاستقلال ابتدا ہی سے بیکدم دو متضاد پہلو عمل کے لیے سامنے نہیں رکھے۔ اب یہ دو پہلو خواہ زمانے کے تفاوت سے سامنے آئے کہ ابتدا میں ایک پہلو صاحب شریعت کے زیر عمل آیا اور آخر میں دوسرا جس سے ناسخ و منسوخ کی بحث پیدا ہوئی یا عزیمت و رخصت کے فرق سے سامنے آئے جس سے اولیٰ غیر اولیٰ کی بحث پیدا ہوئی یا تساوی کے ساتھ سامنے لائے گئے جس سے دونوں پہلوؤں میں

تخییر کی بحث پیدا ہوئی، بہر حال کسی بھی معیار سے سامنے آئے ہوں ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو رہیں گے۔ جس میں ناسخ منسوخ اولیٰ غیر اولیٰ افضل غیر افضل عزیمت، رخصت تخییر و عدم تخییر کے معیار سے ترجیحات سامنے آتی رہیں گی اور وہ اپنے وقت اور ظرف اور کیف و کم کی ترجیحات کے ساتھ امت کے زیر عمل آتے رہیں گے جس سے پیغمبر صادق و مصدوق کا کوئی ارشاد اور ارشاد کا کوئی پہلو متروک العمل نہ رہے گا بلکہ ہر پہلو امت کے کسی نہ کسی طبقہ میں زیر عمل رہے گا اور اس طرح پوری اُمت نبی کے پورے ارشادات کی حامل اور عامل رہے گی۔ اندریں صورت ایک روایت دوسری روایت کی ایک حدیث دوسری حدیث کی اور ایک آیت دوسری آیت ہی کی خود ہی فریق نہیں ٹھہرتی چہ جائیکہ رجال حدیث یا حاملین آیت و روایت باہم ایک دوسرے کے فریق قرار پائیں اور آپس میں نبرد آزما ہوں۔ اور ہل من مبارز کہہ کر پہلوانوں کی طرح اکھاڑوں میں اتریں اور زور آزمائی کے جوہر دکھلائیں گویا آیات و روایات اسلحہ ہیں۔ حاملین آیات و روایات جنگی سپاہی اور شریعت ان کا میدان مبارزہ و مقابلہ، ظاہر ہے کہ حتمی طور پر سب سے پہلے اسلحہ ٹکراتے ہیں پھر سپاہی تو اس مبارزت طلبی کا مطلب یہ ہوا کہ خود آیات و روایات میں کوئی حقیقی تعارض اور تصادم ہے جس کی مجبوری سے حاملین آیات و روایات کو بھی باہم ٹکرانا پڑا۔ حالانکہ یہ صورت حال خود کتاب و سنت سے مدفوع ہے اگر عیاذاً باللہ تعالیٰ ان مختلف فیہ مسائل کی ذاتی خاصیت ہی یہ نبرد آزمائی اور مبارزت طلبی ہوتی تو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ و ائمہ مجتہدینؒ اور علمائے راسخین کو تو اس لڑائی بھڑائی اور چیلنجوں سے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ ملتی۔ کیونکہ وہ تو ان مسائل میں مجتہد اور مدعی کی حیثیت رکھتے تھے اور مدعی کو اپنے دعوے پر بہ نسبت ناقل اور تابع کے زیادہ جمود اور استقلال ہوتا ہے جب ناقل اور تابع محض ہو کر ہمیں ان لڑائیوں سے فرصت نہیں تو مدعیوں کو تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان ہل من مبارز کے چیلنجوں سے مہلت نہ ملنی چاہیئے تھی۔ اور ان کی لڑائی ہم سے کہیں زیادہ شدید اور مدید ہونی چاہیے تھی۔ لیکن صورت واقعہ برعکس ہے کہ قرون اولیٰ میں ان علمی اور فروعی مسائل کی جوانب و شقوق میں ترجیح و اختلاف کے باوجود ان حضرات کے قلوب میں ہل من مبارز اور چیلنجوں کا تصور تک نہیں ملتا چہ جائیکہ تصادم کا کوئی عمل دستیاب ہو اس لیے بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہماری مبارز طلبیاں اور شرعی لائنوں میں نبرد آزمائیاں ان مسائل کی خاصیت نہیں بلکہ محض ہمارے نفوس کی شرارتیں ہیں جن میں جذبات نفس

نکالنے کا جب کہیں اور موقع نہیں ملتا تو ہم یہ کارِ خیر اس شرعی میدان میں انجام دے لیتے ہیں۔ بلیے کی مار ترازو کی ڈنڈی۔ اس لیے میں تو اس تصور پر ہوں کہ جب صورت تعارض کے باوجود ایک حدیث دوسری حدیث کا فریق نہیں تو ان مسائل کے سلسلے میں مرجحین کا کوئی طبقہ کوئی دوسرے طبقہ کا فریق کیسے قرار پا سکتا ہے؟ میرے خیال میں کوئی شافعی، مالکی، اہل حدیث ان مسائل کی ترجیحات کی حد تک نہ حنفی کا فریق ہے اور نہ حنفی ان میں سے کسی کا ان میں اگر ترجیحاتی بحثیں ہیں تو وہ علمی اور نظری طور پر ایک حق کو دوسرے حق پر راجح قرار دینے کی ہیں۔ نہ کہ حق کو باطل کے مقابلے پر اختیار کرنے کی جن کا لڑائی یا چیلنجوں سے تعلق ہو۔ ہاں اگر ان مرجحین کے مقابلے میں کوئی طبقہ فریق کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ طاعنوں تشنیع کنندوں اور ان افراد کا ہے جو کسی بھی اجتہادی شق کی تقبیح اور مذمت کے لیے مذہب و مشرب کے نام پر کھڑے ہوں۔ سو اس قسم کے طاعن اور تبرائی حضرات جس طرح تارکین فاتحہ خلف الامام کے فریق ہیں۔ اسی طرح قارئین فاتحہ خلف الامام کے بھی فریق ہیں۔ کیونکہ فاتحہ اور ترک فاتحہ تو حدیثی مسلک ہے لیکن طعن بر فاتحہ یا بر ترک فاتحہ (بایں طور کہ پڑھنے یا نہ پڑھنے والے کو مطعون کیا جائے) نہ حدیثی مسلک ہے نہ قرآنی نہ فقہی نہ کلامی۔ اس لیے اگر تارکین فاتحہ اور قارئین فاتحہ عامل بالحدیث ہونے کی وجہ سے اہل حق ہیں تو یہ طاعنین فاتحہ و ترک فاتحہ کسی سمت کے بھی ہوں۔ ان اہل حق کے فریق ہیں جن کا تقابل نہ فاتحہ سے ہے نہ ترکِ فاتحہ سے بلکہ حق اور اہلِ حق سے ہے۔ پس ایسے لوگ بلاشبہ تردید کے بھی مستحق ہیں اور تکذیب کے بھی درحالیکہ یہ تردید و تکذیب نہ کسی مسئلہ کی ہوگی نہ مسلک کی کسی اجتہادی شق کی بلکہ صرف ان افراد کی اور ان کے غیر معتدل کلام اور کلام کے اس رویّہ کی جس کا تعلق کسی حق سے نہیں بلکہ صرف ان کے جذبات نفس سے ہے۔

مصنف ممدوح نے اپنی اس متین کتاب میں اگر کہیں رد و قدح سے کام لیا ہے تو وہ درحقیقت اسی طبقہ کے مقابلے پر ہے جو مسائل کو مسائل کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ جذبات نفس کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ بقول شخصے کہ وہ نہ آمین بالجہر پر لڑتا ہے۔ نہ آمین بالسّر پر بلکہ صرف آمین بالشّر پر اس لیے وہ دونوں قسم کی آمین والوں کا فریق مقابل ہے۔ کیونکہ آمین کی پہلی دو قسمیں تو روایات میں ملتی ہیں لیکن تیسری سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ اس کا وجود اگر ہے تو صرف ان لوگوں کے نفس میں ہو سکتا ہے اور بس۔ پس مصنف کو یقیناً کسی اجتہادی مسئلہ کی شق کی بھی تردید کا حق نہیں لیکن بالیقین

ایسے طعنہ زن اور ان کی ایسی غلط روشوں اور مطاعن کی تردید بلکہ تکذیب کا حق ضرور پہنچتا ہے۔ جو مسئلہ کے بجائے اپنے نفس کی مصلحت کو آگے رکھتے ہوں اور دلائل سے گزر کر جذبات کو مسئلہ کی کافی دلیل خیال کر رہے ہوں اگر مصنف نے ایسے لوگوں کی تردید کا فرض احسن الکلام کے ساتھ ادا کیا تو بلا شبہ انھیں اس کا حق تھا اور انھوں نے حق ادا کر دیا۔

اگر طعنہ زن حضرات کو حدیث کے نام پر زور آزمائی کا ایسا ہی شوق دامن گیر ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ پہلے منکرین حدیث سے نمٹیں اور نفس حدیث کے موقف کو تھامنے میں یہ زور آزمائی دکھلائیں۔ وہ ان سے کیا نمٹنا چاہتے ہیں جو خود ہی حدیث، فن حدیث، فقہ حدیث اور ائمہ حدیث کے متبع اور ایک فانی گرویدہ و معتقد کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے یہاں حدیث رسول ہی نہیں رجال حدیث تک کی بے پناہ عظمت و بزرگی اور مخلصانہ پیروی کے جذبہ کو قائم رکھنا ایمان کا جزو اعظم ہے۔ نیز ان طعنہ زن حضرات کو اگر واقعی تبلیغ حق کا جذبہ بے چین کیے ہوئے ہے تو وہ منکروں کو اصول اسلام اور اصل دین کی تبلیغ فرمائیں جس کی تبلیغ ضروری ہے تو فروعی مسائل کب ہیں کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اس کے مختارہ کی جانب سے ہٹا کر اپنی مختار جانب پر لانے کی کوشش کرے نیز اگر تردید ضروری ہے تو غیر اسلامی اصول کی ضروری ہے نہ کہ کسی اجتہادی شق کی سمت مخالف کی جس میں ہمہ وقت صواب کا احتمال قائم رہتا ہے اور اس پر چلنے والا ہر وقت اجر و نجات کا مستحق ہوتا ہے۔ پس تبلیغی سرگرمیاں اور بغض فی اللہ کے مجاہدانہ چیلنجوں کو اگر کام میں لانا ہے تو مخربینِ دین، محرفینِ کتاب و سنّت اور مستغربینِ اسلام کے مقابلہ میں لانا چاہیے نہ کہ فاتحہ وغیرہ جیسے فروعی اور اجتہادی مسائل کی ترجیحی شقوق و جوانب کے نام پر خود معتقدینِ دین و ائمہ دین کے مقابلہ پر میں تو سمجھتا ہوں کہ جو حضرات ان فروعی مسائل کو محض ترجیحی اور عملی مسلک جان کر ان پر سچے دل سے عمل پیرا ہیں خواہ وہ اہل فقہ ہوں یا اہل حدیث۔ انھیں اس دوران میں کسی حنفی غیر حنفی اور امر کی تسلیم کردہ جانب کا تصوّر تک بھی نہ آتا ہوگا۔ چہ جائیکہ وہ اس کے خلاف غم و غصہ سے مغلوب ہو کر چیلنجوں کی عبارتوں سے اپنے ذہنوں کو مشوّش کرتے ہوں اور ہل من مبارز کے دھیان میں غرق ہوں۔ استفسار مسئلہ کے وقت دیانتاً اپنے نزدیک جو پہلو راجح ہو اسے راجح بتلانا اور مرجوح کو مرجوح کہنا اور چیز ہے اور مرجوح کا ابطال اور افساد کرنا یا اس کے ماننے والے کی تضلیل و

تفسیق کرنا اور چیز ہے۔ پہلا کام اہل حق کا ہے اور دوسرا اہل حق کے مقابل فریق کا۔ بہرحال جیسا کہ ایک حنفی کو فاتحہ خلف الامام کے ماننے والے کو مبطل یا باطل پرست کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے ایسے ہی کسی غیر حنفی کو ترکِ فاتحہ اور اس کے ماننے والوں کو باطل پرست یا مبطل یا ضال یا فاسق کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے کہ یہ اسم فسوق بعد الایمان اور غیر محتاط تعبیر ہم نالائقوں ہی تک محدود نہیں رہتی دور تک جاتی ہے جس کی زد سے کوئی بڑے سے بڑا بھی نہیں بچا رہتا۔ کیونکہ عیاذاً باللہ اگر ترکِ فاتحہ خلف الامام کوئی ضلال یا گمراہی ہے تو یہ ضلالت بہت پرانی اور بہت سوں کی ہے۔ ؎

مرا بر رندی عشق آں فضول عیب کند
کہ اعتراض بر اسرار علم غیب کند

ہاں اس حد تک ہم طعنہ زنوں کے ممنونِ کرم بھی ہیں کہ اگر وہ طعن و تشنیع کی راہ سے اس مسئلہ کو اپنے جذبات اور شکوک کی آماجگاہ نہ بناتے اور ایک فریق کی حیثیت سے سامنے نہ آتے تو مصنف محترم مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کے ان دقیق علوم اور اسالیب بیان سے ہم مستفید بھی نہ ہو سکتے جو اس حیلہ سے انھوں نے اپنی کتاب احسن الکلام میں رقم فرمائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جہل علم سے نہ ٹکرائے تو علم کے مخفی گوشے واشگاف نہیں ہو سکتے اگر کذب صدق سے ٹکر نہ کھاتے تو صدق کی مخفی قوت نمایاں نہیں ہو سکتی اگر کفر اسلام سے نہ ٹکرائے تو اسلام کے مخفی گوشے دنیا کو اپنا نور نہ دکھلا سکتے بہرحال جب تک اضداد اپنے اصول سے نہ بھڑیں اصول کا وجود و ثبوت نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اضداد بنایا ہے اور ہر اصول کے پیچھے اس کی ضد لگا دی ہے تاکہ وہ اس سے ٹکراتی رہے اور اس حیلہ سے اصول کی عظمت و قوت لپکتی رہے بایں معنیٰ تکوینی طور پر طاعنوں اور منکروں کا وجود بھی مجموعۂ کائنات کے لیے ایک حسن ہے اور ضروری ہے وہ اگر دلوں میں وسوسے اور شبہات نہ ڈالیں تو اہل عرفان سے ان کے دفعیہ کی علمی تدبیریں بھی نمایاں نہ ہوں مثل مشہور ہے کہ "ادب سیکھا جاتا ہے بے ادبوں سے" یعنی وہ ذریعہ ادب دانی بن جاتے ہیں سو علم بھی بہت حد تک جہل سے ہی سیکھا جاتا ہے۔ یعنی جہل اور اس کے پیدا کردہ شکوک و شبہات

بھی بہت حد تک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اہل علم کی گرم جوشی آمادگی اور ان کے انقار علم کا جس سے
مخلوق خدا علم سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ بس اس حد تک اس طبقہ کا ہم سب ہی کو ممنون ہونا چاہیے
کہ علم کے بہت سے مخفی گوشے ان کے سبب سے سامنے آ گئے اور اس شر میں سے ایک خیر
ہمارے لیے نکل آئی۔ شر اپنی ذات سے شر سہی مگر مجموعۂ عالم اور اہلِ معاملہ کے لیے نسبتاً وہی
خیر ہے۔ مگر محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ شر کے خیر ہونے سے۔ اس لیے تکوینی طور پر تو ہم طعنہ
زنوں کے ممنون ہوں گے کہ ان کی بدولت کتنے ہی علم کے مخفی گوشے ہمیں دستیاب ہو گئے مگر
حقیقی طور پر ہم مصنف احسن الکلام کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس حیلہ سے مسئلہ فاتحہ کے تحقیقی
اور دفاعی دونوں پہلوؤں کو بہت حد تک صاف کر دیا ہے جو موافق اور مخالف دونوں طبقوں کے
لیے علمی حیثیت سے کارآمد ہوں گے۔ اگر خلاف رائے رکھنے والے حضرات کے لیے ان دلائل سے
شفا ہو گئی تو ان کے خلاف میں شدت باقی نہ رہے گی خواہ وہ اپنے ہی مسلک پر عمل پیرا رہیں سو
یہ کونسا کم نفع ہے اور اگر ان دلائل کے کسی مقدمہ کو کمزور پا کر انھوں نے جواب کے طور پر اسے
واضح کیا تو ہم سب کے لیے ایک مزید علم کا اضافہ ہوگا اور یہ کونسا قلیل نفع ہے جو زدنی علما
کا مصداق ہو، بہر صورت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب اس تالیف لطیف کے لیے سرفراز ہوئے
ہیں تو وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور احسن الکلام بحیثیت مجموعی حقیقتاً احسن الکلام ہے۔ حق
تعالیٰ اس احسن الکلام کو حسنِ قبول سے سرفراز فرمائے اور اسے یتّبعون احسنہ کا مصداق
بنائے۔ آمین

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند
یکم ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ

سید المناظرین سند العلماء

حضرت مولانا سید مہدی حسن رحمہ اللہ تعالےٰ

سابق مفتیٔ اعظم دار العلوم، دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وبعد۔ آج دنیا جس دور سے گذر رہی ہے خصوصاً مسلمانان عالم جن کٹھن مراحل سے گذر رہے ہیں۔ اس کا وقتی اور ہنگامی اقتضاء یہ تھا کہ وہ امت جس کا خدا ایک۔ رسول ایک، قرآن ایک۔ کعبہ ایک ہے سر جوڑ کر بیٹھتی اور ان امراض کا علاج تلاش کرتی جن امراض میں مسلمان مبتلا ہیں جن کی وجہ سے ان پر زندگی دوبھر اور وبال ہے۔ تحریکات گمراہ کن اور فتن مخرّب دین کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ نہیں، نہیں بلکہ دریا کی موجوں کی طرح پے بہ پے موجیں مار رہے ہیں جن کی لہروں کا اثر ساحلِ دریا سے باہر بھی کافی ہے: ؎

بحزم کوش کہ ایں رہ ہے پُراز خطر است ۔۔۔ باحتیاط قدم نہ کہ جائے شور و شر است

ہمیں کہ ابر بہار و چناں تصوّر کن ۔۔۔ کہ سیل می رسد و خانۂ تو بر گذر است

بجائے اس کے آج بھی تشتت و افتراق کی صورتیں پیدا کر کے شقاق و خلاف کے راستے کو ہموار کیا جاتا: ع ۔۔۔ وہ سمجھنے کس طرح بیٹھیں کہ جب بیٹھا نہیں جاتا

اس پر طرہ یہ کہ اس کو دینی خدمت تصوّر کیا جاتا ہے جو مسائل برسہا برس سے ایسے چلے آتے ہیں جن پر ہر زبان میں خامہ فرسائی ہو چکی ہے اور قلموں کی روشنائی خشک ہو چکی ہے۔ انہیں اختلافی مسائل میں سے فاتحہ خلف الامام کا پرانا مسئلہ ہے کوئی نئی اور جدید تحقیق نہیں ہے جس کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ اس سے مستفید ہو۔ لیکن جن حضرات کی طبیعت ثانیہ یہ ہو گئی ہو کہ اختلاف وسیع ہوتا رہے وہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرتے رہیں لیکن ایسا نہیں بلکہ دور حاضر کے ہمارے دینی بھائی اہل حدیث حد اعتدال سے باہر ہو کر اسی کے درپے ہو گئے کہ جو امام کے پیچھے۔ الحمد نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے اور جب نماز ہی نہیں ہوتی تو تارکین صلوٰۃ ہیں بلکہ قصداً اس جرم کے مرتکب ہیں جو بجائے خود باعث نجات ہونے کے

موجبِ خسرانِ اُخروی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر کہاں تک صحیح ہے۔ اس کو انھیں کے نملوب زیادہ محسوس کرتے ہوں گے کہ امت محمدیہ کی ایک بہت بڑی جماعت کی نماز پر بطلان کا حکم لگا کر کیا دین کی خدمت ہے، جن میں حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ و تبع تابعینؒ وغیرہم کی کافی تعداد داخل ہے۔ ایسی صورتِ حال پر اس کی ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر از سرِ نو متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی کے ساتھ محدثانہ طریق سے روشنی ڈالی جائے جو پہلو اُجاگر نہیں ان کو اُجاگر کر دیا جائے تاکہ انصاف پسند اور علم پرور حضرات کی بصیرت دقیقہ رس اس کو دیکھ کر احسنت کہہ اٹھے : ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید!

اس ضرورت کا احساس اخی محترم فاضل نوجوان مولانا محمد سرفراز خاں صفدر سرحدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی نے کیا اور اس مسئلہ پر محققانہ و منصفانہ بحث کر کے کتابی صورت میں اس کو شایع کیا جو احسن الکلام فی ترک القرآۃ خلف الامام کے نام سے موسوم ہے جس کے دو حصے ہیں۔ میں نے جزو اوّل کا اوّل سے آخر تک لفظ بہ لفظ اور جزو ثانی کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا ہے۔ خوبیٔ اسلوب و اندازِ بیان، زبان کی صفائی کے ساتھ دلائل و براہین پر منصفانہ نظر ڈالی ہے۔ فاضل موصوف نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ معترضین کے شبہات کا جواب عالمانہ دیا ہے اور تحقیق کے ساتھ مجادلانہ طریق اختیار نہیں کیا کہ کتاب کی افادیت میں کمی واقع ہو۔ اپنے ہر دعوی کو براہین سے مدلل کیا ہے کہ مخالفین حضرات کو بھی اگر ان کے یہاں علم و انصاف کی قدر و قیمت ہے تو تسلیم کر لینے اور سکوت اختیار کر لینے کے سوا چارۂ کار نہیں ہے اس محنت و عرق ریزی اور تحقیق و تنقید کی جملہ احناف کی طرف سے فاضل موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور بے انصاف مخالفین کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور مخلوق کے طریق رشد و ہدایت کا رہبر بنائے۔ طلبا و عوام کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ علماء بھی اس کتاب کے مطالعہ سے دریغ نہ فرمائیں کہ براہین و دلائل اور آثار و اقوال ائمہ یکجائی طور پر اس کتاب میں ملیں گے۔ بعض مباحث ایسے بھی اس کتاب میں ملیں گے جو بڑی عرق ریزی اور کافی مطالعہ کتب

بمشکل حاصل ہو سکتے ہیں جن کو فاضل مؤلف نے بہت خوبی کے ساتھ اپنے اپنے موقع پر پیش کیا ہے اس لیے ہر اس شخص کو اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے جو حنفیت سے وابستہ ہو تاکہ اپنے مذہب کی صداقت خصوصاً مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں ہویدا اور نمایاں ہو جائے۔ طباعت و کتابت کی کہیں کہیں کوتاہیاں ہیں جو اشاعت آیندہ میں دور ہو جائیں گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

احقر الزمن

السید مہدی حسن غفرلہ خادم دارالافتاء الواقعہ

بدارالعلوم دیوبند۔ ۳/۷/۷۵ھ

شیخ العرب والعجم رأس الاتقیا مجاہد ملت

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالےٰ

سابق شیخ الحدیث دارالعلوم، دیوبند۔

حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب کی تحریر سے میں حرف بحرف موافقت کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

مدرس دارالعلوم، دیوبند

رئیس المحققین قامع البدعت محی السنۃ شیخ الحدیث

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم (مئو اعظم گڈھ یوپی)

مئو

۱۲ ذیقعدہ، ۸۴ھ

فاضل محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

آپ کا قیمتی ہدیہ (احسن الکلام) مجھے بروقت مل گیا تھا۔ اس عنایت کے لیے میں

آپ کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے میں اب تک آپ کی کتاب پوری نہیں پڑھ سکا پھر بھی متعدد مقامات سے کئی کئی ورق پڑھے، آپ کی محنت وجانکاہی پر دل سے دعا نکلی۔ میں نے آپ کی کتاب کو اس لحاظ سے بہت زیادہ پسند کیا کہ آپ نے انہیں اصول کو سامنے رکھ کر جوابات دیے ہیں جن اصول کی بنا پر معترضین نے اعتراضات کیے ہیں۔ بالخصوص آپ نے تحقیق الکلام کی طرف جو خصوصی توجہ فرمائی اس کے لیے آپ خاص طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔ اس لیے کہ ہماری جماعت کے تساہل وتغافل کی وجہ سے اس کو لاجواب سمجھا جا رہا تھا۔ حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

چونکہ یہ کتاب مقابلہ پر لکھی گئی ہے اور فریقِ مخالف صرف نکتہ چینی ہی کے خیال سے اس کو دیکھے گا، اس لیے مخالف کی نگاہ پڑنے سے پیشتر بعض ایسی باتیں جو میرے خیال میں صحیح نہیں معلوم ہوتیں۔ ان کی نشاندہی کرتا ہوں۔ آپ بھی غور فرمالیں۔ اگر آپ کو بھی مجھ سے اتفاق ہو تو فبہا ورنہ جانے دیجیے۔

چونکہ میں نے مسلسل پوری کتاب نہیں پڑھی اس لیے کیف ما اتفق جہاں جہاں جو بات مجھے کھٹکی ہے اس کو میں نے نوٹ کر لیا ہے۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

نوٹ: حضرت نے تین صفحات پر مشتمل تحریر میں متعدد اغلاط کی نشاندہی کی تھی جن کی اب بحمد اللہ تعالیٰ تصیح کر لی گئی ہے۔ صفدر

حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مفتی اعظم جامعہ رشیدیہ منٹگمری تلمیذ و مرید حضرۃ شیخ الہند

بخدمت جناب مولانا مولوی محمد سرفراز خاں صاحب بارک اللہ تعالیٰ فی عمرہٖ وعلمہٖ وعملہٖ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اما بعد گذارش کہ احسن الکلام، تبریۃ النواظر، گلدستۂ توحید، دل کا سرور میں نے پڑھوا کر سنی ہیں۔ ماشاء اللہ تعالیٰ آپ بہت وسیع النظر ہیں اور ذہین۔ حافظہ وفہم بہت پایا ہے، مگر معلوم نہیں یہ سب کتب جن کے حوالے آپ

نے دیے ہیں۔ کیا یہ سب آپ کے پاس موجود ہیں؟ جب میری بینائی تھی تو آثار السنن وجامع الآثار نیموی وایضاح الادلہ وہدایت المعتدی۔ والفرقان دیوبندی۔ وانوار نعمانیہ وستۂ ضروریہ فیض پوری کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر تحقیق الکلام کا جواب مصنفؒ مرحوم کی زندگی میں کسی نے نہ لکھا۔ البتہ ابکار المنن کا جواب مولانا عبدالرشید ابن نیمویؒ نے لکھا تھا۔ جس کا قلمی نسخہ انھوں نے مجھ کو بھی بھیجا تھا۔ جو جالندھر مولوی خیر محمد صاحب کے مکتبہ میں انقلاب کے وقت وہیں رہ گیا۔ ہمارے مدرسہ کی سب کتب اور مولوی خیر محمد صاحب کے مدرسہ کی کتب انقلاب میں سب ضایع ہوگئیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مجلسی طلقاتِ ثلاثہ کی بابت آپ کتاب شائع کرنے کو ہیں؟ تیار ہونے پر پتہ کرنا۔ مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی مدرس مدرسہ مئو بھنجن ناتھ ضلع اعظم گڈھ نے طلقاتِ ثلاثہ کی بابت دو جلد میں کتاب لکھی ہے۔ جس میں علامہ ابن قیمؒ و غیر مقلدین کے جواب دیے ہیں۔ وہ کتاب بھی وطن میں ضائع ہوگئی۔ شاید آپ کی نظر سے گذری ہے یا نہیں۔ ابکار المنن کا جواب ابن نیموی طبع نہیں کرا سکے۔ غریب ہونے کے سبب قلمی تین نسخے تیار کیے تھے۔ ایک نسخہ مجھ کو بھیجا اور ایک مبارک پوری صاحب کو اور ایک اپنے پاس رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے کہ امام بخاریؒ بڑے ذہین تھے۔ تھوڑا سا ذہن اور ہوتا تو امام ابو حنیفہؒ کے برابر ہو جاتے۔ امام نوویؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ ان کا ذہن طویل وعریض تو بہت ہے مگر امام اعظمؒ کے عمیق ذہن تک پہنچ نہیں سکتے۔ فقط آپ کے حوالہ جات بقید صفحات لکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیر جھنڈا کے مکتبہ میں لکھ رہے ہیں یا مکتبہ مدرسہ دیوبند میں کیا یہ سب کتب آپ کے پاس ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام فقط

خادم حبیب اللہ خلف حضرت مفتیؒ

خادم طلبہ جامعہ رشیدیہ۔ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ

فقیہ وقت المحقق المدقق
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
مفتی اعظم پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب صفدر کی محققانہ تازہ تصنیف "احسن الکلام فی ترک القراۃ خلف الامام" دیکھنے کا موقع ملا جو اپنے موضوع میں بے نظیر کتاب ہے۔ طرز بیان نہایت سلیس ہے اور اس مسئلہ میں غلو و تعدی کرنے والوں کا بہترین جواب ہے۔

مسئلہ قراۃ فاتحہ خلف الامام ان مسائل میں سے ہے جن میں حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے سے اختلاف اور بحثیں چلی آتی ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں مستقل کتابیں اور رسالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں اور ایسے اجتہادی اختلافات میں تمام اہل حق کا مسلک یہی ہوتا ہے کہ ان کے جس پہلو کو وہ راجح سمجھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری جانب پر طعن و تشنیع اور زبان درازی جائز نہیں سمجھتے۔ علمی بحث و تمحیص کا مقام آتا ہے تو اس میں مناظرانہ بحثیں بھی ملتی ہیں مگر اس نظر سے نہیں کہ ان کا حریف باطل پرست یا گمراہ ہے۔ اور اجتہادی اختلافات کا تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہی مقام ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کل کی فضا میں جہاں کفر و الحاد کے طوفان نئی نئی شکلوں سے اٹھ رہے ہیں۔ سرے سے حدیث ہی کو ناقابل عمل ٹھہرایا جا رہا ہے۔ قرآن میں طرح طرح کی معنوی تحریفات کے لیے ادارے بنائے جا رہے ہیں، کسی خدا ترس ذی علم کے لیے اس کا کوئی موقع نہ تھا کہ ان پرانی بحثوں کو تازہ کر کے ایک نیا فتنہ قرآن و حدیث کے ماننے والوں اہل السنت میں پیدا کرتا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش کم علم لوگ جو اپنے آپ کو فرقہ اہل حدیث سے منسوب کرتے ہیں اور در حقیقت انصاف پسند اہلحدیث بھی ان کے طرز عمل سے متنفر ہیں۔ کفر و الحاد کے دنیا میں پھیلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی فکریں صرف اس میں مبذول رہتی ہیں کہ حنفی مسلمانوں کو گمراہ، بے نماز بلکہ کافر و مشرک قرار دیں۔ اسی قسم کے بعض لوگوں نے حال میں کچھ رسائل شائع کر کے مسلمانوں

میں انتشار و اختلاف کا دروازہ کھولا تو ہمارے محترم مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صاحب نے ضرورت محسوس فرما کر زمانہ حال کے طرز اور سلیس اُردو زبان میں اس موضوع پر دو جلد میں یہ ضخیم کتاب تصنیف فرما کر مسئلہ کے ہر پہلو کو خوب واضح فرما دیا۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں اُردو زبان میں بھی اس مسئلہ کے متعلق نظر سے گذری ہیں اوّل تو ان میں پوری مباحث کے لیے جامع کم ہیں۔ پھر خالص قدیم علمی زبان میں ہیں آجکل عوام کیلئے ان سے استفادہ مشکل ہے اس کتاب میں فاضل مؤلف نے ماشاء اللہ تعالیٰ بڑی خوبی سے تمام جوانب کی رعایت رکھ کر اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء وتقبّل منہ مسعاہ۔

۲۵ شوال ۱۳۷۴ھ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

علّامہ عصر امام المناظرین استاذ العلماء

حضرت مولانا خیر محمّد صاحب رحمہُ اللہ تعالیٰ

سابق مہتمم مدرسۂ عربیۂ خیر المدارس، ملتان، مغربی پاکستان

باسمہٖ سبحانہٗ تعالیٰ

بعد حمد و صلوٰۃ۔ مسئلہ قرأۃ خلف الامام سلف و خلف میں ہمیشہ مختلف فیہا رہا ہے۔ مگر اس کا اختلاف اوّلیت و غیر اوّلیت تک محدود رہا۔ مثبتین حضرات نے تارکین قرأۃ پر بطلان صلوٰۃ کا جارحانہ حربہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ البتہ ہمارے زمانے کے اکثر غیر معتدل اہلِ حدیث علماء جمہور سلف و خلف کے خلاف بڑی شد و مد سے اپنی تحریر و تقریر میں اس دلآزار حربہ کو استعمال کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ بایں ضرورت جمہور کی طرف سے بھی اصلاحی طور پر تحقیقی و جوابی رسائل کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو معاندین کے لیے مسکت اور منصفین کے لیے قانع تھا۔ مگر بعض رسائل میں جزوی مباحث پر کلام تھا اور بعض میں قدرِ ضرورت پر اکتفا تھا۔ اس لیے ہنوز ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں ایسی جامع اور مسکت کتاب شائع ہو جو تمام مباحث پر حاوی ہو۔ سو بحمد اللہ تعالیٰ فاضل نوجوان حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب سرحدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی ضلع

گوجرانوالہ نے کتاب احسن الکلام فی ترک القرآۃ خلف الامام ہر دو جلد تصنیف فرما کر احسن طریق سے اس ضرورت کو پورا فرما دیا۔

امام شافعیؒ کے مذہب کی تحقیق انیق اور رواۃ احادیث کے تراجم و وفیات اور ہر ہر مبحث پر محققانہ و منصفانہ تفصیلی دلائل و براہین اس کتاب کی خصوصیات ہیں مجھے سفر و علالت کے دوران میں صرف جلد اوّل کے مطالعہ کا حرفاً حرفاً موقع مل سکا۔ بفضلہ تعالیٰ اس مسئلہ کے متعلق فریقین کے بہت سے رسائل دیکھنے کا موقع مجھے بھی میسر آیا ہے اس لیے بلا تکلف عارض ہوں کہ میرے نزدیک یہ کتاب اس مسئلہ کے تمام مباحث پر حاوی اور جامع ہے۔ کوئی مبحث اس میں تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ فریقین کے لیے اس کا مطالعہ نافع ہوگا خصوصاً حنفی المذہب علماء و طلباء کو خود زیر مطالعہ رکھنا اور اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور اس کی اشاعت میں سعی کرنا مذہبی فریضہ کے مرادف ہے۔ حق تعالیٰ اس کتاب کو مفید عام اور نافع تام بنا دے۔ اور حضرت مؤلف علام دام فیضہٗ کو جزاء احسن عطا فرماتے ہوئے اس قسم کے دیگر مسائل پر محققانہ رسائل تصنیف فرمانے کی توفیق مزید شامل حال رکھے۔ آمین ثم آمین۔

احقر خیر محمد عفا اللہ عنہ

مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان ۹ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ

شیخ کامل رئیس المجاہدین مفسر قرآنِ کریم

حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد! میں نے احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام مصنفہ مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب دامت معالیہم کی دونوں جلدوں کو متعدد مقامات سے بغور پڑھا ہے، مولانا ممدوح نے جس محنت اور عرق ریزی سے اپنے مجوزہ موضوع کو دلائل و براہین سے مدلل فرمایا ہے۔ اگر اس عنوان

کے مخالفین انصاف اور تقویٰ سے کام لیں تو انھیں سوائے سکوت اور سر تسلیم کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مخالفت کرنے والوں کی ہدایت ذریعہ بنائے۔ آمین یا اللہ العالمین۔

العارض احقر الانام احمد علی عفی عنہ لاہوری ۷ ، شوال ۱۳۷۴ھ

امیر الموحدین سید المناظرین الحافظ الحجۃ

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب دام فیضہم

سابق مدرس دار العلوم دیوبند و حال شیخ الحدیث گوجرانوالہ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امابعد عرض ہے کہ مجھے محترم دوست مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کی کتاب لاجواب احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جس کے بعد میں کتاب موصوف کی مندرجہ ذیل خوبیوں اور خصوصیات پر مطلع ہوا:

۱۔ استیعاب اطراف میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ ۲۔ زورِ استدلال میں بے مثال ہے۔

۳۔ جامعیت مضامین میں بحر محیط ہے و معترضین کے اعتراضات کے جوابات میں دیوار فولاد ہے۔

۴۔ مصنف کے تبحرِ علمی کا زندہ ثبوت ہے۔

وبارک اللہ فی عمرہ وعلمہ وشانہ وصانہٗ عما شان وحفظہ من آفات الزمان وعصمہ من شر الحاسدین واصحاب العدوان۔

العبد ابو عبید اللہ شمس الدین عفی عنہ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ

شیخ طریقت حافظ الحدیث العلامہ حضرت مولانا شیخ القرآن و الحدیث محمد عبد اللہ صاحب

درخواستی دام مجدہم مہتمم مدرسہ عربیہ مخزن العلوم خانپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ وعلیٰ آلہ وصحبہ وجمیع من اقتفی اثرہٗ۔ امابعد، فقد رأیت رسالۃ احسن الکلام

من تالیف المولوی محمد سرفراز خاں صفدر فرأیته موشحا بدلائل وخالیا عن الجدل فجزی اللہ تعالیٰ المؤلف احسن الجزاء وارجو من اللہ تعالیٰ ان ینتفع به العوام والخواص وان یترك اهل الجدل الجدل قال النبی صلی اللہ علیه وسلم ما ضل قوم بعد هدی کانوا علیه الا اوتوا الجدل الخ بکی شجرة الاسلام من علمائه فنما اکترثوا لما رأوا من بکائه - فاکثرهم مستحسن لخطائه مستقبح لصواب غیره - فایهم المرجو فینا لدینه وایهم الموثوق فینا برأیه هداة الذین ضلوا وقد بانت خسارتهم فباعوا الدین بالدنیا فما ربحت تجارتهم -

حررہ افقرالی اللہ محمد عبد اللہ درخواستی

مهتمم مدرسة العربیه مخزن العلوم خانپور

اُستاذ الاساتذہ محقق وقت الفقیہ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد عبد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی - اما بعد -

احقر نے رسالہ احسن الکلام مؤلفہ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب بعض بعض مقامات سے دیکھا - اس مختصر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مؤلف سلمہ نے استدلال اور تنقید میں تحقیق اور متانت سے کام لیا ہے - طعن و تشنیع سے (جو آج کل کے بعض حضرات نے اختیار کر رکھا ہے) اجتناب کیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ایسے مسائل مختلف فیہا میں طعن و تشنیع ایک امر قبیح کا ارتکاب ہے - اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اور خصوصاً حضرات علما کو اس سے محفوظ رکھے - اللہ تعالیٰ مؤلف سلمہ کی اس تالیف کو قبول اور مخلوق خدا کو اس سے مستفید و مستفیض فرمائے - اللھم وفقنا لما تحب وترضی من القول والعمل والھدی انك علی کل شیء قدیر -

العبد الاحقر

عبد الرحمٰن غفرلہ

از بہبودی ملک مالا کیمبل پور ۶ شوال ۱۳۷۴ھ

شیخ المعقول والمنقول علامۂ دہر فرید عصر حضرت مولانا شیخ القرآن والحدیث محمد سلطان محمود صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد۔ میں کتاب احسن الکلام کو بالاستیعاب تو نہیں دیکھ سکا لیکن اس کی دونوں جلدوں کے بعض بعض مقاموں کو نہایت غور و تدبّر کے ساتھ پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں مؤلف کتاب مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کے دو فریضے تھے۔ پہلا فریضہ اپنے دعوے کو دلائل سے واضح کرنا۔ دوسرا فریضہ فریق مخالف کے دلائل کا جواب دینا۔ مؤلف صاحب نے ان دونوں فریضوں کے ادا کرنے میں کمال کر دیا ہے۔ اپنے دعوے کو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ فریق مقابل کو ان کے دلائل کے جوابات عقلیہ و نقلیہ کا وہ نظارہ دکھایا ہے جو تادم زیست ان کی نظروں سے غائب ہو ہی نہیں سکے گا۔

۲۔ طرز بیان نہایت ہی سلیس و عام فہم ہے صرف اُردو خواں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ اس مسئلہ کے متعلق بہت سے رسائل لکھے گئے ہیں لیکن احسن الکلام جیسا مفصل و جامع دلائل عقلیہ و نقلیہ میری نظر سے کوئی دوسرا رسالہ نہیں گزرا۔

اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی اس خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

خادم العلماء

سلطان محمود عفی عنہ

ناظم مدرسہ خادم علوم نبوّت اکتھیالہ شیخاں گجرات

سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی

نمونۂ سلف بقیۃ الخلف حضرت مولانا محمد عبد الحق صاحب دامت فیوضہم

مہتمم مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

حضرت العلامہ زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ وصول پایا۔ حسب الحکم احسن الکلام کے بعض مقامات دیکھے گئے۔ افسوس کہ نہایت عدیم الفرصتی کی وجہ سے مکمل کتاب کا مطالعہ نہ ہو سکا۔ تاہم جستہ جستہ مقامات کو بغور دیکھا گیا۔ بزرگوارم ایسی جامع اور مسئلہ کے ہر پہلو پر حاوی کتاب پر تقریظی جملے لکھنا میرے خیال میں سورج کے سامنے چراغ دکھانا ہے لیکن محض تعمیل حکم کی غرض سے چند جملے تحریر کیے جا رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اَلْحَمْدُ لِمَنْ تَفَرَّدَ بِالْقِدَمِ۔ فَكُلُّ شَيْءٍ مَا سِوَاهُ مَسْبُوْقٌ بِالْعَدَمِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ مَصَابِيْحِ الظُّلَمِ

امابعد، تمام مشاغل میں افضل و بہترین مشغلہ خلوص نیت کے ساتھ علوم دینیہ اور مسائل شرعیہ کی تحقیق ہے جو افضل العبادات میں محسوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف نے اسی کو اپنی زندگی کا اہم نصب العین اور اپنی تمام سرگرمیوں کا محور قرار دیا تھا۔ اور قیمتی عمروں کو اسی مبارک مشغلہ میں فنا کیا ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل شرعیہ میں علمی تحقیقات کو امت کے سامنے پیش کرنا جن میں امت کے نقطہائے نظر سلفاً و خلفاً مختلف رہے ہوں۔ علوم دینیہ کی بہترین خدمت اور امت کے ساتھ انتہائی درجہ کی خیرخواہی ہے جو ہر طرح قابل قدر اور لائق ستایش ہے کہ اسی میں امت کے مختلف الخیال حضرات کے خیالات کی ایک حد تک اصلاح اور طالب عمل کے لیے ایک واضح شاہراہ متعین ہو جانے کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں۔ مسئلہ قرات خلف الامام بھی چونکہ ان معرکۃ الآراء مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس میں ہر زمانے کے اکابرین ملت نے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اور اس پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء لیکن زیادہ تر ہدف ملامت اس مسئلہ میں علماء احناف ہی کو بنایا جا چکا ہے اور بنایا جا رہا ہے کہ صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے بھی علماء احناف قرأۃ خلف الامام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اور احادیث نبویہ سے کھلی ہوئی مخالفت کر رہے ہیں

حالانکہ مسئلہ کے تحقیقی اور استدلالی پہلو پر اگر انصاف سے نظر ڈالی جاتے تو احناف اس مسئلہ میں نہ اپنی رائے میں متفرد ہیں۔ اور نہ شاہراہ اور جادۂ حق سے ان کے قدم ہٹتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس اہم موضوع پر ایک ایسی علمی تحقیق پیش کی جائے جو نہ صرف توضیح مسئلہ کے لیے مفید ہو۔ بلکہ اظہار حق فی نفس الباب کے لیے برہان ساطع کی حیثیت بھی رکھتی ہو۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔ مُصنّف احسن الکلام حضرت العلّامہ مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر صاحب کو کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا فرما دیا۔ اور اپنی علمی تحقیقات کو اس مسئلہ کے بارے میں ایک ایسی کتاب کی شکل میں علماء اُمت کے سامنے پیش فرمایا جس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پچھلی تمام ان کتابوں سے یہ کتاب مستغنی کر دینے والی ہے، جو اس مسئلہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ کتاب اپنے حُسنِ ترتیب اور مضامین کی شائستگی اور مکمل تشریح مسئلہ کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جن کی وجہ سے کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ اہل انصاف عموماً احناف خصوصاً اس کو اپنے لیے بیش بہا تحفہ اور مبارک ہدیہ سمجھیں۔ سب سے زیادہ قابل ستائش اور لائق تحسین خصوصیت یہ ہے کہ ملت کے بلند پایہ علماء کرام اور ائمہ عظام کے صحیح اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ مدعٰی کے اثبات اور تحقیق انتساب کے لیے مستند نقول سے کام لیا گیا ہے۔ نیز مخالفین حضرات کے اعتراضات کے جوابات ایسے تسلی بخش طریقہ سے دیے گئے ہیں جو انصاف پسند حضرات کے لیے موجب تسکین ہیں۔ امید کہ اہل علم حضرات اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھائینگے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف مدظلہ کی اس سعی و کاوش کو قبول فرمائیں اور اس کار خیر کے بدلہ میں ان کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین یارب العٰلمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وّ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

عبد الحق عفی عنہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور (سرحد) ۱۱ر شوال ۱۳۷۴ھ

پیر کامل عالم بے مثل حامی سنت ماحی بدعت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مہتمم مدرسہ عربیہ سراج العلوم سرگودہا

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ۔ اما بعد! مذہبی دنیا میں منقولات

اور تعامل کو دیکھا جاتا ہے۔ قرأۃ خلف الامام کے بارے میں قرن اوّل سے لے کر آج تک اہل اسلام کا عدم فرضیت پر جمہور کا تعامل رہا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے امام شافعیؒ سرّی نمازوں میں (وجوب قرأۃ فاتحہ کے دعوے میں) منفرد ہیں۔ اسی واسطے محققین شوافع اس کے قائل نہیں۔ منقولات میں سے جہری (بلکہ جملہ) صلوات میں واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا نصِ قطعی ہے۔ اطلاق الفاظ سے قطع نظر خود شانِ نزول بھی آیت کا بتصریح ائمہ کرامؒ حصہ نماز ہے۔ سرّی نمازوں میں آثار مرفوعہ وموقوفہ کے تبادر سے عدم قرأۃ مقتدی ثابت ہوتی ہے بلکہ بعض آثار میں وعیدیں بھی موجود ہیں۔ مجوزین حضرات کی جانب سے (صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب پیش کی جاتی ہے جو حضرت جابرؓ اور امام احمدؒ اور سفیانؒ جیسے جلیل القدر حضرات منفرد کے حق میں فرما رہے ہیں۔ باقی جتنی حدیثیں قرأۃ خلف الامام کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں بعض صحیح نہیں اور جو صحیح ہیں وہ دلالت علی المقصود پر صریح نہیں۔ بایں ہمہ احناف کی طرف سے جب کبھی اس مسئلہ پر کچھ لکھا گیا ان کی اس میں دفاعی حیثیت ہے۔ اقدام ہمیشہ مجوزین حضرات سے ہوتا رہا وہ بھی اس طعن کیساتھ کہ احناف کی نماز مردود اور باطل ہے وغیرہ وغیرہ۔ بقول مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑا حضرت محقق مولانا محمد سرفراز خاں صفدر زید علمہ نے اس بارے میں ایک مبسوط کتاب احسن الکلام لکھی ہے۔ اس میں بلا مبالغہ محقق مصنف نے بغیر تعصب کے سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں اور اس مسئلہ کے مالہ وماعلیہ پر کلام مشبع فرمائی ہے؛ ؎

آخر آمد بود فخر الاوّلین!

شاید اس کے بعد کسی راد اور مردود کو قلم اٹھانے کا موقع بھی نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے صالحات باقیات میں اس تصنیف لطیف سے اضافہ فرمادے اور عامۃ المسلمین کو متمتع فرمادے آمین ثم آمین۔

احقر ابو سعید محمد شفیع عفی عنہ سرگودہا۔

اُسوۂ صالحین شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد نصیر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ غورغشتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ میں نے کتاب احسن الکلام کی دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا نہایت عمدہ اور مفید کتاب ہے اہل اسلام کو مناسب ہے کہ اس کا

مطالعہ کریں خصوصاً احناف کو (اور ان احناف کو توعلی الخصوص) اس کا مطالعہ ضروری ہے جو کہ اپنے مذہب کے معتبرات سے ناواقف ہیں۔ وصلی اللہ علی رسولہ وخیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ وجمیع امتہ اجمعین۔

مسکین نصیر الدین غورغشوی

اُستاذ العلماء رأس المحققین

حضرت مولانا محمد شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم

ترنگ زئی ضلع پشاور

سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان۔ شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، حالاً شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاول پور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد! احسن الکلام فی ترک القرأت خلف الامام تصنیف مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر کو میں نے بغور ملاحظہ کیا۔ اس مسئلہ پر قبل ازیں نفیاً و اثباتاً کافی رسائل و اجزاء لکھے گئے ہیں لیکن ان سب میں زیر تبصرہ کتاب کی شان نرالی ہے۔ مصنف علام کو حفاظتِ اصول و فروعِ دین و ردِ غلوِ غالین و تحریفاتِ مبتدعین میں ایک ممتاز ملکہ حاصل ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ مساعیہ احسن الکلام کے دو حصے ہیں اور بنیادی اجزاء آٹھ ہیں۔ پہلے حصہ میں مذہب حنفی یعنی ممنوعیت فاتحہ خلف الامام کو کتاب اللہ[۱] و احادیث[۲] رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و آثار صحابہ رض[۳] و تابعین و تبع تابعین اور ادلہ عقلیہ قیاسیہ و اجتہادیہ سے[۴] ثابت کیا گیا ہے۔ یہ اس حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ دوسرے حصہ میں مخالفین کی دعویٰ رکنیت فاتحہ کے دلائل قرآنیہ[۱]، حدیثیہ[۲]، اثریہ[۳] اور عقلیہ[۴] کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ دوسرے حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ گویا پہلے حصے میں مذہب حنفیہ کے مثبت پہلو کا بیان ہے اور دوسرے

حقے میں منفی پہلو کا۔

بہرحال یہ کتاب بلحاظ کثرت مواد، سلاست بیان وضبط دلائل ورد اشکالات مخالفین اور جامعیت جمیع ابحاث متعلقہ بالموضوع کے لحاظ سے اپنی شان میں بے نظیر ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف علام کی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور مسلمانوں کو اس کتاب سے نفع اٹھانے کی توفیق بخشے۔ آمین

۲۵ محرم ۱۳۶۶ھ — شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ

۱۷ مئی ۱۹۶۶ء — جامعہ اسلامیہ بہاولپور

محقق جلیل فاضل لبیب حضرت العلامہ مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی دامت فیوضہم

باسمہ سبحانہ وبحمدہ امابعد

بگرامی خدمت مخدوم ومکرم حضرت مولانا صفدر صاحب متع اللہ تعالیٰ المسلمین بفیوضہم وبرکاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بفضلہ تعالیٰ آپ کی گراں قدر تصنیف منیف احسن الکلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گو مطالعہ سرسری تھا قیلولہ کے وقت تاہم مستفید ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی مشکور فرمائے۔ آپ نے بحث کا خوب احاطہ کیا۔ بڑی اچھی کتاب لکھی۔ تحقیق الکلام کے جواب کا قرض جو حنفیوں کے ذمے چلا آتا تھا مع شے زائد ادا کر دیا۔ جزاک اللہ تعالیٰ عنا وعن سائر المسلمین خیرًا۔ گو بعض جگہ بحث کا رنگ غیر مقلدوں (نام نہاد اہلحدیث) کی طرح متعنتانہ ہوگیا، مگر اس سلسلہ میں غالبًا آپ کا عذر یہ ہوگا کہ خصم نے اس طرز پر مجبور کیا کہ قدیم زمانے سے خصم نے ظلم کا یہی طریق اپنا رکھا ہے۔ والبادی اظلم۔ والسلام

۲۹ شعبان ۱۳۵۵ھ — خاکسار نعمانی از کراچی

نوٹ: حضرت العلام نے چند غلطیوں کی نشاندہی فرمائی جن کی اب اصلاح کر لی گئی ہے۔ (صفدر)

حضرت العلام فقیہ جلیل مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم

مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ احسن الکلام کی تحقیق عمیق اور جامعیت دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں۔ فقط والسلام

رشید احمد

از اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

۱۳ر رمضان ۹۸ ۱۳ھ

نوٹ: حضرت مفتی صاحب نے بھی چند اغلاط کی اصلاح کا مشورہ دیا۔ جن کی اس طبع میں اصلاح کردی گئی ہے۔ (صفدر)

دیباچہ طبع سوم

مُبسمِلاً وَّ مُحَمِّداً وَّ مُصَلِّیاً

امابعد راقم اثیم اللہ تعالیٰ کے بے حد و لاشمار انعامات و احسانات کا شکریہ کس زبان سے ادا کرے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے اس گنہگار کو جہاں اور حسّی اور معنوی انعامات سے نوازا وہاں دین کی خدمت اور تالیفِ کتب کا زرّین موقع بھی مرحمت فرمایا اور بفضلہ تعالیٰ راقم اثیم کی ہر ہر کتاب اپنی اپنی جگہ مفید ثابت ہوئی۔ فللہ تعالیٰ الحمد زیر نظر کتاب احسن الکلام کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی سے جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔ وہ پاک و ہند کے جیّد اور نامی گرامی علماء کرام کی عمدہ آرا اور بلند پایہ تصدیقات سے بالکل عیاں ہے اور ان حضرات میں سے بعض وہ بزرگ ہستیاں ہیں کہ علمی اور تحقیقی طور پر وہ بین الاقوامی شہرت و حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے علم پر عوام تو کیا بلکہ خواص اور مزید براں خواص الخواص کو بھی کلی اعتماد ہے۔ اس دیباچہ میں ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ چند ضروری باتیں عرض کرتے ہیں۔

۱۔ طبع دوم کے دیباچہ میں ہم نے یہ گذارش کی تھی کہ جو حضرات (ان کا نقطۂ نظر خواہ کچھ ہی ہو) ہماری کوتاہیوں پر ہمیں آگاہ کریں گے تو ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے۔ الحمدللہ تعالیٰ کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ خاصی مفید رہی ہے۔ چنانچہ فاضلِ جلیل محقق العصر حضرت العلامہ مولانا محمد عبدالرشید صاحب نعمانی دامت برکاتہم اور عالم نحریر نمونۂ سلف فقیہ دوراں

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت فیوضہم کراچی نے بعض اغلاط کی نشاندہی کی جن کی اب تصحیح کر دی گئی ہے اور ہم ان حضرات کے ممنون احسان ہیں۔ اسی طرح ہمارے کرم فرما معترض صاحب نے ترجمان الحدیث میں ایک راوی کی تعیین کے بارے میں غلطی بتائی ہے۔ ہم نے اس کی بھی اصلاح کر دی ہے اور وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں بایں ہمہ اب بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ طبع ہٰذا اغلاط سے بالکل مبرّا ہے۔ بھلا انسان کا کام اور وہ بھی راقم اثیم جیسے بے بضاعت اور پُر تقصیر کا کام غلطی سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ؎

تم تو پھولوں کے طلب گار نظر آتے ہو
میرے دامن میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر اب بھی ہم شرح صدر کے ساتھ کہتے ہیں کہ معقول اغلاط کی نشاندہی پر ہم ہر وقت شکر گزاری کے لیے تیار ہیں۔

۳۔ احسن الکلام کے معرض وجود میں آنے کی وجہ سبب تالیف میں باحوالہ مفصل مذکور ہے کہ فریق ثانی امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض قرار دیتا ہے اور نہ پڑھنے والوں کی نماز کو ناقص کالعدم، بیکار اور باطل قرار دیتا ہے۔ اور حنفیوں کو بے نماز اور مفسدینِ صلوٰۃ کے خطاب سے نوازتا ہے اور حتی کہ احناف کی عورتوں سے بلا اطلاق غیر مقلدوں کا نکاح جائز قرار دیتا ہے اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کو کافر اور مخلد فی النار تک ناروا فتووں سے رگیدتا ہے۔ اور ظاہر امر ہے کہ فرضیت قطعی دلیل کے بغیر تو ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی اور اہل علم جانتے ہیں کہ قطعی دلیل نص قرآنی، خبر متواتر اور اجماع ہی ہے ان کے علاوہ اور کوئی دلیل قطعی نہیں مگر یقین جانیے کہ فریق مخالف اپنے اس باطل اور بے بنیاد دعوے پر ایک بھی حوالہ اور دلیل نہیں پیش کر سکا اور نہ تا قیامت پیش کر سکتا ہے اور جو غیر متعلق اور بے جان دلائل انھوں نے پیش کیے ہیں ان کا حال احسن الکلام سے بفضلہ تعالیٰ بخوبی واضح ہو چکا ہے اور کتاب کو پڑھنے والا ہر منصف مزاج اس کو سمجھ سکتا ہے۔

۴۔ ترجمان الحدیث میں عین اس دور میں جبکہ تحریک ختم نبوت اپنے عروج پر تھی مسلمان تو کیا حتّٰی کہ خود کو مسلمان کہلانے والے طبقے بھی مرزائیوں کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں

قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اور ہمارے کرم فرما ترجمان الحدیث میں قسط وار احسن الکلام پر برسنے میں اور اس میں کیڑے نکالنے میں مصروف تھے اور تحریک ختم نبوت کے قائد اور روح رواں حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ المتوفی ۱۳۹۷ھ کو ان کے استاذ محترم کی کتاب "نیل الفرقدین" ص ۷۰ کے ایک حوالہ کے پیش نظر بلاوجہ ان الفاظ سے خطاب کیا جا رہا تھا کہ کیا حضرت (مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) کاشمیریؒ اور ان کے تلامذہ بالخصوص حضرت بنوری یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل مدینہ کا مسلک ترکِ رفع الیدین تھا؟ بلفظہٖ (ترجمان الحدیث بابت ماہ نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۷)۔ ہر سمجھدار آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک خالص اسلامی اور مذہبی تحریک کے قائد کو تحریک کے دور میں ان کے استاذ محترم کا حوالہ نکال کر کوسنا اور مطعون کرنا اور وہ بھی محض ایک فرعی مسئلہ میں کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن اس متعصبانہ کارروائی سے اُن کی شخصیت اور عظمت میں کیا فرق پڑا؟ آخر انھیں کی مبارک قیادت میں یہ مشکل ترین مسئلہ حل ہوا اور قانونی طور پر مرزائیوں کے ہر دو فرقے (قادیانی اور لاہوری) کافر قرار دیے گئے۔ ولنعم ماقیل ؎

جنھیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

۴۔ جمہور اہل اسلام اور ان میں سے علی الخصوص احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعتھم اس مسئلہ کو اختلافی مسئلہ سمجھتے ہیں اور صرف یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ سمیت کسی بھی قسم کی قرأت ممنوع اور مکروہ ہے۔ نہ تو وہ اس مسئلہ میں کسی کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ کسی کی منکوحہ بیوی چھیننے کا فتویٰ دیتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسئلہ کی وجہ سے فی النار والسقر تک پہنچاتے ہیں مگر فریق ثانی کو لفظ مکروہ بھی خاصا چبھتا ہے۔ چنانچہ ترجمان الحدیث ص ۱۸ بابت ماہ جولائی ۱۹۷۲ء میں مشہور مؤرخ اسلام اور حنفی عالم کا شکوہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی سے سبھی اہل علم واقف ہیں کسی دور میں ان کا مشہور قول تھا کہ آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، غیر مقلد نہیں ہو سکتا یہ بزرگ فاتحہ خلف الامام کو مکروہ خیال کرتے تھے ...... الخ بقول ناقل حضرت مولانا شبلی مرحوم کا مشہور قول آخر بلاوجہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس کی تہ میں کچھ ہوگا اور انھوں نے ضرور کچھ محسوس کیا ہوگا۔ نیز اگر واقعی احناف کی نماز کالعدم، بے کار اور باطل ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ

فاتحہ نہیں پڑھتے اونہ اس کے قائل ہیں۔ اور مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں کہ جو حکم امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کا ہے وہی حکم نہ پڑھنے کا حکم دینے کا ہے اور ہر محقق حنفی یہی کچھ کہتا ہے تو غیر مقلدین حضرات اپنے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) کی زندگی بھر کی جمعہ کی نمازوں کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ آیا ان کی نمازیں ادا ہوئیں یا نہیں؟ کیونکہ لکھنے والوں نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ "بلکہ مدت العمر شاہی مسجد (دہلی) کے حنفی امام کے پیچھے نماز جمعہ ادا فرماتے رہے۔" (مقدمہ معیار الحق صدق) اس سے یہ بات بالکل روشن اور عیاں ہوگئی کہ غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکل نہ صرف یہ کہ حنفی امام کو مسلمان سمجھتے بلکہ ان کو اپنے سے بہتر قرار دے کر مدت العمر ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز ادا کرتے رہے۔ لہٰذا غیر مقلدین حضرات کو اس ناروا غلو اور بے بنیاد دعوے سے فوراً رجوع کر لینا چاہیے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت نہ کرنے والے اور اسی طرح اس کو ضروری نہ قرار دینے والے مسلمان نہیں یا کم از کم بہتر مسلمان نہیں یا بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ ہیں کیونکہ اس باطل نظریہ سے احناف کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ البتہ خود ان کے اکابر اس کی زد میں آتے ہیں اور اس باطل دعوے سے خود ان کے بزرگوں کا دامنِ علم و تقویٰ مطعون و مجروح ہوتا ہے۔ غور کرنا خود ان کا کام ہے: ؎

اگر کچھ کم ہے جو کچھ ہو چکا بیدار کرنے کو
تو کل افسانۂ عبرت کے عنواں اور بھی ہوں گے

۵۔ ترجمان الحدیث میں کئی قسطوں میں احسن الکلام پر اکثر وہی اعتراضات قدرے تشریح کے ساتھ بدمزہ سے بدمزہ کر کے پیش کیے گئے ہیں جن کے اصولی طور پر مدلل جوابات با حوالہ احسن الکلام میں مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت قتادہؒ مدلس ہیں۔ حضرت ابو اسحاقؒ مختلط اور مدلس ہیں۔ محدث ابو الزبیرؒ مدلس ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ ضعیف ہیں۔ محمد بن اسحاقؒ اور نافعؒ اور علاء بن عبد الرحمٰنؒ ثقہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں یہ کہ فلاں راوی کے بارے میں احسن الکلام میں تضعیف یا توثیق کا فلاں جملہ نقل نہیں کیا گیا۔ اور فلاں عبارت کا معنی غلط کیا ہے اور فلاں موقوف حدیث کو مرفوع بنا دیا ہے اور فلاں حوالے میں کتر بیونت کی ہے اور فلاں عبارت کا صحیح مطلب مؤلف احسن الکلام اپنی جہالت

کی وجہ سے نہیں سمجھ سکا اور فلاں جگہ دجل وتلبیس سے کام لیا ہے اور فلاں عبارت کو سیاق وسباق سے الگ کر کے مطلب لیا ہے اور فلاں مقام پر راوی کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اسی راوی کو متابعت اور شاہد میں پیش کر کے اس سے احتجاج کیا ہے اور ہمارے فلاں ثقہ راوی کو ضعیف کہدیا ہے اور فلاں راوی کو اپنے ہاتھ کے کرتب سے ثقہ کر دکھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ اہل علم اور سمجھدار حضرات احسن الکلام کے مضبوط اور ٹھوس دلائل اور روشن حوالوں اور اس کی عمدہ ترتیب اور سلاست سے بخوبی واقف ہیں اور ان تمام رکیک شبہات کا رد اس میں مذکور ہے۔ ہمیں مزید کچھ کہنے اور لکھنے کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ محض کیڑے نکالنے اور اعتراضات کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن کریم پر اعتراضات کیے ہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) لیکن اس سے کلام اللہ تعالیٰ کی صداقت وعظمت پر کیا زد پڑی یا پڑ سکتی ہے؟ منکرین حدیث مجموعی طور پر کتب حدیث پر برستے رہتے ہیں مگر اس سے دینی کتب کے اس عظیم ذخیرہ میں کیا کمی اور نقص پیدا ہو سکتا ہے؟ خود غیر مقلد حضرات فقہ حنفی کی مشہور اور متداول کتابوں پر اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کتاب حقیقۃ الفقہ اور نتائج التقلید وغیرہ میں اس امر کا واضح اور وافر ثبوت موجود ہے۔ اور فتاویٰ عالمگیری پر ان کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ تو قریب کے حلقوں میں پان فروشوں اور انڈے فروشوں تک پہنچ چکے ہیں لیکن اس سے ان کو بجز اپنے دل ماؤف کی بھڑاس نکالنے کے اور کیا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ تمام کتابیں بھی موجود ہیں اور ان میں مذکور ہزارہا مسائل بھی موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق برابر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی طرح اگر بعض مہربانوں کی طرف سے احسن الکلام پر بھی کچھ لایعنی سوالات ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں تو اس سے اس کے صحیح دعاوی اور قوی دلائل اور محکم براہین میں کیا فرق پڑتا ہے۔ اہل خرد جانتے ہیں کہ نری لفاظی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

۴۔ ہماری دانست میں ترجمان الحدیث میں احسن الکلام پر کیے گئے جملہ اعتراضات میں

صرف دو باتیں علمی طور پر قابل توجہ ہیں۔ ممکن ہے بعض اہل علم کو ان سے مغالطہ پیدا ہو، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں نقل کر کے قدرے تفصیل سے ان کے جوابات عرض کر دیے جائیں تاکہ کسی کو غلط فہمی پیدا نہ ہو اور صحیح بات بھی سامنے آجائے۔

اوّل ہم نے احسن الکلام میں اسرائیلؒ عن ابی اسحاقؒ کی ایک سند سے استدلال کیا تھا۔ اس پر گرفت کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ جون ۱۹۷۴ء میں صفحہ ۱۷ تا ۲۸ اس مشہور محدث اور صحیحین کے مرکزی راوی امام ابو اسحاقؒ کے اختلاط اور ان کی تدلیس پر خاصی لاحاصل بحث کی ہے جس کی چند اہم اور مرکزی باتیں یہ ہیں:

(۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ بخاری میں ان سے بجز ان کے اصحاب قدماء کے اور کوئی روایت میں نے نہیں دیکھی۔ (ہدی الساری جلد ۲ ص ۱۹۹)

(۲) ابو اسحاقؒ مدلس تھے اور ان کا عنعنہ صحت حدیث کے منافی ہے اور آخر عمر میں اختلاط اور تغیر کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (ترجمان مذکور ص ۲۸)

(۳) زہیرؒ کی روایت عن ابی اسحاقؒ امام بخاریؒ اور محدث مبارکپوریؒ کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ امام ابو داؤدؒ زہیرؒ عن ابی اسحاقؒ کو اسرائیلؒ عن ابی اسحاقؒ سے بدرجہا بہتر قرار دیتے ہیں اور بقول امام احمدؒ اسرائیلؒ نے ابو اسحاقؒ سے اختلاط کے بعد بھی سنا ہے۔ (ص ۲۷) لہٰذا ان کو اُن پر کوئی مزیت حاصل نہیں ہے۔

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے دفع الوقتی کے سوا کچھ نہیں۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ کیجیے:

(۱) خود حافظ ابن حجرؒ ہی امام ابو زرعہؒ، امام ابو حاتمؒ اور امام احمدؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ زہیرؒ نے ابو اسحاقؒ سے آخر عمر میں ابو اسحاقؒ کے مختلط ہونے کے بعد سماعت کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۵۲)

اور زہیرؒ کی ابو اسحاقؒ سے بخاری ج ۱ ص ۷، ۲۰ و ج ۱ ص ۱۳۹ و ج ۱ ص ۲۲۷ وغیرہ میں روایتیں موجود ہیں اور حافظ ابن حجرؒ زکریا بن ابی زائدہؒ کے بارے میں امام احمدؒ اور محدث عجلیؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابو اسحاقؒ سے آخر عمر میں سماعت کی ہے۔

(دیکھیے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۳۰)

اور زکریاؒ بن ابی زائدہؒ کی ابو اسحاقؒ سے روایت بخاری ج ۱ ص ۴۲۴ وغیرہ میں موجود ہے۔

اور خود معترض مذکور امام ابوداؤد رح کی تحقیق کے پیش نظر اسرائیل رح کی ابواسحاق رح سے روایت ان کے اختلاط کے بعد بھی تسلیم کرتے ہیں اور بخاری ج ا ص ۵۶ و ۲۵۰ و ۵۱۲ وغیرہ میں اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کی سند سے کئی روایات موجود ہیں پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ بخاری میں ابواسحٰق رح کے ان قدیم شاگردوں کی روایات ہی مذکور ہیں جنھوں نے ان سے اختلاط سے قبل سماعت کی ہے۔ بس یہی کہا جاتے گا کہ ابواسحٰق رح ایسے مختلط ہوئے ہی نہیں کہ ثقاہت سے گر جائیں اور اسرائیل رح کی روایت ابواسحاق رح سے اثبت اور ارجح ہے۔ ہاں بعض کے نزدیک اگر آخر عمر میں ان کے حافظہ میں کچھ تغیر ہوا ہے تو اس دور میں زہیر رح نے ان سے سماعت کی ہے۔

(۲) اگرچہ امام بخاری رح اور مبارک پوری صاحب رح کے نزدیک زہیر عن ابی اسحٰق رح کی روایت راجح ہے مگر امام ابوزرعہ رح، امام ابوحاتم رح، امام احمد رح اور امام ترمذی رح وغیرہم حضرات کی تحقیق کے لحاظ سے زہیر کی ابواسحاق رح سے روایت کمزور ہے اور ابوداؤد رح کے علاوہ باقی تقریباً تمام حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اصح اور ارجح قرار دیتے ہیں اور اس کے متعلق احسن الکلام میں واضح حوالے موجود ہیں وہیں ملاحظہ کر لیں۔ یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) اسرائیل رح کے بارے میں امام احمد رح کی یہ رائے کہ انھوں نے ابواسحاق رح سے آخر عمر میں سماعت کی منفرد رائے ہے اور باقی حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اثبت کہتے ہیں لہٰذا جمہور کے نزدیک اسرائیل عن ابی اسحٰق رح کی سند بلاشبہ صحیح اور راجح ہے۔

دوم۔ احسن الکلام میں ابوالزبیر رح عن جابر رض کی ایک سند سے احتجاج کیا گیا تھا اس پر کلام کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ فروری ۱۹۷۴ء ص ۷ تا ۲۹ و ماہ مارچ ۱۹۷۴ء ص ۳۸ تا ۴۸ میں مشہور محدث ابوالزبیر رح (محمد بن مسلم رح بن تدرس رح) کے عنعنہ پر طویل اور ناکام بحث کی ہے جس کے مرکزی نکات یہ ہیں:

(۱) ابوالزبیر مدلس تھے اور محدثین کرام رح کی خاصی جماعت نے ان کے مدلس ہونے کا ذکر کیا ہے اور بعض محدثین رح کے حوالے بھی انھوں نے ذکر کیے ہیں۔

(۲) ابوالزبیر رح کی لیث رح کے طریق اور سند سے عنعنہ والی روایت تو صحیح اور قابل قبول ہے مگر اس کے علاوہ ابوالزبیر رح کی کوئی روایت جو عنعنہ سے ہو قابلِ قبول نہیں ہے اس پر

بھی چند حوالے انھوں نے نقل کیے ہیں۔

(۴) ابوالزبیرؒ کی جن روایات میں تحدیث ہے وہ تو قابل قبول ہیں اور جن روایات میں ان کا عنعنہ ہے اور وہ لیثؒ کے طریق سے بھی نہیں تو چونکہ دیگر حضرات صحابہ کرام رضؓ سے بھی وہ روایات مروی ہیں۔ بنابریں اگر ابوالزبیرؒ کے سماع کی تصریح ان مخصوص الفاظ سے نہ بھی ملے تب بھی صحتِ حدیث پر کوئی حرف نہیں آتا۔ (محصلہ)

الجواب۔ معترض صاحب نے یہ جو کچھ بھی کہا ہے ان کو سودمند نہیں ہے۔

اوّل تو اس لیے کہ بلاشبہ ابوالزبیرؒ کا نام مدلسین کی فہرست میں موجود ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں جتنے حوالے اس سلسلہ میں معترض صاحب نے نقل کیے ہیں اگر ہم چاہیں تو بحمد اللہ تعالیٰ ان سے دوگنے حوالے مزید نقل کر سکتے ہیں لیکن ابوالزبیرؒ اُن مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس مضر نہیں اور احسن الکلام میں توجیہ النظر کے حوالہ سے اس کی بحث موجود ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ علامہ جزائریؒ نے حافظ ابن حزمؒ کے حوالہ سے مدلسین کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم ان مدلسین کی ہے جو حافظ و عادل ہوں اور ان کے بارے میں وہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وسواء قال اخبرنا فلان او قال عن فلان او قال فلان عن فلان کل ذلك واجب قبولہ مالم یتیقن انہ اورد حدیثاً بعینہ ایراداً غیر مسند فان ایقنا ذلك ترکنا ذلك الحدیث وحدہ فقط و اخذنا سائر روایاتہ .... وھٰذا النوع منھم کان جلۃ اصحاب الحدیث وائمۃ المسلمین کالحسن البصری وابی اسحاق السبیعی وقتادہ بن دعامۃ وعمرو بن دینار وسلیمٰن الاعمش وابی

اور برابر ہے کہ وہ مدلس اخبرنا فلاں کہے یا عن فلاں کہے یا قال فلاں عن فلاں کہے ان سب صورتوں میں اس کی روایت واجب القبول ہے جب تک کہ یہ یقین نہ کر لیا جائے کہ اس نے کوئی حدیث غیر مسند پیش کی ہے اور جب ہمیں اس کا یقین ہو جائے کہ اس نے فلاں حدیث مسند بیان نہیں کی تو ہم صرف وہی روایت اس کی ترک کریں گے اور باقی اس کی تمام روایات لیں گے .... اور اس قسم میں بڑے بڑے محدثین اور ائمۃ المسلمین شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ ابو اسحاق السبیعیؒ قتادہؒ بن دعامہ، عمرو بن دینارؒ، سلیمانؒ الاعمشؒ،

الزبير وسفيان الثوری وسفيان بن عيينة اھ (كتاب الاحكام فی اصول الاحكام ج ٢ ص ١٤١ لابن حزمؒ وتوجيه النظر ص ٢٥١ للجزائریؒ)

ابو الزبیرؒ سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ .... الخ

(کتاب الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۲ لابن حزمؒ و توجیہ النظر ص ۲۵۱ للجزائریؒ)

۱ اہل علم جانتے ہیں کہ بیشتر صحیح احادیث کے رواۃ یہی حضرات ہیں اس عبارت سے یہ ضابطہ معلوم ہوا کہ ان مذکور حضرات کی جن میں ابو الزبیرؒ بھی شامل ہیں معنعن احادیث مطلقاً قابل قبول ہیں اور ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ چوٹی کے محدثین نے ان حضرات کی معنعن روایات سے استدلال کیا ہے چنانچہ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ

وفی الصحيح قطعة من الاحتجاج بعنعنة المدلس كابی الزبير عن جابرؓ وسفيانؒ عن عمرو بن دينار ونظائر كثيرة لذالك - (تهذيب سنن ابی داؤد، جلد ٧ ص ٩٨)

صحیح (یعنی بخاری و مسلم) میں مدلس کے عنعنہ والی روایتوں سے احتجاج کا ایک کافی حصہ موجود ہے جیسے ابو الزبیرؒ عن جابرؓ اور سفیانؒ عن عمرو بن دینارؒ اور اس جیسی بکثرت نظیریں۔

(تہذیب سنن ابی داؤد، جلد ۷ ص ۹۸)

امام بخاریؒ نے ابو الزبیرؒ کی مقرون بعطاءؒ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ جلد ا ص ۲۹۱ اور جلد ا ص ۹۸ و جلد ا ص ۲۲۳ میں ابو الزبیرؒ عن جابرؓ کو متابعات میں پیش کیا ہے اور اسی طرح جلد ا ص ۱۷۶ میں بھی لیکن کتابت کی غلطی سے ابو الزبیرؒ کی جگہ ابو زید لکھا گیا ہے۔

(دیکھیے مصری نسخہ بخاری مع شرح فتح الباری جلد ۳ ص ۱۳۱ وعمدۃ القاری جلد ۸ ص ۱۲۱)

بلکہ امام بخاریؒ نے ابو الزبیرؒ عن جابرؓ کی سند سے احتجاج بھی کیا ہے۔ اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ امام بخاریؒ فقہی مسائل بیان کرنے کے لیے باب ترجمہ اور عنوان قائم کرتے ہیں اور علماء کا مشہور مقولہ ہے فقہ البخاری فی الابواب والتراجم۔ پھر اس دعوے کے اثبات کے لیے کبھی تو وہ مسند اور مرفوع روایت پیش کرتے ہیں اور کبھی معلق روایت اور کوئی اثر نقل کرتے ہیں اور اس طریقے سے وہ اپنے دعوے کو مدلل اور مبرہن کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ

نے جلد ا ص ۲۲۴ میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ باب الاھلال من البطحاء وغیرھا للمکی..... الخ یعنی مکہ مکرمہ میں رہنے والے کا البطحا وغیرہا سے احرام باندھنے کا باب۔ (منی کے قریب ایک جگہ ہے جس میں بکثرت سنگریزے ہیں اس کو بطحاء، ابطح، محصب، حصبہ اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ اس وقت اس کے قریب کلیہ عبدالعزیز یعنی عبدالعزیز کالج ہے) اور امام بخاری رحمہ نے اس دعوے کے اثبات کیلئے وقال ابو الزبیر عن جابر رض اھللنا من البطحاء کے اثر سے احتجاج کیا ہے باب میں پیش کردہ اس دعوی کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل انھوں نے پیش نہیں کی انصاف شرط ہے کہ احتجاج اور استدلال اور کیا ہوتا ہے؟ اگر امام بخاری رحمہ نے اس دعوے کے اثبات کے لیے کوئی اور مسند اور مرفوع حدیث پیش کی ہوتی اور ساتھ یہ اثر بھی پیش کیا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ ابو الزبیر رحمہ عن جابر رض کا اثر صرف متابعت میں پیش ہوا ہے مگر ایسا نہیں ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ فرماتے ہیں کہ

واحتج الجمھور بحدیث ابی الزبیر عن جابر رض وھو الذی علقہ المصنف فی ھذا الباب....... الخ	جمہور نے ابو الزبیر رحمہ عن جابر رض کی روایت سے احتجاج کیا ہے اور وہ یہی حدیث ہے جس کو امام بخاری رحمہ نے اس باب میں معلق بیان کیا ہے۔

(فتح الباری جلد ۴ ص ۲۵۲)

الغرض جمہور محدثین کرام رحمہ ابو الزبیر عن جابر رض کی سند سے احتجاج کرتے اور اس کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

دوم اس لیے کہ اگر صرف لیث رحمہ عن ابی الزبیر رحمہ کی سند سے ہی ابو الزبیر کی معنعن حدیثیں صحیح ہیں اور باقی نہیں تو پھر مسلم شریف کی ان تمام روایات کی صحت کا انکار کر دیا جائے، جو ابو الزبیر رحمہ سے من غیر طریق لیث رحمہ معنعن مروی ہیں۔ مثلاً جلد ا ص ۲۲۴ و ص ۴۴۰ و ص ۴۶۲ و ص ۴۶۵ و جلد ۲ ص ۴ و ص ۷ و ص ۱۱ و ۲۷ و ۳۲ و ۳۸ و ۶۵ و ۱۶۶ و ۱۹۷ و ۲۰۲ وغیرہ وغیرہ۔ پھر صحیح مسلم کو صحیح کہنے کی رٹ ترک کر دی جائے اور اگر یہ روایات صحیح ہیں اور یقیناً جمہور امت کے نزدیک صحیح ہیں تو ہماری پیش کردہ روایت عن ابی الزبیر رحمہ عن جابر رض بھی یقیناً صحیح ہے۔

سوم اس لیے کہ امام مسلم رحمہ نے صحیح مسلم میں ابو الزبیر رحمہ عن جابر رض کی جن روایات سے

احتجاج کیا ہے کیا ان میں سے ہر ہر روایت کسی اور صحابی سے بھی امام مسلمؒ نے روایت کی ہے تاکہ ان کی معنعن روایات پر حرف نہ آئے؟ اگر معترض صاحب صحیح مسلم میں سے انہیں مضامین کی روایات جو ابو الزبیرؒ عن جابرؓ کے طریق سے مروی ہیں دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی روایات سے باحوالہ بتادیں تو ہم علمی اور تحقیقی طور پر ان کے احسان مند ہوں گے۔ دو چار روایتوں میں ایسا کر دکھانا کوئی کمال نہ ہوگا۔ ہر ہر روایت اور مضمون میں یہ مطلوب ہے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے اور یقین جانیے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے تو اس سے لازماً یہی سمجھا جائے گا کہ مسلم شریف کی بے شما حدیثیں ان کے اس غلط نظریہ سے غیر صحیح قرار پائیں گی اور صحیحین کی صحت کے بارے میں ان حضرات کا دعوٰی محض زبانی جمع خرچ تصور ہوگا جیسا کہ مخفی نہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی سطحی قسم کے اعتراضات اور بزعم خود جوابات ترجمان الحدیث میں موجود اور مذکور ہیں لیکن ہمارا دیانتاً یہ نظریہ ہے کہ ان سے کسی اہل علم اور صاحب بصیرت آدمی کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم ان کو نقل کر کے قارئین کرام کے اذہان کو بلاوجہ اور بے ضرورت پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمدٍ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ واتباعہ الیٰ یوم الدین وبارک وسلم۔

احقر النّاس

ابو الزاہد محمد سرفراز

۱۶ صفر ۱۴۰۰ھ

۵ جنوری ۱۹۸۰ء

دیباچہ طبع دوم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

(۱) بعض غیر مقلدین حضرات نے یہ بے جان دعویٰ کیا تھا کہ جس شخص نے ہر رکعت میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز بے کار، باطل اور کالعدم ہے اور اس پر تمام دنیا کے احناف کو کھلا چیلنج بھی کیا تھا۔ راقم اثیم نے ان کے اس غلو کے رد میں ٹھوس دلائل کے ساتھ دو جلدوں میں بلسوط کتاب احسن الکلام لکھی جس کو نہ صرف یہ کہ عام تعلیم یافتہ حضرات ہی نے پسند کیا بلکہ ہندو پاک کے متبحر اور نامور علماء کرام نے اس کی بیحد تعریف کی اور اپنی زریں اور قیمتی آرا اور تصدیقات سے راقم کی عزت افزائی کی اور کتاب کی اغلاط کی طرف بھی توجہ دلائی جو بمقتضائے بشریت کچھ تو راقم سے اور کچھ کتابت کی وجہ سے اور بعض کاپیوں اور پروفوں کی کما حقہٗ تصحیح نہ ہو سکنے کی وجہ سے باقی رہ گئی تھیں جن حضرات نے نمایاں غلطیوں کی نشاندہی کی ان میں علی الخصوص سند العلماء رئیس المحققین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا ابو عبید اللہ غلام سرور صاحب دام مجدہم (چنن ضلع گجرات) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور راقم تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۲) جہاں ان حضرات نے اس کتاب کے مضبوط دلائل اور براہین اور حسن ترتیب کی شاندار تحسین کی وہاں غیر مقلدین حضرات نے اس پر ضرورت سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار فرمایا چنانچہ

ان کی جماعت کے چوٹی کے مدرس عالم اور سابق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے ایک مستقل کتاب خیر الکلام تحریر فرمائی جس میں جوابات کا بیشتر حصہ محض سینہ زاد جوابات اور صدری نسخوں پر مشتمل ہے۔ اس کا یہ احتمال ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یوں لینا چاہیے۔ اور اس کا مطلب یوں بھی لیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر بات ہے کہ احسن الکلام کے ٹھوس اور معنی خیز حوالوں کا جواب محض احتمالات اور سینہ زاد باتوں سے نہیں ہو سکتا یہاں ٹھوس حوالہ جات درکار تھے اور یہی ان کے بس کا روگ نہ تھا اور روایات کے بارے میں وہ ساری کتاب میں ایک ہی ضابطہ سے کام لیتے رہے ہیں وہ یہ کہ جرح مفسر کو بھی جرح مبہم گردان کر اور ایک دو حوالے راوی کی توثیق کے نقل کر کے یہ فیصلہ صادر فرماتے رہے ہیں کہ لہٰذا جو جرح مؤلف احسن الکلام نے کی ہے وہ مبہم ہے اور توثیق کے بعد اس کا کوئی اعتبار نہیں اور کہیں تعدد طرق کا سہارا لیکر حدیث کو حسن بنا ڈالا ہے۔ خیر ہم نے بقدر وسعت طبع ثانی میں اس کا خوب جائزہ لیا ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے احسن الکلام کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کیلئے اور اپنی جماعت کے جذباتی حضرات کے جذبات کو اُبھارنے کیلئے آخر میں سترہ عدد مناقشات بھی درج فرمائے ہیں جن کا ذکر کتاب میں پہلے بھی وہ اپنے خیال میں مناسب مقامات پر کر چکے ہیں اور یہ چیز ان کے پیش نظر رہی ہے کہ احسن الکلام کی اغلاط ان کے حواریوں کے ذہن میں النقش فی الحجر ہو جائیں اور اس کتاب سے اور اس کے مصنف سے بدظنی پیدا ہو جائے۔ مثلاً ایک جگہ یہ تھا کہ حضرت امام عبداللہ بن المبارکؒ حضرت امام بخاریؒ کے استاد الاستاد تھے۔ الاستاد کا لفظ کتابت سے چھوٹ گیا تو اس پر مناقشہ کھڑا کر لیا گیا کہ اس مؤلف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام ابن مبارکؒ، امام بخاریؒ کے استاذ نہیں ہیں۔ اور ایک مقام پر فقرأ امامہٗ کا جملہ غلطی سے رہ گیا تو اس پر بھی خوب مصالحہ لگا کر مناقشہ کی عمارت کھڑی کر دی گئی اور ایک جگہ قتادہؒ کا نام سند سے چھوٹ گیا تو اس کو کئی مقامات پر انھوں نے اُچھا گر کیا اور یہ لکھا کہ چونکہ یہ تیسرے درجہ کے مدلس تھے۔ تب ان کو گرا دیا گیا ہے، حالانکہ راقم نے خود احسن الکلام میں باحوالہ یہ لکھا ہے کہ قتادہؒ کی تدلیس سرے سے مضر ہی نہیں تو پھر اس کو حذف کرنے کا راقم کو کیا فائدہ تھا؟ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اکثر مناقشے اسی نہج کے ہیں اور جہاں بعض عبارتیں مجمل اور مختصر تھیں۔

اب ان کی تشریح کر دی گئی ہے اور جہاں اغلاط معقول نظر آئیں۔ ان کی اصلاح کر لی گئی ہے۔ ہم نے جب ان کی کتاب میں اسی نہج کے بلکہ ان سے سنگین تر مناقشات کا تتبع کیا تو تقریباً ساٹھ سے زیادہ نظر آئے۔ اگر ضرورت پڑی اور ہم مجبور کر دیئے گئے تو الگ ان کو شایع کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ علمی اور تحقیقی میدان میں ہم اس طعنہ بازی کو پسند نہیں کرتے اور نہ اس کا اثر اچھا رہتا ہے۔ ان مناقشات کو انھوں نے فہرست کتاب میں غلط بیانیاں، تحریفات اور مغالطات وغیرہ سے تعبیر کر کے اپنے دل کی خُوب بھڑاس نکالی ہے۔ سچ ہے کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ۔

(۳) غیر مقلدین حضرات نے جب بخوبی یہ محسوس کر لیا کہ خیر الکلام تو احسن الکلام کا معقول جواب نہیں اور علماء تو کیا جذباتی مزاج جماعتی کارکن بھی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے تو ایک صاحب نے الاعتصام میں قسط وار احسن الکلام کی تردید شروع کر دی جس میں انھوں نے علمی اور تحقیقی سطح سے بہت ہی نیچے اتر کر محض تعصبِ مذہبی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس میں بیشتر وہی باتیں دہرائی ہیں جو پہلے حضرات مسئلہ خلف الامام کے سلسلہ میں لکھ اور کہہ چکے ہیں۔ ہاں البتہ یہ سب کچھ انھوں نے صرف جذبات اور تعلّی کی صورت میں ادا کیا ہے ان کی قابل جواب باتوں کا ذکر ہم نے کتاب میں کر دیا ہے۔ باقی لایعنی باتوں کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی۔ البتہ انھوں نے الاعتصام اور مغالطات احسن الکلام میں جو باتیں خوب کھل کر چیلنج بازی کی شکل میں کہی ہیں وہ اصولاً واختصاراً یہ ہیں:

(۱) مؤلف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عبارت سے دھوکا دیا ہے ......الخ

اس کا جواب اور حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری عبارت ہم نے طبع دوم میں ذکر کر دی ہے اور واضح کیا ہے کہ غلطی کس کی ہے؟

(۲) کہ مؤلف احسن الکلام نے محمد بن خازمؒ کی امام ابن حبانؒ سے یہ توثیق تو نقل کر دی ہے کہ وہ ثقہ اور متقن تھا مگر آخر کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ وہ خبیث مرجئی تھا اور یہ بد دیانتی ہے۔ (محصلہ)

مگر یہ بیچارے اصول حدیث سے بالکل کورے ہیں۔ محمد بن خازمؒ بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور اصول حدیث کے رو سے ثقہ راوی کا خارجی یا جہمی معتزلی یا مرجئی وغیرہ ہونا اس کی ثقاہت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا اور صحیحین میں ایسے راوی بکثرت موجود ہیں۔ تدریب الراوی اور ہدایت السائل میں ان کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے اور خود مؤلف خیر الکلام ص ۲۹۰ میں لکھتے ہیں: "کہ ارجاء وغیرہ بدعات کے اعتراضات سے ثقہ ہونے میں خلل پیدا نہیں ہوتا ...... الخ"

یہ قاعدہ ہمارے پیش نظر تھا اور اس لیے ہم نے یہ جملہ نقل نہیں کیا اور خود جناب قاضی مقبول احمد صاحب کا یہ عالم ہے (اور حیرت ہے کہ الاعتصام کے ذمہ داروں نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی) کہ عبدالرحمٰنؒ بن محمد بن زیادؒ جو صحاح ستہؒ کے راوی ہیں ان سے متعلق لکھا ہے کہ انتہا درجہ کے ضعیف ہیں۔ (الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۸ کالم ۳)۔

(۳) کہ مؤلف احسن الکلام نے راویوں کے بارے میں توثیق و تضعیف نقل کرنے میں خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ مثلاً فلاں ضعیف راوی کے بارے میں فلاں امام نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہے مگر اس قول کو وہ نقل نہیں کرتا اور فلاں ثقہ راوی کو فلاں امام نے ضعیف یا وہمی وغیرہ کہا ہے۔ اس کو بھی وہ پی گیا ہے۔ (محصلہ)

اور الاعتصام میں ان صاحب کا بیشتر مضمون اسی عبارت پر کھڑا ہے اور خوب جذباتی رنگ میں صفحہ صفحہ پر اس کو نمایاں کیا گیا ہے مگر صد افسوس ہے کہ احسن الکلام کی اس عبارت کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس کا حوالہ دیتے۔ چنانچہ عبارت یوں ہے: "ہم نے بعض مقامات پر ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں، لیکن اگر بعض ائمہؒ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ ایسا کوئی بھی ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک شخص نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریت احمر کے مترادف ہے۔ حضرات

صحابہ کرام رضؓ کا رتبہ کس سے مخفی ہے ؟ اور الصحابۃ کلھم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے ؟ مگر خوارج و روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ، ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ : ع زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو انتہی بلفظہ

(احسن الکلام جلد اول، طبع اول ص۳۳)

یہ عبارت بار بار پڑھیے اور داد دیجیے قاضی مقبول احمد صاحب کے واویلا کی کہ مؤلف احسن الکلام نے رواۃ کے بارے میں بد دیانتی کی ہے فلاں راوی کے بارے میں فلاں کا قول ترک کر دیا ہے اور فلاں راوی کے بارے میں فلاں امام کا حوالہ چھوڑ دیا ہے اور الاعتصام میں قاضی صاحب کا زیادہ زور اسی پر صرف ہوا ہے۔ ان کو یہ توحق تھا کہ اس قاعدہ کو دلائل سے غلط ثابت کرتے ۔لیکن اس واضح عبارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مؤلف احسن الکلام کو بد دیانت ثابت کرنا خالص تعصب کا مظاہرہ یا اپنے ناخواندہ حواریوں کو خوش کرنے کا ایک مذموم ڈھنگ ہے۔ بحمداللہ تعالیٰ مؤلف احسن الکلام کو کاملین سے خوشہ چینی کا موقع ملا ہے اور اصول و ضوابط کو سمجھنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کو اہلیت مرحمت فرمائی ہے۔

(۴) عبداللہ بن نافع بن عمیار کے متعلق جو توثیق کے الفاظ مؤلف احسن الکلام نے نقل کیے ہیں اس میں دھوکہ اور بد دیانتی سے کام لیا ہے۔ (محصلہ)

الجواب۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۵۰ اور ۵۱ میں (نمبر ۹۷ اور ۹۸) دو راوی ہیں۔ ایک کا نام عبداللہ بن نافع بن عمیارؒ ہے اور دوسرے کا نام عبداللہ بن نافع بن ابی نافع الصائغ المخزومیؒ ہے۔ غلطی سے ثانی کا ترجمہ پہلے کے ترجمہ میں نقل ہوگیا ہے۔ اور اب طبع دوم میں اس کو بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے ہم نام راویوں کے بارے میں بڑے بڑے اکابر محدثینؒ سے غلطیاں چلی آرہی ہیں۔ نہ توان کو کسی نے دعوت مبارزت دی اور نہ بد دیانت کہا ہے اوروں کی بات ہی چھوڑیے خود مؤلف خیر الکلام بعض مقامات میں اس غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ خیر الکلام ص ۲۴۷ میں لکھتے ہیں "کہ دوسرا راوی اس میں علی بن احمد الحمامی مقری ہے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں ابن ابی الفوارسؒ کہتے

ہیں۔ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔"

(میزان جلد ۲، ص ۲۱۷، لسان المیزان جلد ۴، ص ۱۹۴)

لیکن یہ مؤلف خیر الکلام کی غلطی اور نرا وہم ہے۔ کیونکہ ابن ابی الفوارسؒ نے جس کی تضعیف کی ہے وہ علی بن احمد بن ابی القیس المقرئی الرفاعیؒ ہے جس کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوتی ہے۔ دیکھیے :(لسان المیزان جلد ۴، ص ۱۹۴) اور ہماری پیش کردہ سند میں علی بن احمد بن عمر بن حفص ابوالحسن المقرئی المعروف بابن الحمامیؒ ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی ہے۔

(ملاحظہ ہو۔ بغدادی جلد ۱۱، ص ۳۳۰)

الغرض ہم نام راویوں کے بارے میں ایسے اوہام کا پیش آجانا کوئی مستبعد بات نہیں ہے اور نہ کسی دیانت دار عالم نے آج تک ایسے امور میں کسی کو چیلنج کیا ہے۔

(۵) بایں ہمہ ہم نے الاعتصام میں پیش کیے گئے اعتراضات میں سے جو قابل جواب تھے ان کی قدرے وضاحت کر دی ہے اور ہم ان غیر مقلدین حضرات کے ممنون ہیں کہ انھوں نے احسن الکلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گو ان کا نظریہ ان کا مذہبی تعصب ہے تاہم وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

(۶) مؤلف خیر الکلام سے ہم بجا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ اپنی جماعت کے مدرس عالم اور شیخ الحدیث ہیں کہ وہ اپنی جماعت کے ان غالی لوگوں کو ناصحانہ طور پر ترک غلو کا کوئی مفید مشورہ دے دیتے اور چند سطریں اس پر بھی تحریر فرما دیتے کہ جو لوگ ترک قرأۃ خلف الامام کی صورت میں لوگوں کی نمازوں کو باطل، بے کار اور کالعدم کہتے ہیں وہ اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ اختلافی مسائل میں یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن یقین جانیے کہ انھوں نے صحیح طور پر آج کل کی عدالتی وکالت کا حق ادا کر دیا ہے کہ ہر طرح سے اپنے مؤکل کو خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو سچا ثابت کیا جائے یہ الگ بات ہے کہ عدالت اس کی رائے سے متفق نہ ہو اور اس کو مجرم گردان کر قرار واقعی سزا دے۔ اپنی جماعت کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال کر اس کو برحق قرار دینے پر بلاوجہ ایڑی چوٹی کا زور لگانا کوئی مستحسن امر نہیں ہے۔ ان سے تو خیر الکلام کے صاحب مقدمہ ہی قدرے اچھے رہے کہ انھوں نے صدہ میں کچھ اشارہ

کیا ہے اگرچہ اپنی جماعت کے چیلنج کو مدافعت کہ کر حق پوشی کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے بھائیوں کے حملوں کی مدافعت میں رد کے طور پر جماعت اہل حدیث کے ایک قلیل طبقے کا ایسا رویہ ضرور رہا کیا جو غیر معتدل ہونے کے علاوہ مسلک اہل حدیث کے شایان شان نہ تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غلو کے مقابلہ میں غلو ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔" اھ

اگر تو کسی حنفی نے تمام روئے زمین کے غیر مقلدین حضرات کو ایسا کوئی چیلنج کیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس کی نماز باطل ہے، بیکار ہے، کالعدم ہے۔ تو وہ بلاشک اس کو مدافعت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کیا تو یہ خالص جماعتی ملی بھگت ہی ہے کہ سیدھی سادھی بات میں تاویل کا پیوند لگا کر اس کو حق ثابت کیا جائے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

(۷) اگرچہ اپنی دانست کے مطابق ہم نے اب کتاب کو اغلاط سے پاک کر دیا ہے۔ تاہم ان حضرات کا (خواہ ان کا نقطہ نظر کچھ ہی ہو) شکریہ ادا کریں گے جو ہمیں ہماری کوتاہیوں پر آگاہ کریں گے۔ اور ہمیں معقول اغلاط کی درستی میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

ابو الزاہد
۲۶ رشوال ۱۳۸۴ھ
۲۸ فروری ۱۹۶۵ء

دیباچہ طبع اوّل

کتاب احسن الکلام جلد اوّل و دوم کی تالیف و ترتیب میں گو بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا گیا تھا مگر اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کو صفِ اول کے محقق اور جید علماءِ کرام بھی بے حد پسند فرمائیں گے جیسا کہ تصدیقات اور تقاریظ سے بھی ظاہر ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اُس نے اس حقیر سے یہ خدمت لی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

میں اپنی اس کتاب کا حضرت الاستاد المحقق، المدقق، الفقیہ، المحدث، شیخ المعقول، والمنقول مولانا عبد القدیر صاحب کیمبل پوری دامت برکاتہم (حال او کاڑہ) کے نام گرامی سے انتساب کرتا ہوں کیونکہ اس حقیر کا دینی کتب کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق حضرت موصوف کی خالص توجہ اور نوازش کا رہین منت ہے اور اکثر بڑی اور دقیق کتابیں راقم نے حضرت سے ہی پڑھی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو تا دیر سلامت رکھے اور دین کی خدمت کا مزید موقع دے۔ ع "وَيَرْحَمُ اللهُ عَبْدًا قَالَ اٰمِيْنَا"

احقر

ابو الزاہد

۱۸ ر ذو القعدہ ۱۳۷۴ھ
۹ ر جولائی ۱۹۵۵ء

سخن ہائے گفتنی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیۡنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ط

عالم انسانی میں ہر چیز کا وجود اسباب و علل اور محرکات و دواعی کے وجود پر موقوف ہے۔ جب تک علّتِ وجود اپنے تمام لوازم کے ساتھ معرض وجود میں نہ آجائے کسی چیز کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں یہ ایک عقلی اور فطری قاعدہ ہے۔ اور انسانی افعال و اغراض کا ناگزیر محور جس کے گرد انسان کے سب افعال چکر لگاتے اور گھومتے رہتے ہیں۔

سببِ تالیف

علمی اور عملی، فنی اور تحقیقی لحاظ سے قرأۃ الفاتحہ خلف الامام کا مسئلہ اپنے مثبت اور منفی پہلو کے اعتبار سے قرنِ اوّل سے تاہنوز بحث و تمحیص اور تطبیق و ترجیح کا محتاج رہا ہے۔ حضرات ائمہ دین و محققین علماء نے مختلف زمانوں اور متعدد زبانوں میں اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ محرم اور مبیح پہلو اور راجح و مرجوح گوشہ کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے انتہائی کوشش اور کاوش کی ہے۔ اور سینکڑوں کتابیں اور رسالے اس پر لکھے گئے ہیں۔ مگر اس خاص شکل و صورت

اور ترتیب کے ساتھ نہایت سہل اور آسان طریقہ پر اس کتاب کو پیش کرنے کا بڑا سبب فریقِ ثانی کی حد سے زیادہ تجاوز اور گرم گفتاری ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ اس کی نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اور بعض نے تو یہاں تک غلو سے کام لیا کہ جملہ احناف[1] کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازا ہے۔ اور بعض نے قسم اور حلف[2] اٹھا کر کہا، کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ اور ہم نے ان میں سے بعض کو سلسلۂ تقریر و درس حدیث اور نجی مجلسوں میں منطقِ یونان سے بھی استعانت کرتے دیکھا ہے اور یوں صغریٰ و کبریٰ جوڑ کر نتیجہ[3] نکالتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ قرأت سورۃ فاتحہ نہیں کرتا۔ اس کی نماز نہیں ہوتی اور من ترك الصّلوة متعمّدًا فقد كفر کہ جس شخص نے دیدہ و دانستہ نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ امام کے پیچھے سُورۃ فاتحہ ترک کرنے والا کافر ہے۔ (گو بعض بڑے محتاط اور منصف مزاج حضرات کے نزدیک عملی طور پر ہی وہ کافر ہو گیا۔ مگر ہے ضرور) اور ہمارے زمانے کے ایک صاحب نے جو اپنی جماعت

---

[1] حضرۃ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں بعض مدعیانِ عمل بالحدیث نے یہ غوغا مچایا کہ حنفیہ مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہیں۔" (ہدایت المہتدی ص ۲)

[2] حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں: کہ بالخصوص قسم کھا کر کہے کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ ان کی بیبیوں سے غیر مقلدین کو بلا طلاق نکاح جائز ہے۔"۔۔۔ الخ (تنقیح التنقید ص ۳۵)

[3] ایک غیر مقلد مگر منصف مزاج عالم ایسے ہی ایک غالی اور بے باک مفتی کا حوالہ دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: "اول تحریر ایک ہمارے ہی علماء اہل حدیث کی پرچہ تنظیم میں طبع ہوئی تھی جس میں مولانا موصوف نے مدرک رکوع کے اعتداد والوں کو مخلّد فی النّار تک کا حکم صادر فرما دیا تھا۔ نتیجہ اس طرح نکالا تھا کہ مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی نماز نہیں۔ جس کی نماز نہیں وہ بے نماز ہے بے نماز کافر ہے اور وہ مخلد فی النّار ہے۔" (بلفظہٖ، اتمام الرکوع فی ادراک الرکوع ص ۱، طبع کردہ مہتمم رسالہ صحیفہ اہلحدیث صدر دہلی) مؤلف خیر الکلام نے بزعم خود چند دلائل پیش کیے ہیں پھر لکھتے ہیں: لہٰذا فاتحہ ہر نمازی پر خواہ امام ہو یا منفرد یا مقتدی فرض ہو گی۔" (ص ۵۱۲)۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس فرض کے منکر اور تارک پر فتویٰ کیا صادر ہو گا؟ آیا وہ مسلمان رہے گا یا نامسلم؟ (العیاذ باللہ) کیونکہ اصول کے لحاظ سے فرض کا منکر مسلمان نہیں رہنا چاہیے۔ دیکھیے کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے؟

کے روحِ رواں اور چوٹی کے مناظر و مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک مشہور قصبہ میں دورانِ تقریر یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہرگز نہیں ہوتی۔ آؤ ہمارے ساتھ اس مسئلہ پر مباہلہ کر لو۔"

آپ اس کتاب میں پوری تفصیل سے پڑھیں گے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے کے قائل کون کون ہیں؟ نہ معلوم مُباہلہ کس کس سے ہوگا؟ اور تاسف بالائے تاسف یہ کہ مُباہلہ بھی فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ؕ کے الفاظ کے ساتھ اور لطف یہ ہے کہ وہ صاحب نہ بیوی رکھتے ہیں اور نہ بچے۔ گویا آیت مُباہلہ میں نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَ اَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَ نِسَاءَكُمْ کا ان کے نزدیک کوئی مفہوم ہی نہیں —— اور اب کراچی سے ایک کتابچہ کو شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "فصل الخطاب فی قرأۃ فاتحۃ الکتاب" جو کتب خانہ اہلحدیث، ۱۹۱۔ نیو کلاتھ مارکیٹ، کراچی (پاکستان) کی طرف سے شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ تمام روئے زمین کے احناف کو انعامی چیلنج کیا ہے۔ اور روئے زمین کی چیدہ چیدہ ہستیوں کو نام بہ نام للکارا ہے۔ اصل الفاظ میں ان کا اعلان یہ ہے:

انعامی چیلنج: تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اہلِ حدیث امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ و ما وافق بہا) دکھاتے ہیں۔ ایسا ہی وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ و ما وافق بہا) میدانِ مناظرہ میں دکھا دیں تو ہم ان کو اس حقِ محنت، داد ہمت، تمغۂ صداقت کے صلہ میں فاتحہ کے ہر حرف کے بدلے میں مبلغ ایک سو روپے دینے کو تیار ہیں۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل حنفی جو میدانِ مناظرہ میں کُود سے اور امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا دکھا کر مبلغ پانچ سو روپیہ انعام حاصل کرے (دیدہ باید) اس انعامی چیلنج کو شائع کیے ہوئے آج تیرہ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور تقریباً یہ چیلنج بارہ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کر علماء اور جہلا کے ہاتھوں میں پہنچا چکے ہیں۔ دیوبند، ڈابھیل، ہندوستان پاکستان کے احناف کے بڑے بڑے مدارس میں بھی پہنچ چکا ہے۔ احناف کے مقتدر علماء

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۵۳ء) مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ (المتوفی ۱۲ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ) اور مولانا شبیر احمد عثمانی رح (المتوفی ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء) کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت تک کسی حنفی کو یہ جرأت نہ ہوئی اور نہ ہی آیندہ ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کہ وہ دنیا کی کسی کتاب سے ایک حدیث ہی بموجب شرائط مندرجہ در چیلنج پیش کرکے انعام حاصل کرنے کے علاوہ مذہب حنفی پر احسان کرتا۔ لیکن کرتا کہاں سے۔ جب کہ اس طرح کی ایک حدیث کسی دنیا کی اسلامی کتب میں موجود نہ ہو اور یقیناً نہ ہو۔ (انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص ۳۱ ج۲)

اس شاہی اور رفرا خدلانہ انعامی چیلنج کے بعد اسی کتابچہ کے آخری صفحہ پر یہ اعلان ان الفاظ سے دہرایا گیا ہے۔

تمام دُنیا کے عُلماءِ اَحناف کو کُھلا چیلنج

ہم تمام علماء احناف ہند، سندھ، پنجاب، بنگال، خراسان، عربستان، چین، جاپان، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، یورپ، مصر، عراق وغیرہ کو بذریعہ چیلنج واشتہار ہذا کے دعوت دیتے ہیں کہ ان مسائل مندرجہ ذیل کو کسی آیت یا حدیث صحیح مرفوع متصل سے اور وہ حدیث جس مسئلہ کے ثبوت میں پیش کریں۔ نص صریح ہو صحاح وما وافق بہا سے ثابت فرما دیں تو ہم ان کو اس حق محنت، داد ہمت، تمغہ صداقت کے صلہ میں ہر آیت اور حدیث کے بدلہ میں پچیس روپے انعام دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ کے پڑھنے سے منع کرنا۔

(پھر نو عدد مسائل اور لکھ کر اور تلك عشرة كاملة تحریر فرما کر بحث کو اس اعلان پر ختم کیا ہے)

هَلْ مِنْ مُّبَارِزٍ يُّبَارِزُنِي۔ یعنی کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل اور خوش نصیب حنفی بھائی جو میدان میں کود سے اور ہم سے سینکڑوں روپے کا انعام حاصل کرے۔ (دیدہ باید)

(انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص۸)

اور اب فصل الخطاب ص ۱ کے جدید ایڈیشن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظہ)

اِن تمام اقتباسات کو پیشِ نظر رکھ کر پڑھے لکھے آدمی کو ضرور یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے کافر اور گمراہ ہیں اور نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ بے نماز اور اقل درجہ یہ ہے کہ وہ بلا دلیل ہیں حتّٰی کہ ان کے ساتھ لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے الفاظ سے مُباہلہ کرنا بھی کارِ ثواب اور جائز ہے اور عوام پر اشتہاری رُعب ڈالنے کے لیے انعامی چیلنج بھی دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کو بھی خالی الذہن ہو کر محض اپنی قلبی تسکین اور سنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی خاطر سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں اوراق الٹنے پڑے ہیں اور صدہا رسائل اور کتابچوں کی ورق گردانی کرنا پڑی ہے تاکہ دلائل کی صحت اور سقم کا موازنہ کر کے نجاتِ اخروی کی فکر کی جائے۔ لیکن میں نے فریقِ ثانی کے جملہ دعووں کو بالکل بے حقیقت، مبالغہ آمیز اور انتہائی غلو پر مبنی پایا ہے۔ گو مسئلہ زیرِ بحث میں ائمہ دین کا اختلاف رہا ہے، مگر جو بے اصل دعاوی فریقِ ثانی کے اہلِ علم حضرات نے کیے ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں اور ان حضرات کی ان کارستانیوں پر مطلع ہونے کے بعد قرینِ انصاف تو یہ تھا کہ ہم بھی اپنی لن ترانیوں پر آجاتے اور ان کی سرابی حقیقت کو الم نشرح کرتے ہوئے کہہ دیتے ؎

محتسب خم شکست ومن سر اد
اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاص

لیکن قرآنِ کریم کی تعلیم اور حدیث نبویؐ کے صریح ارشادات اور جن اکابر سے ہمیں لگاؤ اور تعلق ہے ان سے ربط و نسبت ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس قسم کی لچر پوچ اور فتنہ انگیز باتیں کہتے پھریں۔ ہمیں تو اصلیت اور حقیقت کو بے نقاب اور آشکارا کرنا ہے اور بس۔ اور اس کتاب کی تالیف و ترتیب سے جو ناراضگی فریقِ ثانی کو پیدا ہو گی اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ؏ :

"اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"

یہ بات تو پوری تفصیل کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہو گی کہ امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ ترک کرنے والے صرف ہم احناف ہی نہیں، بلکہ جمہور صحابہ کرام رضؓ و تابعین رحؒ و اتباعِ تابعین رحؒ ہیں اور اکثر سلف و خلف کی معیت سے ہمارا دامن تحقیق وابستہ ہے۔ اور جمہور اپنے اس محقق نظریہ پر نص

قرآنی اور بے شمار حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ اور ایسے اختلافی مسائل میں (خصوصاً جن میں بعض صحابہ کرام رضؓ اور ائمہ دینؒ کا اختلاف ہو) ہمارا یہ منصفانہ عندیہ ہے کہ جو بات ظاہر قرآن کریم و حدیث اور جمہور کے عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں بلکہ اس کو اپنا دینی سرمایہ اور باعثِ صد افتخار سمجھتے ہیں اور جن مسائل میں طرفین کے پاس قرآن و حدیث کے دلائل ہوں۔ ہم اس پہلو کو جو قرآن و سنت کے قریب تر ہوتا ہے۔ اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلک کی تائید میں تطبیق اور ترجیح کے ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں اور فریق ثانی کے حق میں غلط موشگافی اور غیر محتاط لفظ زبان سے نکالنا ہرگز جائز نہیں سمجھتے اور تمام مسائل اختلافیہ اور اجتہادیہ میں ہمارا یہی نظریہ ہے جس کی مزید تحقیق آپ کو راقم الحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات التقلید میں ملے گی۔ مع ہٰذا معصوم ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

ہم حیران ہیں کہ مسئلہ زیر بحث میں تکفیر اور تضلیل کس کی ہو گی؟ اور تجہیل و تحمیق کس کی؟ بے سند اور بے دلیل ہونے کا الزام کس پر عائد ہو گا؟ اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے الفاظ سے مباہلہ کس سے ہو گا؟ کیونکہ مسئلہ کے اختلافی ہونے میں فریقِ ثانی کا بھی اتفاق ہے۔ چنانچہ حضرت امام بیہقی رحؒ (المتوفی ۴۵۶ھ) نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب (کتاب القرآۃ) لکھی ہے۔ اس میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ کے عہد سے اس وقت تک باقاعدہ اس مسئلہ میں اختلاف چلا آتا ہے۔

(کتاب القرآۃ ص ۱۴۶)

اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ المتوفی ۱۳۵۳ھ جن کی کتاب تحقیق الکلام پر فریقِ ثانی کے مسئلہ زیر بحث پر مناظرہ کا دارومدار ہے امام خطابی رحؒ[۲] المتوفی ۳۸۸ھ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

---

[۱] ولفظہ: فی مسئلۃ معروفۃ مشہورۃ بما فیہا من الاختلاف منذ عصر الصحابۃ رضؓ الی یومنا ھٰذا۔ یعنی یہ مسئلہ معروف و مشہور ہے۔ اس میں اختلاف حضرات صحابہ کرام رضؓ کے زمانہ سے تاہنوز چلا آتا ہے۔ (کتاب القرآۃ ص ۱۴۶)

[۲] یہ بحث امام خطابی رحؒ نے "معالم السنن" میں کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے صحابہ کرام رضؓ کی ایک جماعت سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے امام کے پیچھے قرآۃ کرنے کو واجب کہا ہے اور دوسرے صحابہ کرام رضؓ سے مروی ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے اور فقہاء کے تین قول ہیں:

(باقی ص پر)

"کہ اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف تھا۔ ایک گروہ وجوب قرأۃ خلف الامام کا قائل تھا تو دوسرا منکر۔ اس لیے فقہاءؒ اور ائمہؒ کا بھی اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ مطلقاً وجوب کا قائل ہے اور دوسرا مطلقاً ممانعت کا۔ تیسرا گروہ سرّی نمازوں میں قائل ہے اور جہری نمازوں میں قائل نہیں ہے۔"

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

اندریں حالات انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ فریق ثانی جس پہلو کو حق اور صحیح سمجھتا۔ شدت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا۔ لیکن تکفیر اور تفسیق وغیرہ اور تعدّی وتجاوز کے الفاظ سے گریز کرتا نہ تو مباہلہ کا چیلنج دیتا اور نہ حلفیہ طور پر دوسرے فریق کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کا خطاب دیتا اور ایسے اختلافی مسئلہ میں سنجیدگی اور متانت سے کام لیتے ہوئے تعصب، عناد غلو اور زبان درازی سے اجتناب کرتا، مگر کاش کہ اس نے ایسا نہ کیا۔

ہمارا مدعا چونکہ عامۃ المسلمین کو مسئلہ زیر بحث سے شناسا کرنا ہے۔ اس لیے ہم نے عوام کی رعایت کرتے ہوئے نہایت سہل اور حتی الوسع سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر عربی عبارات پیش نہیں کی گئیں بلکہ ان کے حوالہ درج کر دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ہاں البتہ جہاں کسی خاص مصلحت سے اصل عربی عبارت پیش کرنا ضروری معلوم ہوا ہے تو وہاں اصل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے تاکہ خواص اور عوام دونوں برابر استفادہ کر سکیں۔

ہم نے بعض مقامات پر حتی الوسع متانت اور سنجیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی چوٹیں بھی کی ہیں جن سے ان اکابر کے طرز استدلال کی خامی اور اس کا نقص واضح کرنا مقصود ہے اور جن سے بڑے بڑے اکابر کے خیالات اور نفسی میلانات کی پردہ دری ضرور ہو گی لیکن پردہ دری کے بغیر درون پردہ کا نظارہ کس نے کیا ہے؟ ورنہ حاشا وکلا ہمارے اس علمی اور تحقیقی طنز سے نہ سلف صالحین سے بدظنی ہے اور نہ تمسخر اور نہ زمانۂ حال کے حضرات کی دل آزاری۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

(بقیہ صفحہ) امام مکحولؒ، اوزاعیؒ، شافعیؒ اور ابو ثورؒ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے جہری اور سرّی سب نمازوں میں قرأۃ کرنا ضروری ہے اور امام زہریؒ، مالکؒ، عبداللہ بن المبارکؒ، احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرے لیکن جہری نمازوں میں قرأۃ نہ کرے"۔ اور امام سفیان ثوریؒ اور اصحاب الرأی یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے کوئی شخص قرأۃ نہ کرے۔ امام جہر سے قرأۃ کر رہا ہو یا آہستہ"۔ اھ

(معالم السنن جلد ۲ ص ۳۹۴ طبع مصر)

ہم نے اپنے استدلال میں جملہ پیش کردہ احادیث اور آثار کی اسانید نقل کر کے ہر روایت اور اثر کے جملہ راویوں کی کتب اسماء الرجال سے توثیق نقل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والوں کو ہر قسم کی سہولت رہے اور دشواری پیش نہ آئے۔ البتہ متابعات اور شواہد میں نیز ضمنی اور استطرادی ابحاث میں رواۃ کی توثیق کا التزام نہیں کیا گیا اور فریق ثانی کی طرف سے جملہ نقل کردہ روایات وآثار میں جو ضعف و کمزور اور مجروح و متکلم فیہ راوی ہیں۔ ان پر کتب رجال سے جرحی کلام نقل کر دیا ہے تاکہ بلند و بالا دعاوی کرنے والوں کو اپنے دلائل کا معیار بھی معلوم ہو جائے اور جن حضرات صحابہ کرام رض و تابعینؒ اور ائمہ دینؒ کی مسئلہ زیر بحث میں معیت جمہور کو حاصل ہے۔ ان کی ثقاہت اور بعض صفاتِ عالیہ کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ عوام کو بھی یہ بات بخوبی معلوم ہو جائے کہ ان اکابر کا اسلام اور مسلمانوں میں کیا رتبہ ہے؟

ہم نے بعض مقامات پر ائمہ جرح و تعدیل اور جمہور محدثین کرامؒ کے مسلمہ اور طے شدہ اصول و ضوابط کے عین مطابق ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں لیکن اگر بعض ائمہ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ کوئی بھی ایسا ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریتِ احمر کے مترادف ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کا رتبہ کس سے مخفی ہے؟ اور الصحابة کلھم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے؟ مگر خوارج اور روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

تا حدِ ممکن اسانید کو پورا پورا نقل کیا گیا ہے اور ترجمہ میں اخبرنا، اخبرنی، حدثنا، حدثنی، قال فلاں عن فلاں، رَوَی فلاں اور رُوِی عن فلاں وغیرہ اصطلاحات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے تاکہ ایک طرف نقل سند کے سلسلہ میں کسی قسم کی خیانت واقع نہ ہو۔ اور دوسری طرف سندات کو دیکھ کر صحیح و ضعیف، متصل اور منقطع وغیرہ کا فرق سمجھنے کی اہلیت رکھنے

داووں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر جتنی کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔ بعض متن میں اور بعض حاشیہ میں (تاکہ اصل عبارت کی ترتیب اور تسلسل میں گنجلک اور اضطراب پیدا نہ ہو) اور یہ حوالے اس لیے درج کیے گئے ہیں تاکہ جو کتاب بھی آسانی کے ساتھ کسی صاحب کو میسر اور دستیاب ہو سکے۔ اس کی طرف مراجعت کر کے اصل عبارت یا اس کا ترجمہ بنظرِ انصاف دیکھ لیا جائے اور اکثر تاریخی واقعات اور ضمنی ابحاث کو حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے حضرات اصل مضمون کو مرتب اور مربوط طور پر یکبارگی پڑھ لیں۔ اور مزید تفصیل اور تشریح کے لیے حاشیہ دیکھ لیں۔ بنا بریں توضیحِ بیان، دفعِ شبہ، رفعِ ابہام، توثیقِ رجال، جرحِ رواۃ اور دیگر نہایت ضروری امور کے لیے بہت سے تشریحی حواشی بڑھا دیئے گئے ہیں تاکہ خواص کے علاوہ عوام کے لیے بھی یہ کتاب چراغِ راہ کا کام دے۔

حضرات سلف صالحین کی عبارات کے پہلو بہ پہلو ہم نے فریقِ ثانی کی عبارات اور تحریرات سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی عبارتیں اپنی تائید میں نقل کی ہیں۔ مگر ان کی عبارات سے احتجاج کرنے میں سینہ زوری سے کام نہیں لیا گیا بلکہ ان سے جو منطوق اور مفہوم کے لحاظ سے ہماری سمجھ میں آیا ہے وہ لکھ دیا ہے۔ ہاں اگر کسی موقع پر مناظرانہ رنگ میں ان کی عبارت کی تشریح میں طنز اور ظرافت کے طور پر کچھ لکھا گیا ہے تو اس کا انکار نہیں، لیکن بحمداللہ تعالیٰ انصاف کا دامن حتی الوسع ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

ع: یہ اپنی حدِ نظر ہے کسی کی دید کہاں

جہاں تک انسانی اور امکانی کوشش کا تعلق ہے۔ حوالہ جات کی تصحیح کا پورا التزام کیا گیا ہے۔ معہذا اگر جلد اور صفحہ کا نمبر اور ہندسہ کسی وجہ سے بدل جائے تو غوغا آرائی کے بجائے اس کی تصحیح کر لی جائے۔ دل میں پورا احترام موجود ہے اور ارادہ بھی تھا کہ محدثینِ کرامؒ، فقہائے عظامؒ اور اربابِ جرح و تعدیل کے ناموں کے پہلے امام علامہ حافظ اور شیخ و حضرت وغیرہ کے توصیفی الفاظ لکھے جائیں، مگر ان کے ناموں کے بار بار آنے سے ہر جگہ ایسا لکھنا ایک دشوار امر ہے۔ لہٰذا اس فعل کو گستاخی پر حمل نہ کیا جائے، بلکہ ایک مجبوری امر سمجھا جائے اور جہاں ہم نے راویوں

کے ناموں میں تصحیف اور غلطی کو درست کیا ہے اور اس پر تاریخی اور ٹھوس واقعات اور شہادتیں نقل کی ہیں۔ ان کو بنظرِ انصاف دیکھا جائے اور جلد بازی سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔ اور اگر کسی مقام پر طرزِ استدلال میں کوئی خامی یا کمزوری نظر آئے تو قصور اور لغزش کو مجھ سے منسوب کریں نہ کہ جمہور سلف و خلف سے۔ کیونکہ ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس کے علاوہ کہیں کہیں میرے اپنے استنباطات اور اجتہادات بھی ہوں گے۔ ان میں غلطی کا واقع ہونا بہت اغلب ہے۔ اور ان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ع :

"چراغِ راہ ہیں منزل نہیں ہیں"

مسئلہ زیرِ بحث کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے کسی گوشہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا میرے لیے اپنی تہی مائیگی اور بے بضاعتی کے باعث چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلہ پر ایسے حضرات خامہ فرسائی کرتے جو خود بھی کچھ ہوتے۔ یہاں اپنا حال یہ ہے کہ اس پر کچھ لکھنا ہی اس بڑے اہم اور مُبارک کام کی توہین ہے لیکن جب میں نے اس مسئلہ کے جمع و ترتیب اور تحقیق و تمحیص کے لیے قدم اٹھایا تو صورتِ حال کا یہ نقشہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی اور طاقت ہے جو بے اختیار یہ کام لے رہی ہے ؎

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ضروری التماس : حتی الوسع میں نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو مکمل اور واضح کرنے میں انتہائی کوشش کی ہے لیکن باوجود اس کے یہ دعوٰی ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آخری کتاب ہے۔ یا باوجود اتنی محنت اور کاوش اٹھانے کے یہ کتاب غلطیوں سے بالکل مبرّا ہے کیونکہ اوّل تو انسان کا کوئی کام لغزش اور خطا سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خطا اور نسیان انسان کا خمیر ہے۔ اور پھر کام بھی اس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر و خطا ہو۔ اس کی نسبت بالکل صحت کا دعوٰی کس طرح ہو سکتا ہے؟ لہٰذا التماس ہے کہ

مجھ کو ہدفِ ملامت بنانے کے بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو غلط بات کی تلافی کرنے اور حق کے تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
الغرض کتاب کی معنوی صورت ہو یا صوری، بہر حال نگاہ مقصود پر رکھیے اور میری کوتاہیوں پر مجھے مطلع کیجیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ قلب میں اپنی محبت، ارادہ میں قوت، جسم میں صحت اور عمر میں درازی عطا فرمائے اور کتاب و سنت کی پیروی اور حضرات سلف صالحین کی اتباع اور اطاعت کا صحیح جذبہ مرحمت فرمائے اور ہر نیک عمل میں اخلاص و احسان کی توفیق دے۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو کتاب کا ہر عیب حسن ہے اور اگر یہ نہ ہو تو تمام خوبیاں بے معنی ہیں اور اس فقیر بے زاد اور ماہیِ بے آب اور تہی دستِ علم و عمل کی خدائے برتر و بزرگ سے نہایت اخلاص سے یہ دعا ہے کہ جب تک دنیا میں زندہ رکھنا ہے تو اپنی رضا اور خوشنودی کی توفیق دے۔ اور جب دنیا سے اٹھانا منظور ہو تو خاتمہ بالخیر ہو۔ ؎

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ط

ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر
خطیب جامع گکھڑ، ضلع گوجرانوالہ

۲۰ رجب ۱۳۷۴ھ
۱۵ مارچ ۱۹۵۵ء

مقدمہ

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین وعلی الہ واصحابہ المھدیین وعلی جمیع امتہ والائمۃ المقربین الذین بلغوا کلام رب العلمین واحادیث رحمۃ للعلمین الی الناس کافۃ لیدخلوا بھا جنات الخلد والبساتین

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصول موضوعہ کے طور پر محل نزاع کو اور اس کے اہم اجزائے بحث کو متعین کر لیا جائے۔ تاکہ مسئلہ زیر بحث کی تہ تک پہنچنے میں دقت پیش نہ آئے۔ سو ہماری تحقیق یہ ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے نہ جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اور نہ سری نمازوں میں۔ مقتدی کا وظیفہ تمام نمازوں میں یہ ہے کہ پوری دلجمعی اور نہایت خاموشی کے ساتھ امام کی قرآۃ کی طرف توجہ کرے، سنے یا نہ سنے، ہمارے اس دعوٰی پر نص قرآنی موجود ہے جس کا معنٰی اجماع اور اتفاق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرآۃ سے منع کیا گیا ہے۔ اور صحیح وصریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں بھی اس پر موجود ہیں اور حضرات خلفائے راشدین رضؓ اور ان کے علاوہ جمہور صحابہ کرام رضؓ وتابعین رحؒ واتباع تابعین رحؒ اور محدثین رحؒ وفقہاء رحؒ کی اکثریت بھی ہمارے ساتھ ہے۔ خصوصاً جہری نمازوں میں۔ ان میں ہر ایک امر کی پوری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات صحابۂ کرام رضہ

وہ حضرات صحابۂ کرام رضہ جو امام کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأۃ کے قائل نہ تھے :

حضرات خلفائے راشدین رضہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضہ، حضرت زید بن ثابت رضہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ، حضرت ابو الدرداء رضہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضہ وغیرہ۔

اور وہ حضرات جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ ان میں :

حضرت عائشہ رضہ اور حضرت ابوہریرہ رضہ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غرضیکہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رضہ میں شایع نہ تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحہ لکھتے ہیں کہ

زیرا کہ خواندن فاتحہ با امام در صحابہ رضہ شایع نبود۔ (مصفّٰی جلد ۱ ص ۱۳۱ طبع رحیمیہ دہلی)

چنانچہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رضہ میں شایع نہ تھا۔

حضرات تابعین رحہ

جو تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ ان میں سے حضرت سوید رحہ بن غفلہ رضہ، سعید بن جبیر رحہ، سعید بن المسیب رحہ، محمد بن سیرین رحہ، اسود بن یزید رحہ، علقمہ بن قیس رحہ اور حضرت ابراہیم نخعی رحہ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

اور جو اکابر جہری نمازوں میں قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت عروۃ بن زبیر رضہ، قاسم بن محمد رضہ، امام زہری رحہ، نافع رحہ بن جبیر رضہ، حسن بصری رحہ، مجاہد بن جبر رحہ، محمد بن کعب القرظی رحہ، ابو العالیہ ریاحی رحہ اور امام شعبی رحہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرات اتباعِ تابعین رحہ

جو حضرات مطلقاً امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت سفیان بن عُیینہ رحہ، سُفیان ثوری رحہ اور امام اوزاعی رحہ وغیرہ مشہور و معروف ہیں۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ امام لیث بن سعد رحہ اور عبداللہ بن وہب رحہ مشہور ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور قرأت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ اور امام بخاری رحہ کے استاد الاستاد حضرت عبداللہ بن مبارک رحہ

جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار اتباع تابعین ہیں، جن کا احصار اور احاطہ اگر محال نہیں تو آسانی کے ساتھ ممکن بھی نہیں ہے۔ ان تمام اکابر کے اقوال و مسالک پورے حوالہ جات کے ساتھ اور ایک ایک سند مع توثیق رواۃ اور دفع شبہات و تصحیح کے ساتھ اپنے موقع پر پوری بسط کے ساتھ بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات ائمہ اربعہ رح

چونکہ ائمہ اربعہؒ کے پیروکار ہر دور میں اکثریت کے ساتھ رہے ہیں اور آج بھی اکثریت مقلدین حضرات ائمہ اربعہ رح کی ہے۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ان حضرات کا مسلک بھی عرض کر دیں۔ اور ان کے بعد ان جلیل القدر ہستیوں کا نظریہ بھی تحریر کر دیں جن کے بارے میں فریق ثانی کو خاص طور پر غلط فہمی ہوئی ہے اور ان ائمہ کرام رح میں سے علی الخصوص حضرت امام ابو حنیفہ رح کا ذکر پہلے مناسب ہے، جو علم، عمر، تقوی ورع اور شرفِ تابعیت کے حاصل کرنے میں دوسرے جملہ ائمہؒ سے خاص درجہ اور فضیلت کے مالک تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رح (المتوفی ۱۵۰ھ)

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مطلقاً قائل نہ تھے۔ نہ جہری نمازوں میں اور نہ سرّی میں۔ چنانچہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارکپوری رح تحریر فرماتے ہیں کہ امام محمد رح موطا میں لکھتے ہیں:

"کہ امام کے پیچھے قرأۃ نہ کرنی چاہیے خواہ امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو یا آہستہ، اسی پر عام آثار دلالت کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رح کا مسلک اور مذہب بھی یہی ہے۔"[1]

---

[1] تحفۃ الاحوذی جلد ا ص: ۲۵۸ - یہ عبارت موطا امام محمدؒ ص ۹۴ - جامع المسانید جلد ا ص ۳۲۶ - فتح القدیر جلد ۲، ص ۲۴۱ - اور روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ وغیرہ میں بھی نقل کی گئی ہے۔

[2] امام موصوف سے متعلق بھی نہ جاننے والوں اور متعصب لوگوں نے کیا کیا الزام نہیں لگائے؟ کسی نے ان کو ضعیف کہا اور کسی نے یتیم فی الحدیث کے خطاب سے نوازا۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ علامہ ذہبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) ان کے بارے میں لکھتے ہیں: کہ وہ الامام الاعظمؒ،

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) فقیہ العراق، امام متورع، عالم، عامل، متقی اور کبیر الشان تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۵۸) ۔ حافظ ابن عبد البر رح (المتوفی ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام وکیع رح نے ان سے بہت سی حدیثیں سُنی ہیں۔ (کتاب الانتقاء ۲ صـ۱۵۰) اور لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے امام موصوف سے روایتیں کیں اور ان کی توثیق و تعریف کی۔ وہ ان سے بہت زیادہ ہیں جنھوں نے (بلاوجہ) ان میں کلام کیا ہے۔ (مختصر کتاب العلم صـ۱۹۴) امام ابن معین رح (المتوفی ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام موصوف ثقہ تھے۔ وہ صرف اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو ان کو اچھی طرح یاد ہوتی تھی۔ امام عبداللہ بن المبارک رح فرماتے ہیں کہ ہم نے فقہ میں امام ابو حنیفہ رح جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام الجرح والتعدیل یحیی بن سعید القطان رح المتوفی ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں ہم خدائے قدوس کی تکذیب نہیں کرتے، ہم نے امام موصوف سے بہتر رائے اور بات کسی کی نہیں سنی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۴۴۹) ۔ امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ رح کے عیال اور خوشہ چیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۳۴۶ و تہذیب جلد ۱۰ ص ۴۴۹) ۔ علامہ تاج الدین سبکی رح (المتوفی ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کی فقہ بڑی مشکل اور دقیق ہے (طبقات کبری جلد ۲ ص ۱۷۴) ۔ شاید اسی وجہ سے جاہل اور سطحی قسم کے لوگ ان کی فقہ سے نفرت کرتے ہیں۔ علامہ خطیب بغدادی رح المتوفی ۴۶۳ھ) باوجود امام موصوف پر انتہائی جرح نقل کرنے کے ان کی ذاتی خوبیوں اور علمی قابلیتوں کا انکار نہیں کرسکے اور صاف لکھتے ہیں کہ علم عقائد اور کلام میں لوگ ابو حنیفہ رح کے عیال اور خوشہ چیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۱۶۱) ۔ مشہور محدث اسرائیل (المتوفی ۱۶۲ھ) کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ رح کیا ہی خوب مرد تھے جنھوں نے ہر ایسی حدیث کو اچھی طرح سے یاد کیا جس سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے۔ اور وہ بڑی احتیاط کرنے والے اور فقہی مسائل پر عبور کرنے والے تھے (بغدادی جلد ۱۳ ص ۳۳۹) امام ابن معین رح فرماتے تھے کہ علماء تو صرف چار ہیں۔ سفیان ثوری رح، ابو حنیفہ رح، مالک رح اور اوزاعی رح (البدایہ والنہایہ، جلد ۱۰ ص ۱۱۶) حافظ ابن کثیر رح (المتوفی ۷۷۴ھ) ۔ امام موصوف کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام، فقیہ العراق، احد ائمۃ الاسلام والسادۃ الاعلام، احد ارکان العلماء، احد الائمۃ الاربعہ اصحاب المذاہب المتبوعۃ، امام عبداللہ بن داؤد الخریبی رح (المتوفی ۲۱۳ھ) کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ امام ابو حنیفہ رح کے لیے نمازوں میں دعا کیا کریں کیونکہ انھوں نے فقہ اور سنت کو محفوظ رکھا جو لوگوں تک پہنچی۔ امام سفیان ثوری رح اور عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں

فائدہ : اس عبارت سے امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) کا مسلک بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ

(بقیہ حاشیہ) سب روئے زمین پر بسنے والوں سے بڑھ کر فقہ جاننے والے امام ابو حنیفہؒ تھے۔ امام مکی بن ابراہیم رح فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رح اعلم اہل الارض تھے۔ (البدایہ والنہایۃ جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۷) علامہ ابن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں کہ امام موصوف علم حدیث کے بڑے مجتہدین میں سے تھے۔ (مقدمہ ص ۴۴۵) اور لکھتے ہیں کہ فقہ میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ کوئی دوسرا ان کی نظیر نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے تمام ہم عصر علماء نے ان کی اس فضیلت کا اقرار کیا ہے۔ خاص طور پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے۔ (مقدمہ صفحہ ۴۴۸) علامہ محمد طاہر رح (المتوفی ۹۸۶ھ) لکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک امام موصوف کی مقبولیت کا کوئی خاص راز اور بھید نہ ہوتا۔ تو امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کا ایک نصف حصہ کبھی ان کی تقلید پر مجتمع نہ ہوتا (تکملہ مجمع البحار جلد ۳ ص ۵۴۷) مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رح، امام شعبہؒ اور سفیان ثوری رح سب ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تحقیق الکلام صفحہ ۱۴۰) نیز تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث (کی قیود اور شرائط) کے بارے میں جتنی تشدید پابندی اور احتیاط امام ابو حنیفہ رح نے کی ہے اور کسی نے اس کا ثبوت نہیں دیا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ صفحہ ۱۵۱) ہم نے اپنی کتاب مقام ابی حنیفہ رح میں امام صاحبؒ کے امام حدیث و فقہ ہونے پر باحوالہ سیر حاصل بحث کی ہے اور عناد و تعصب کی وجہ سے جن لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے ہیں ان کے ٹھوس جوابات بھی ہم نے اسی کتاب میں عرض کر دیے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) رقم طراز ہیں،

امام اعظم ابو حنیفہ رح کوفی وی چنانکہ در علم دین منصب امامت دارد۔ ہم چناں در زہد و عبادت امام سالکان است۔ (تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار صفحہ ۹۳)۔

حضرات اگر امام موصوف میں کوئی خوبی نہ ہوتی۔ تو امت کی اکثریت کے علاوہ امام یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام وکیعؒ بن الجراح رح امام ابن معین یحییٰ بن زکریاؒ وغیرہ ایسے امام حدیث کبھی ان کی تقلید نہ کرتے۔ (دیکھیے طائفہ منصورہ) شاید نواب صاحبؒ نے بھی امام اعظم کا خطاب متعصب لوگوں کے توحش کو کم کرنے کے لیے اختیار فرمایا ہے اور علامہ ذہبیؒ بھی ان کی تعریف الامام الاعظم سے شروع کرتے ہیں۔ ع "وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ"

۱؎ بعض قاصر اور غیر بالغ نظروں نے امام محمدؒ کی شخصیت کو بھی پہچانا نہیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بھی کسی نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ اور یہی مضمون ان کی کتاب الآثار صلا میں بھی منقول ہے جن لوگوں نے امام محمدؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ سری نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو مستحسن سمجھتے تھے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رح (المتوفی ۸۶۱ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ امام محمد رح کا یہ مذہب نقل کرتے ہیں کہ وہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کو جائز اور مستحسن سمجھتے ہیں وہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) والد نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے، پندرہ ہزار میں نے نحو، شعر اور ادب کی تعلیم پر صرف کیے اور پندرہ ہزار حدیث اور فقہ کی تعلیم پر (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۳) امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کی اتنی راہیں نہ کھلتیں جتنی اب کھلی ہیں۔ اور میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۲۳) امام ابو عبیدؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا (بغدادی جلد ۲ صفحہ ۱۷۵) امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس سے کوئی مشکل مسئلہ پوچھا جائے اور اس کے تیوروں پر بل نہ پڑے ہوں۔ البتہ ہاں محمدؒ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۴۵۴) امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے امام مالکؒ اور امام محمدؒ...... دونوں کی رفاقت کی ہے۔ ان دونوں میں بڑا فقیہ کون ہے؟ فرمایا امام محمدؒ باعتبار نفس کے امام مالکؒ سے بڑے فقیہ ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۱ صفحہ ۳۲۲) اس سے ملتے جلتے الفاظ یحییٰ بن صالح رح سے بھی منقول ہیں (بغدادی جلد ۲ صفحہ ۱۷۵) امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) باوجود متعصب ہونے کے امام محمدؒ کو ثقات اور حفاظِ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بیس عدد ثقات اور حفاظِ حدیث نے بیان کی ہے جن میں امام محمدؒ بن الحسن الشیبانیؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، عبداللہ بن المبارکؒ، عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، اور ابن وہبؒ وغیرہ شامل ہیں (بحوالہ نصب الرایہ جلد ۱ صفحہ ۴۰۹) امام دارقطنیؒ ان کو ثقات اور حفاظ میں پہلے نمبر پر بیان کرتے ہیں۔

میری انتہائے نگارش یہی ہے　　تیرے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں دیکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۲) امام ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ بن الحسنؒ فقیہ اور عالم تھے۔ انھوں نے امام مالکؒ سے بہت حدیثیں لکھی ہیں اور اسی طرح ثوریؒ وغیرہ سے بھی۔ (الانتقاء صفحہ ۱۷۴)

لہ صاحب درمختار نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کی طرف یہ نسبت کہ وہ امام کے پیچھے (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کا قول حضرت امام ابوحنیفہ رح اور امام ابویوسف رح کی طرح ممانعت کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۲۰) امام ابویوسفؒ (المتوفی ۱۸۳ھ) کا مسلک بھی اس سے واشگاف اور آشکارا ہو گیا ہے کہ وہ بھی جملہ نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قرأۃ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ضعیف ہے اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں تصریح کی ہے کہ ہم جہری اور سری .... کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہیں ہیں۔

ودعوی الاحتیاط ممنوعۃ بل الاحتیاط ترك القرأۃ لأنه العمل باقوی الدلیلین اھ۔ (رد المحتار جلد ۱ ص ۳۶۶)

اور یہ دعوےٰ کہ امام کے پیچھے قرأۃ کرنے میں احتیاط ہے تو یہ دعوٰی ممنوع ہے بلکہ احتیاط ترک قرأۃ میں ہے کیونکہ یہاں دو دلیلوں میں سے قوی تر دلیل پر عمل ہو رہا ہے۔

لہ امام ابویوسفؒ کے بارے میں فریق ثانی بعض محدثین کا تَرَکُوْهُ کا جملہ لیے لیے پھرتا ہے۔ حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ امام نسائی رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۵۷)۔ امام بیہقی رح کہتے ہیں: وہ ثقہ تھے (سنن الکبری جلد ۱ ص ۳۴۷) حافظ عبدالقادر القرشی الحنفی رح (المتوفی ۷۷۵ھ) فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ اور امام ابن معینؒ اور امام علی بن المدینی رح فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (الجواھر المضیۃ جلد ۲ ص ۲۲۱) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رح اور امام احمد بن حنبلؒ اور علی بن مدینیؒ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام ابویوسفؒ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۴ ص ۲۴۳) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام العلامہ اور فقیہ العراقیین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶۹) امام مزنی رح کا بیان ہے کہ فقہاء اور اصحاب الرائے میں وہ سب سے زیادہ حدیث کی اتباع کرنے والے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۸۰) امام ابن قتیبہؒ (المتوفی ۲۷۶ھ)۔ ان کو صاحب سنت اور حافظ لکھتے ہیں۔ (معارف ابن قتیبہؒ ص ۱۷۱) امام ابن معینؒ ان کو صاحب حدیث اور صاحب سنت کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷) اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب رائے میں وہ سب سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے اور اثبت فی الحدیث تھے۔ (ایضًا) علامہ ابن خلکانؒ (المتوفی ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام ابویوسفؒ حافظ اور کثیر الحدیث تھے (ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۰۳) علامہ عبدالقادرؒ (المتوفی ۶۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ مشرق سے مغرب تک قضاۃ کی تقرری ان کے سپرد تھی (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۲۲) امام ابن جریرؒ ابن جوزیؒ اور ابن حبانؒ ان کو عالم حافظ اور فقیہ کہتے ہیں (مقدمہ زیلعی ص ۴۱) اور امام یحییٰؒ بن معینؒ سے امام ابویوسفؒ کے

حضرت امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) بھی امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے حق میں[1] نہ تھے ۔ اور سری نمازوں میں گو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی مقتدی کو اجازت دیتے ہیں ۔ لیکن مع ہٰذا وجوب کے قائل نہ تھے ۔ چنانچہ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ[2] سری نمازوں میں وجوب قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے ۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

(بقیہ حاشیہ) بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ثقہ صدوق (مناقب کردری جلد ۱ صفحہ ۲۲۰ و مناقب موفق ج۲ صفحہ ۱۹۷) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جب طلبِ حدیث کا شوق حاصل ہوا تو سب سے پہلے میں قاضی ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا (بغدادی جلد ۱۴ صفحہ ۲۵۵) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ اور متقن تھے ۔ (لسان المیزان جلد ۶ صفحہ ۳۰۱) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ حسن الحدیث ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۱ صفحہ ۳۷۷) امام ابن عبد البرؒ امام طبریؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ فقیہ عالم اور حافظ تھے پچاس اور ساٹھ تک حدیثیں وہ ایک مجلس میں یاد کر لیا کرتے تھے اور وہ کثیر الحدیث تھے ۔

(الانتقاء ص ۱۷۲)

[1] امام مالکؒ کا یہ مذہب و مسلک ان کی مشہور کتاب موطا صفحہ ۲۹ اور تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۰۱ و معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۲۴ و روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۱۳۵ و فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۲۷ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صفحہ ۲۵۵ وغیرہ میں منقول ہے ۔

[2] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، فقیہ الامت، شیخ الاسلام اور امام دار ہجرت تھے ۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۹۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں ۔ اگر امام مالکؒ اور ابن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا امام ابن وہبؒ فرماتے ہیں اگر امام مالکؒ اور امام لیثؒ نہ ہوتے تو ہم گمراہ ہو جاتے ۔ (تذکرہ ۱ ص ۱۹۴)

امام احمد بن الخلیلؒ فرماتے ہیں ۔ میں نے امام اسحاقؒ بن ابراہیم کو کہتے سنا ۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالکؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کسی مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو وہی مسئلہ حق اور سنت ہو گا ۔ اگرچہ اس میں نص موجود نہ بھی ہو ۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۹۵)

راقم السطور کہتا ہے کہ امام ثوریؒ اور اوزاعیؒ سب نمازوں میں اور امام مالکؒ جہری نمازوں میں ہمارے ساتھ ہیں اور سری نمازوں میں بھی وجوب کے قائل نہیں ہیں ۔ لہٰذا اس مسئلہ میں یہی مسئلہ حق اور سنت ہے اور نص قرآنی اور احادیث صحیحہ کے صحیح حوالے اس کی مستزاد ہیں جو سونے پر سہاگہ ہے ۔

حضرت امام شافعیؒ[1] (المتوفی ۲۰۴ھ) امام موصوف کا مسئلہ زیرِ بحث میں صحیح مسلک کیا تھا؟ اس کے سمجھنے اور نقل کرنے میں بڑے بڑے ائمہ فن نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور اس کو ایک معمہ اور عقدہ لاینحل بنا دیا ہے۔ کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف سب نمازوں میں قرأۃ الفاتحہ خلف الامام کے وجوبؒ[2] کے قائل تھے۔ اور کسی نے کہہ دیا کہ ان کا قدیم قول یہ ہے کہ جہری

(بقیہ حاشیہ) امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، امام مالکؒ پر کسی کو ترجیح نہ دیتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۸)

علامہ ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ ثقہ، مامون، ثبت، متورع، فقیہ، عالم اور حجت تھے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۸)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ الاربعۃ، اصحاب المذاہب المتبعۃ تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص۱۷۴)

امام ابن عبدالبرؒ نے کتاب الانتقاء میں کم و بیش ۴۶ صفحات میں ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان صاحبؒ فرماتے ہیں۔ امام دار ہجرت و امامے از ائمہ مذاہب (تقصار ص۹۲)

[1] علامہ ذہبی ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام العلم۔ حبر الامت اور ناصر السنۃ (تذکرہ جلد ۱ ص۳۲۹) امام اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں۔ مجھ سے امام احمدؒ نے فرمایا۔ آؤ تمہیں ایسا شخص بتاؤں جس کا نظیر اور مثیل تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر مجھے امام موصوف کے پاس لے گئے۔ (بغدادی جلد ۲ ص۶۹) امام ابوثورؒ فرماتے ہیں میں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود انھوں نے بھی اپنا نظیر نہیں دیکھا ہوگا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۳۲۹)۔ امام ابن عبدالحکم کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ ہر بات میں حجت ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۳۰)

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ احد العلماء، ثقہ اور مامون تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۳۱) حافظ ابن کثیرؒ نے ان کی ایسے شاندار الفاظ اور عبارات سے تعریف کی اور عقیدت کے پھول برسائے ہیں جن کے واقعی امام موصوف اہل اور مستحق ہیں۔ (دیکھیے البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص۲۵۱) علامہ ابن عبدالبرؒ نے ابن عبدالحکمؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ صاحب سنت واثر اہل فضل و فصاحت اور مضبوط عقل کے مالک تھے۔

(الانتقاء ص۷۳)

نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں۔ امام شافعیؒ ہم افضل وقت وہم اعلم عہد وہم حجۃ الائمہ وہم مقدم الامۃ۔ (تقصار ص۹۳)

[2] یہ قول علامہ بدرالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۳ ص۶۴ میں اور اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی نقل کیا ہے۔

نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کی جائے۔ اور قول جدید یہ ہے کہ جہری ہوں یا سری، تمام نمازوں میں قرأۃ واجب[1] ہے۔ اور کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف کے دو قول ہیں۔ ایک جہری نمازوں میں ممانعت کا اور دوسرا اجازت[2] کا۔ لیکن حقیقت ان تمام باتوں کے بالکل برعکس ہے۔

امام موفق الدین[3] ابن قدامہ الحنبلیؒ (المتوفی ۶۲۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وجملة ذٰلك ان القرأة غير واجبة على المأموم فيما جهر به الامام ولا فيما اسر به نص عليه احمدؒ في رواية الجماعة وبذلك قال الزهريؒ والثوريؒ وابن عيينهؒ ومالكؒ وابو حنيفةؒ واسحٰقؒ

اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت واجب نہیں نہ جہری نمازوں میں اور نہ سری میں امام احمدؒ بن حنبلؒ نے صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے جیسا کہ علماء کی ایک جماعت نے ان سے نقل کیا ہے اور امام زہریؒ، ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور

---

[1] یہ قول امام بیہقیؒ نے (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۴) میں اور دوسرے اکابر نے بھی نقل کیا ہے جن میں حافظ ابن کثیرؒ بھی ہیں۔ (تفسیر جلد ۴ ص ۲۸۳)

[2] یہ قول امام مزنیؒ (المتوفی ۲۶۴ھ) نے مختصر مزنی جلد ۱ ص ۶ میں امام بیہقیؒ نے (کتاب القرأۃ ص ۱۷) میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے (تنوع العبادات ص ۳۹) میں نقل کیا ہے۔

[3] آپ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر تھے اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تلامذہ میں تھے۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور طبقات رواۃ کے متبحر اور بے مثل عالم تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے۔ عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ الدمشقی جو الفقیہ، الزاہد، الامام، شیخ الاسلام اور احد الاعلام تھے۔ علامہ ابن نجارؒ کا بیان ہے کہ وہ امام الحنابلہ، ثقہ، حجت، نبیل، غزیر الفضل، کامل العقل اور شدید التثبت تھے۔ امام ابو شامہؒ کہتے ہیں کہ وہ شیخ الحنابلہ، امام من ائمۃ المسلمین، علم من اعلام الدین فی العلم والعمل تھے۔ محدث ضیاءؒ لکھتے ہیں کہ وہ علوم قرآن و حدیث، فقہ و علم خلاف کے امام اور یکتائے روزگار تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کے بعد ملک شام میں ان سے بڑا کوئی امام داخل نہیں ہوا۔ علامہ ذہبیؒ نے ان کے اوصاف حمیدہ پر دو مستقل جلدیں لکھی ہیں۔ (ترجمۃ الشیخ فی بدء المغنی ص ۲، ۳، ۴) علامہ عزالدین بن عبدالسلامؒ (المتوفی ۶۶۰ھ) فرماتے ہیں۔ میں نے اسلام میں دو کتابوں کی مثال نہیں دیکھی۔ ایک محلّٰی (علامہ ابن حزمؒ (المتوفی ۴۵۶ھ)

وقال الشافعیؒ وداؤدؒ لعموم قولہ علیہ السلام لا صلوٰۃ لمن لا یقرأ بفاتحۃ الکتاب غیرانہ خص فی حال الجھر بالامر بالانصات ففیما عداہ یبقی علی العموم۔ (انتہی بلفظہ) (مغنی ابن قدامہ جلد اول صفحہ)

اسحاقؒ اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ اور داؤدؒ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوگی۔ عام ہے مگر جہری نمازیں اس حدیث سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہری نمازوں کے علاوہ یہ حدیث اپنے عموم پر باقی رہے گی۔

اس عبارت سے یہ امر بالکل عیاں ہوجاتا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نص قرآنی اور حدیث صحیح اَنْصِتُوا کے خلاف ہے۔

فائدہ۔ اس عبارت سے جس طرح امام شافعیؒ کا مسلک واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے اسی طرح امام داؤد ظاہری کا مسلک بھی نمایاں ہوجاتا ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قراۃ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحۃ الکتاب کا پڑھنا انصات مامور بہ کے منافی ہے۔ ممکن ہے کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ ہوسکتا ہے امام ابن قدامہؒ ہی کو امام شافعیؒ کے مسلک کے سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی واقع ہوئی ہو۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود امام شافعی کی تحریروں سے اس مسئلہ کو حل

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اور دوسری مغنی ابن قدامہ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۳۲۵ و لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۲۰۱) حافظ تقی الدین علی بن عبد الکافیؒ (المتوفی ۷۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ مغنی ابن قدامہ فقہ حنبلی کی بلند پایہ اور معتمد کتاب ہے (شفاء السقام ص ۴۹) اور حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام تھے۔ جہمیہ اور معطلہ کے بغیر باقی تمام فرقے ان کی مقبولیت، تعظیم اور امامت پر متفق ہیں (اجتماع الجیوش الاسلامیۃ ص ۶۹ طبع امرتسر)

لے امام داؤدؒ بن علیؒ (المتوفی ۲۷۰ھ) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اصحاب ظاہر کے امام، متورع، عابد اور زاہد تھے (بغدادی جلد ۸ ص ۳۶۹)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الحافظ، الفقیہ، المجتہد اور فقیہ اہل الظاہر۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۱۳۶)

کریں۔ امام موصوف تحریر فرماتے ہیں:

والعمد فی ترک القرأۃ بام القرآن والخطأ سواء ان لا تجزیٔ رکعۃ الا بہا او بشیٔ معہا الا ما یذکر من المأموم انشاء اللہ تعالیٰ۔

(کتاب الام جلد ۱ ص۹۹)

سورۂ فاتحہ کا دیدہ دانستہ ترک کرنا اور بھول کر ترک کرنا دونوں کا حکم ایک ہے کہ کوئی رکعت سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کے بغیر جائز نہیں ہو سکتی۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم آگے ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

امام موصوف کی اس عبارت کو بار بار پڑھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کو کیوں مستثنیٰ قرار دیتے ہیں؟ اگر مقتدی کے لیے بھی سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ امام اور منفرد کے لیے تو ان کی اس تفریق کا کیا مطلب ہے؟ پھر آگے تحریر فرماتے ہیں:

فواجب علی من صلّی منفردا او اماما ان یقرأ بام القرآن فی کل رکعۃ لا یجزئہ غیرہا واحب ان یقرأ معہا شیئا آیۃ او اکثر وسأذکر المأموم انشاء اللہ تعالیٰ۔

(کتاب الام جلد ۱ ص۹۳)

سو منفرد اور امام پر واجب ہے کہ وہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھیں اس کے علاوہ کوئی اور سورۃ کفایت نہیں کر سکتی اور میں اس کو بھی زیادہ پسند کرتا ہوں کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھیں ایک آیت ہو یا اس سے زیادہ۔ اور ہاں مقتدی کا حکم آگے بیان کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس عبارت میں بھی امام موصوف، امام اور منفرد کی تصریح کرتے ہوئے ان کا یہ فریضہ اور وظیفہ بتلاتے ہیں کہ ان کو نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے۔ مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ مقتدی کا وظیفہ اور ڈیوٹی کچھ اور ہی ہے۔ جس پر ہر نماز اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ میں انشاء اللہ العزیز خود اس کا حکم بیان کروں گا۔ وہ کونسا حکم ہے جس کا دو مرتبہ وعدہ کیا ہے؟ تحریر فرماتے ہیں۔

ونحن نقول کل صلوٰۃ صلّیت خلف الامام والامام یقرأ قرأۃ لا

اور ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اور امام ایسی قرأۃ کرتا ہو جو سنی نہ جاتی ہو

یسمع فیھا قرآۃ فیھا۔	تو مقتدی ایسی نماز میں قرآۃ کرلے۔

(کتاب الام جلد ۷، ص ۱۵۳)

امام شافعیؒ کی یہ عبارت اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ مقتدی کو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا درست نہیں ہے اور نہ واجب ہے۔ بلکہ مقتدی صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھ سکتا ہے جن میں امام کی قرآۃ نہ سنی جاسکتی ہو اور وہ سری نماز ہے۔ اسی لیے انھوں نے قرآۃ لا یسمع ارشاد فرماکر جہری اور سری نمازوں میں مقتدی کا وظیفہ متعین کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کا دعوٰی کرے کہ حضرت امام شافعیؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ خوش فہمی اور غلطی کا شکار ہے بلکہ اس کو تعدیل مزاج کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

فائدہ: راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی تعیین میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اور قول قدیم وجدید کا جو جھگڑا چل نکلا ہے۔ اس کی اصل وجہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ امام الحرمینؒ[1] (المتوفی ۴۷۸ھ) وغیرہ نے غلطی سے کتاب الام کو امام شافعیؒ کی کتب قدیمہ میں شامل سمجھ لیا ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے بھی اس امام عالی مقام کی جلالتِ شان کی وجہ سے اس بات پر بھروسہ اور اعتماد کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے اور یہ سارا جھگڑا ہی اس مفروض پر مبنی ہے۔ ہم اختصار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی اس تاریخی غلطی پر دو تاریخی شہادتیں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

ثم انتقل منھا الی مصر فاقام بھا الی ان مات فی ھٰذہ السنۃ (سنہ ۲۰۴ھ) وصنف کتاب الام وھو من کتبہ الجدیدۃ لانھا من روایۃ الربیع بن سلیمانؒ وھو مصری	پھر حضرت امام شافعیؒ بغداد سے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور وہیں اقامت پذیر ہوئے حتیٰ کہ سنہ ۲۰۴ھ میں اسی جگہ ان کی وفات ہوئی اور مصر میں ہی انھوں نے کتاب الام تصنیف کی ہے اور وہ ان کی جدید کتابوں میں ہے۔

---

[1] ان کا نام عبدالملک، ابوالمعالی کنیت، اور الجوینی (ان کے والد ابو محمد عبداللہ الجوینیؒ کی طرف) نسبت ہے۔ یہ امام غزالیؒ (المتوفی ۵۰۵ھ) کے استاد تھے۔ حدیث، فقہ اور اصول اور دیگر علوم اور فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ میں علماء شوافع کے سربراہ تھے۔ حرم مکہ اور حرم مدینہ میں ایک عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اس لیے امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۴۳۷-۴۳۹ و فوائد البہیہ ص ۲۴۶ طبع مصر)

وقد زعم امام الحرمین وغیرہٗ انھا من القدیم وھذا بعید وعجیب من مثلہ ۔ (البدایہ والنہایۃ جلد ۱۰ ص۲۵۲)

کیونکہ اس کے راوی ربیع بن سلیمانؒ (المتوفی ۲۷۰ھ) ہیں جو مصری تھے اور امام الحرمینؒ وغیرہ نے یہ خیال کیا ہے کہ کتاب الام کتب قدیمہ میں ہے ۔ لیکن یہ امام الحرمینؒ ایسے امام سے بڑی ہی بعید اور نرالی بات ہے ۔

حافظ موصوف کی یہ عبارت بڑی واضح اور صاف ہے کہ امام الحرمینؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ کتاب یعنی کتاب الام، امام شافعیؒ کی قدیم کتابوں میں شامل ہے نہ صرف تاریخی لحاظ سے باطل اور مردود ہے بلکہ اس کے مدعی صواب سے بڑے دور اور بڑی عجیب بات کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بنابراس مفروض کے اجازت کا قول امام شافعیؒ کا قول جدید قرار دیا ہے لیکن چونکہ البدایہ والنہایہ تفسیر کے بعد کی تصنیف ہے جیساکہ خود انہوں نے البدایہ میں اس کی تصریح کی ہے ۔ اس لیے ان کی اس جدید تاریخی تحقیق کے بعد تفسیر کا حوالہ قابل التفات نہیں ہے ۔

دوسری شہادت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۹۱۱ھ) کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

ثم خرج الی مصر وصنف بھا کتبہ الجدیدۃ کالام الخ (حسن المحاضرہ جلد ۱ ص۱۲۲)

پھر حضرت امام شافعیؒ مصر کی طرف روانہ ہوئے ۔ اور وہاں کتب جدیدہ تصنیف کیں جن میں کتاب الام بھی ہے

اِن تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوگیا کہ کتاب الام حضرت امام شافعی رح کی کتب جدیدۃ میں ہے ۔ اور امام کے پیچھے مقتدی کا سورۂ فاتحہ کو جہری نمازوں میں ترک کرنا ان کا قول جدید ہے نہ کہ قول قدیم ۔

مصنف خیر الکلام نے ان ٹھوس حوالہ جات سے اپنے جواب کے سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے :

(۱) کہ امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے ۔ ہوسکتا ہے کہ آپ نے مصر جاکر پہلے یہی فتویٰ دیا ہو مگر بعد میں اس سے رجوع کیا ہو جیساکہ ہم نے انور شاہ صاحبؒ عبارت میں نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال قبل مقتدی کو جہری نمازمیں قرأۃ کے روکنے سے رجوع کیا ہے بس محض اس عبارت کا مصری کتاب میں ہونا آخری قول ہونے کی کیسے دلیل بن سکتا ہے بلکہ اس جگہ تصریح کی ضرورت ہے ۔ اھ (خیر الکلام ص۲۴)

(۲) مختصر مزنی امام شافعیؒ کے ان مسائل کا مجموعہ ہے جو مصر میں بیان فرمائے اور اختیار کیے ہیں ۔

(ضحی الاسلام جلد ۲ صـ۹۱) بلکہ مزنی رحؒ امام شافعی رحؒ کے مصری شاگردوں سے ہے۔ (ضحی الاسلام جلد ۲ صـ۲۲۲)

(خیر الکلام صـ۲۰)

(۳) امام بیہقی رحؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحؒ کا صحیح قول یہی ہے کہ قرأت واجب ہے امام جہر کرے یا نہ کرے۔ (خیر الکلام صـ۲۱)

(۴) امام ترمذی رحؒ نے لکھا ہے کہ اگر فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز کسی کام کی نہیں رہتی اکیلا ہو یا امام کے پیچھے ہو امام شافعی رحؒ اور امام اسحاق رحؒ اور ان کے علاوہ اور علماء کا یہی مسلک ہے۔ (خیر الکلام صـ۲۲)

(۵) امام ابن عبد البر رحؒ فرماتے ہیں کہ فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے مندرجہ ذیل ائمہ قائل ہیں امام اوزاعی رحؒ، امام لیث رحؒ بن سعد رحؒ امام شافعی رحؒ جب مصر میں گئے اور یہی ان کے اکثر شاگردوں کا مذہب ہے۔ ان سے امام مزنی رحؒ اور امام بویطی رحؒ ہیں امام ابو ثور رحؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(تمہید ابن عبد البرؒ۔ تحقیق) خیر الکلام صـ۲۳

(۶) کتاب الام کی پہلی اور دوسری عبارت میں تصریح نہیں کہ مقتدی پر جہری نمازوں میں فاتحہ واجب نہیں منفرد اور امام کے متعلق دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ان پر صرف فاتحہ واجب ہو۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور ما زاد دونوں واجب ہوں مگر مقتدی کے بارے میں دو احتمال نہیں صرف ایک ہی احتمال ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ۲۴، ۲۵)

(۷) کتاب الام کی تیسری عبارت میں فاتحہ کا ذکر نہیں مطلق قرأۃ کا ذکر ہے۔ (محصلہ خیر الکلام صـ۲۶)

(۸) البدایہ والنہایہ تفسیر سے پہلے کی کتاب ہے۔ کیونکہ تفسیر میں دو جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

(محصلہ خیر الکلام صـ۲۶، ۲۷)

(۹) حافظ ابن کثیر رحؒ لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں بھی پڑھے اسی طرح امام لیث رحؒ، امام اوزاعی رحؒ، امام ابن عونؒ امام مکحولؒ اور امام ابو ثورؒ سے بھی مروی ہے۔

(جلد ۱ صـ۱۶) (خیر الکلام صـ۲۷)

(۱۰) معالم التنزیل میں ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک قرأۃ واجب ہے خواہ امام قرأۃ بلند آواز سے پڑھ رہا ہو یا آہستہ یہ قول حضرت عمر رضؓ حضرت عثمان رضؓ حضرت علی رضؓ حضرت ابن عباس رضؓ اور معاذ رضؓ سے مروی ہے۔ امام اوزاعی رحؒ اور امام شافعی رحؒ کا بھی یہی قول ہے۔ (خیر الکلام صـ۲۷، ۲۸)

(۱۱) علامہ ابن قدامہ رحؒ ایک جگہ یہ نقل فرماتے ہیں کہ امام کے لیے فاتحہ کے بعد سکتہ کرنا مستحب ہے تاکہ اس

میں آرام کرے اور مقتدی فاتحہ پڑھ لے تاکہ مقتدی کی طرف سے امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے منازعت واقع نہ ہو۔ امام اوزاعی رح، امام شافعی رح، امام اسحٰق کا یہی مذہب ہے۔ (خیر الکلام صہ ۲۸)

الجواب : ہم بفضلہٖ تعالیٰ خیر الکلام کے ترتیب وار جوابات عرض کرتے ہیں غور فرمائیں۔

(۱) ٹھوس تاریخی حوالوں اور شہادتوں کو رد کرنے کے لیے صرف ہو سکتا ہے۔۔۔۔ الخ

کوئی جواب نہیں۔ مصنف خیر الکلام پر اخلاقی طور پر لازم تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ دو تاریخی اور ٹھوس حوالوں کے ساتھ یہ نقل فرماتے کہ فلاں کتاب حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام کے بعد لکھی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ یا قرآۃ کا پڑھنا واجب ہے اور عبارت یہ ہے۔ جب وہ ایسا نہیں کر سکے تو یقین کامل رکھیں کہ کتاب الام کی صریح عبارتوں کا جواب تاہنوز کوئی نہیں ہوا۔ رہا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کا حوالہ تو وہ مؤلف خیر الکلام کو چنداں مفید نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے جہری نمازوں میں ترکِ قرآۃ سے رجوع کیا ہے۔ اس سے وجوب کیسے ثابت ہوا؟ چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ پھر مجھے علم نہیں کہ امام شافعی رح نے جہری میں وجوب پسند کیا جیسے کہ شافعیہؒ کا مسلک ہے یا صرف استحباب کو۔ (فیض الباری جلد ۲ صہ ۲۷۱) اور فصل الخطاب میں فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں امام شافعیؒ بھی جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے ہیں فرض نہیں سمجھتے۔ (خیر الکلام صہ ۲۰) باقی رہا فیض الباری جلد ا صہ ۳۵۳ کا حوالہ جس میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی پر قرآۃ کے وجوب کے قائل ہو گئے تھے۔ (محصلہ) تو ظن غالب یہ ہے کہ یہ مترجم صاحب کی غلطی ہے جنھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی املائی تقریر کو اپنی صوابدید کے مطابق عربی کا جامہ پہنایا ہے ورنہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ جلد اول میں وجوب کا حکم بیان فرمائیں اور جلد ثانی میں فرمائیں کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ آیا وہ وجوب کے قائل تھے یا استحباب کے؟ اور فصل الخطاب میں یہ فیصلہ صادر فرمائیں کہ امام شافعیؒ جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے تھے فرض نہیں سمجھتے تھے۔ غور فرمائیے کہ تحقیقی طور پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور خود مولانا سیّد انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں؛

ونقل ابن تیمیہؒ الاجماع عند یدل علیٰ ان وجوب القرأة فی الجھریة خلاف الاجماع اولم یذہب الیہ احد من اھل الاسلام ۔ اھ

کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے اجماع نقل کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہری نمازوں میں وجوب قرأۃ خلاف اجماع ہے یا اہلِ اسلام میں سے اس کا ایک شخص بھی قائل نہیں ہے۔

(فیض الباری جلد ۲ ص ۲۷۲)

پھر کیونکر سمجھ لیا جائے کہ ان کے نزدیک امام شافعیؒ جہری نمازوں میں وجوب قرأۃ کے قائل ہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعی امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے وجوب قرأۃ کے قائل ہو گئے تھے تب بھی ایک بات نہایت ہی قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ تقریباً پچاس سال تک جو نمازیں حضرت امام شافعیؒ نے پڑھی ہیں جن میں وہ جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے کیا ان کی وہ نمازیں درست اور صحیح ہیں یا نہیں ؟ اور کیا صرف دوسرے حضرات کی نمازیں ہی جن میں قرأۃ فاتحہ نہ کی گئی ہو باطل کالعدم اور بیکار ہیں یا حضرت امام شافعیؒ کی ان نمازوں کا بھی یہی حشر ہے ؟ اگر کسی اور کی تحقیق بھی دیانتاً یہی ہو جو وفات سے دو سال قبل تک حضرت امام شافعیؒ کی تھی تو فرمائیے کہ اس کی نماز کیوں کالعدم، بیکار اور باطل ہو گی ؟ یا یہ چورن اور امرت دھارا صرف حنفیوں کے لیے ریزرو اور وقف ہے۔ کیا خوب ؟ :

ابھی کیا ہے ابھی تو ابتدا ہے دیکھتے جاؤ
ہمارے حال پر یاروں کے احسان اور بھی ہونگے

(۲) چونکہ باقرار صاحبِ خیر الکلام حضرت امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے تھے اس لیے اگر مختصر مزنی ان کے مصری مسائل کا مجموعہ بھی ہو اور مزنیؒ ان کے مصری شاگرد بھی ہوں تب بھی اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ یہ مجموعہ کتاب الام سے بھی بعد کا ہے ؟ ہو سکتا ہے کہ یہ پہلے کا ہو اور کتاب الام ان کی صحیح طور سے کتبِ جدیدہ میں ہو اور امام مزنیؒ نے باوجود مصری ہونے کے مختصر مزنی کی تدوین کتاب الام سے پہلے کی ہو۔ یہ جواب صحیح ہونے کے علاوہ مصنف خیر الکلام کی اپنی پسند کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ اصحاب شافعیؒ اور بڑے پائے کے محدث اور فقیہ تھے۔

لیکن ربیع بن سلیمان المرادی رح (المتوفی ۲۷۰ھ) کو ان دونوں پر ترجیح ہے۔ چنانچہ امام خلیلی رح فرماتے ہیں کہ

ثقۃ متفق علیہ والمزنی مع جلالتہ استعان علی ما فاتہ عن الشافعی بکتاب الربیع وقال مسلمۃ من کبار اصحاب الشافعی رح۔ (اھ)

(تہذیب التہذیب جلد ۳، ص ۲۴۶)

ربیع بن سلیمان ثقہ اور متفق علیہ ہیں اور امام مزنی رحمتہ باوجود جلالت شان کے جو مسائل امام شافعی رح کے ان سے چھوٹ گئے تھے ان میں ربیع کی کتاب سے استعانت کی ہے اور مسلمہ فرماتے ہیں کہ ربیع امام شافعی رح کے بڑے اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام مزنی کو حضرت امام شافعی رح کے تمام مسائل معلوم نہ تھے بلکہ ان سے کچھ چھوٹ بھی گئے تھے اور امام شافعی رح کے مسائل میں وہ ربیع بن سلیمان رح کے خوشہ چیں تھے۔ پھر کیوں نہ ہو کہ حضرت امام شافعی رح کے مسائل میں امام ربیع بن سلیمان رح پر اعتماد کیا جاتے جن پر خود امام مزنی رح نے اعتماد کیا ہے۔ اور مولیٰ احمد بن مصطفیٰ المعروف بطاش کبریٰ زادہ رح (المتوفی ۹۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ

الربیع بن سلیمان — الثقۃ الثبت فیما یرویہ حتی رجحوا روایتہ عند تعارض المزنی مع علو قدر المزنی علماً ودیناً وجلالۃ۔ اھ

(مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ جلد ۲ ص ۱۶۲ طبع حیدرآباد دکن)

ربیع بن سلیمان رح — جو کچھ بھی روایت کرتے ہیں اس میں وہ ثقہ اور ثبت ہیں حتی کہ محدثین رح نے ان کی روایت کو مزنی کی روایت پر جب کہ دونوں کی روایت کا تعارض ہو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ امام مزنی علم اور دین اور جلالت میں بلند مرتبہ تھے۔

اس سے بھی ثابت ہوا کہ جب امام ربیع اور امام مزنی رح کی روایت میں تعارض ہو تو محدثین کرام کے نزدیک امام ربیع بن سلیمان رح کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور امام ابوالحسین رح فرماتے ہیں کہ

البویطی کان یقول الربیع اثبت فی

امام بویطی فرماتے تھے کہ امام شافعی رح سے روایت

کرنے میں ربیعؒ مجھ سے بھی زیادہ اثبت ہیں۔

الشافعی رح منی اھ (تہذیب التہذیب
جلد ۳ ص ۲۴۶)

قطع نظر کتاب الام اور مختصر مزنی اور مختصر بویطی کے تقدم و تاخر کے خود امام بویطیؒ اور محدثینؒ
کے فیصلے کی رو سے امام ربیع بن سلیمانؒ کی روایت کو تاریخی اور صریح حوالوں کے پیش نظر
ترجیح ہے۔ اس لیے اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کتاب الام پہلے کی ہے اور مختصر مزنیؒ
اور مختصر بویطیؒ بعد کی ہیں تب بھی ترجیح امام ربیعؒ بن سلیمان ہی کی روایت کو ہو گی جو کتاب الامؒ
کے اور امام شافعیؒ کے مسائل کے راوی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بقول حافظ ابن تیمیہؒ حذاق
اصحاب الشافعیؒ مثلاً امام رازیؒ اور ابن عبد السلامؒ وغیرہ نے اسی پر عمل کیا ہے کہ جہری نمازوں
میں قرأۃ خلف الامام درست نہیں۔ (عبارت آگے آ رہی ہے)

(۳ و ۴ و ۵) کا جواب یہ ہے کہ یہ سب حوالے اس امر پر مبنی ہیں کہ مختصر مزنی اور مختصر بویطیؒ
(جو امام یوسف بن یحییٰ البویطی (المتوفی ۲۳۱ھ) کی تالیف ہے) کے حوالوں کو غلطی سے ربیع بن
سلیمانؒ کی روایت پر ترجیح دی گئی ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں حضرت امام شافعیؒ کو وجوب
قرأۃ خلف الامام کا قائل گردانا گیا ہے اور مصنف خیر الکلام نے تحقیق الکلام کے حوالہ سے
بحوالہ تمہید ابن عبد البرؒ امام شافعیؒ سے وجوب کا جو قول نقل کیا ہے اس میں خصوصیت سے
یہ درج ہے کہ امام شافعی رح کے اکثر شاگردوں کا یہی مذہب ہے جن میں امام مزنی رح اور
بویطیؒ بھی ہیں۔ بس یہیں سے اس غلطی کی بنیاد قائم ہوتی ہے کہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ
کے آئینہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مذہب اور مسلک متعین کرنے کی شدید غلطی کی گئی ہے۔
اور اسی پیچ در پیچ غلطیاں مرتب ہوتی ہیں؛ ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جا است

(۶) حضرت امام شافعیؒ تو صاف طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کا جان بوجھ
کر ترک کرنا یا خطاءً ترک کرنا دونوں اس حکم میں برابر ہیں کہ کوئی رکعت سورہ فاتحہ یا سورہ فاتحہ
اور کچھ دیگر حصۂ قرآن کے بغیر جائز نہیں۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم الگ ہے جو آگے بیان ہو گا اور
دوسری عبارت میں تصریح کرتے ہیں کہ امام و منفرد دونوں پر ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ

واجب ہے اس کے بغیر کوئی اور سورت جائز نہیں اور اس سے زیادہ ایک آیت یا اکثر پڑھیں تو مجھے پسند ہے۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم کچھ اور ہے اور میں خود اس کو بیان کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ان عبارتوں میں تو وہ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ امام اور منفرد دونوں پر واجب ہے۔ اور اس سے مازاد واجب نہیں بلکہ بہتر ہے جب سورۂ فاتحہ اور مازاد کا الگ الگ حکم بیان فرما رہے ہیں کہ ایک واجب ہے اور دوسرا مستحب (واجبۃ) تو پھر یہ احتمال حضرت امام شافعیؒ کی عبارت میں کہاں سے پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور مازاد دونوں واجب ہوں۔ اھ۔ (خیر الکلام: ص ۲۵) اسی کو کہتے ہیں توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ۔ اور پھر مصنف خیر الکلام کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کتاب الام سے حضرت امام شافعیؒ کا وہ حوالہ جس کا دو دفعہ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے نکال کر بقید حروف بتاتے کہ یہ لو امام شافعیؒ کی معہود عبارت یہ ہے جس میں ہماری خانہ ساز توجیہ کی تصدیق ہو رہی ہے۔ مصنف خیر الکلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ خوامخواہ کچھ لکھ دینے سے جواب نہیں ہو جایا کرتا۔ حضرت امام شافعیؒ کی یہ دونوں عبارتیں سورۂ فاتحہ اور ہر رکعت اور امام و منفرد کے واضح الفاظ کے ساتھ بالکل صریح ہیں اور مقتدی اور ماموم کی استثنار اور وعدہ بھی ان میں صاف طور پر موجود ہے جس کا ایک ایک حرف پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ صاحب خیر الکلام کی تاویل بالکل سینہ زوری پر محمول ہے اور قطعاً باطل اور مردود ہے۔ علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

(۷) بلاشک کتاب الام کی تیسری عبارت میں مطلق قرأۃ کا ذکر ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ نے جن پہلی دو عبارتوں میں وعدہ فرمایا ہے۔ ان میں اُم القرآن کی تصریح موجود ہے اور ونحن نقول سے اسی وعدہ کو انھوں نے پورا کیا ہے۔ مصنف خیر الکلام اور ان کی جماعت کا اخلاقی فرض ہے کہ اگر یہ عبارت ان کے دو مرتبہ وعدہ کے ایفا کے لیے نہیں تو بتلائیں کہ کتاب الام میں وہ کونسی عبارت ہے جس کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا ہے؟ (دیدہ باید)

(۸) البدایہ والنہایہ اور تفسیر ابن کثیرؒ کی ان عبارات سے قدر مشترک یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو کلیتہً البدایہ تفسیر ابن کثیر سے مقدم ہے اور نہ مکمل طور پر تفسیر اس سے پہلے کی ہے۔ کچھ

اجزاء اس کے پہلے لکھے گئے اور کچھ حصص اس کے پہلے تصنیف ہوئے اور مناسب مواقع پر ایک کے حوالے دوسری کتاب میں ذکر کر دیے گئے لیکن بایں ہمہ اس سے کتاب الام کے صریح حوالوں اور امام ربیع بن سلیمانؒ کی راجح روایت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے کہ کتاب الام ٹھوس تاریخی شہادتوں کی بنا پر امام موصوفؒ کی کتب جدیدہ میں سے ہے اور امام ربیعؒ کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔

(۹، ۱۰) کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری تحقیق اس بات پر مبنی ہے کہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے اور ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ اصل غلطی کا سبب ہی یہ غلط نظریہ ہے۔ سچ ہے کہ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

(۱۱) کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شافعیؒ جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأۃ کے قائل نہ تھے بلکہ امام کے سورۃ فاتحہ ختم کر چکنے کے بعد سکتہ میں سورۃ فاتحہ کے قائل تھے کیونکہ بحالت جہر امام مقتدی کی قرأۃ خلافِ اجماع اور شاذ ہے۔ یہ عبارت تو مؤلف خیر الکلام کے مدعٰی کے مطابق نہیں۔ وہ تو جہر میں بھی قرأۃ فرض قرار دیتے ہیں۔ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وقال فی الجدید یقراء الفاتحۃ فقط فی سکتات الامام۔ امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھے لیکن سکتات امام میں۔

(تفسیر جلد ۲، ص ۲۸۰)

اس سے معلوم ہوا کہ بحالت جہر امام شافعیؒ بھی مقتدی کے لیے قرأۃ کے قائل نہ تھے اور ہم نے اسی کتاب میں باحوالہ مبسوط بحث کر دی ہے کہ سکتات امام کا (جن میں مقتدی قرأۃ کر سکیں) شریعت سے کوئی ثبوت نہیں جس کا کوئی معقول جواب مؤلف مذکور نے نہیں دیا۔ الغرض امام شافعی رح کی کتاب الام کی احسن الکلام میں پیش کردہ عبارات اپنے مدلول پر بالکل نص صریح ہیں اور تاویلات باردہ کو بالکل قریب نہیں آنے دیتیں۔ یوں تعصب وعناد اور انکار وجحود کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے جب تک نگاہ تعصب نہ بدلے گی نظریات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہو سکتی: ؎

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی !
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں !

امام احمدؒ بن حنبلؒ[1]: (المتوفی ۲۴۱ھ) کا مسلک یہ ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کے قائل[2] نہ تھے۔ بلکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کو شاذ اور خلاف اجماع فرماتے[3] تھے۔ اور سری نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ (تحفۃ الاحوذی، جلد ۱ ص ۲۵۷)

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں "شیخ الاسلام سید المسلمین، الحافظ اور الحجۃ" (تذکرہ جلد ۲ صـ۱۷) محدث ابراہیم حربیؒ کہا کرتے تھے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اولین اور آخرین کے علوم جمع کر دیے ہیں" (ایضاً) امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے "میں نے بغداد میں امام احمدؒ سے بڑا فقیہ و عالم اور افضل کوئی نہیں دیکھا۔" (بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۹، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸، البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۳۳۵) اور نیز فرماتے ہیں کہ "جب میں بغداد سے نکلا تو میں نے امام احمدؒ سے بڑا فقیہ، زاہد اور متورع اور عالم کوئی وہاں نہیں چھوڑا" (تہذیب التہذیب ص ۷۳) علامہ خطیب ان کی تعریف یوں کرتے ہیں "امام المحدثین، الناصر للدین، المناضل (یعنی مدافعت کرنیوالے) عن السنۃ اور الصابر فی المحنۃ" (بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۲) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "امام احمدؒ امام سنت و مقتدائے ملت است" (تقصار ص ۹۴)

[2] امام احمدؒ کا یہ مسلک مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۶، تنوع العبادات ص ۸۶، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵۔ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں مذکور ہے۔

[3] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۹ و تنوع العبادات ص ۸۷) میں اس کی تصریح ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف وجوبها فی حال الجهر فانه شاذ حتی نقل احمد الاجماع علیٰ خلافه۔ (فتاویٰ: ۲ ص ۱۴۹)

یعنی سورۂ فاتحہ کا جہری نمازوں میں امام کے پیچھے بطور وجوب پڑھنا شاذ ہے۔ حتیٰ کہ امام احمدؒ نے اس کے خلاف اجماع اور اتفاق نقل کیا ہے۔

(نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ائمہ اربعہؒ کے مسلک کی تشریح کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی کہ ہم دوسرے ائمہ، محدثین اور فقہاء کے حوالے پیش کریں۔ بھلا حضرات ائمہ اربعہؒ کے اقوال کی موجودگی میں اور کس کے قول کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں اکثریت ان ائمہ کی ہے جو حضرات ائمہ اربعہؒ میں سے کسی نہ کسی امام کے مقلد اور ان کی علمی تحقیق کے خوشہ چیں تھے۔ مگر چونکہ فریقِ ثانی کی طرف سے بعض ائمہ کے مسالک نقل کرنے میں غلطی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم بعض ائمہ کے اقوال عرض کرتے ہیں۔

ان میں وہ ائمہ کرام بھی شامل ہیں جو خود مستقل طور پر امام تھے اور انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ عرصہ دراز تک ان کی تقلید ہوتی رہی ہے۔

امام ابراہیم النخعیؒ: (المتوفی ۹۶ھ) کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأۃ سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ (مغنی ابن قدامہ: ۱ ص ۶۰۶، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱) ان کی پوری عبارت مع تشریح کے باب سوم میں ذکر کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(نوٹ پچھلا صفحہ) مصنف خیر الکلام (دیکھو ص ۱۳۱) کا یہ کہنا کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ سکتات میں پڑھے (محصلہ) قطعاً باطل اور مردود ہے کیونکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سکتات کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ ان کے حوالہ سے آگے اپنے مقام پر بحث آئیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر ان کی مرضی کے خلاف ان کی عبارت کا مطلب لینا کہاں کا انصاف ہے؟ اور شیخ منصور علی ناصفؒ لکھتے ہیں:

فلا فاتحۃ علی الماموم وعلیہ الجمہور و مالک وابوحنیفۃ واحمد (غایۃ المامول جلد ۱ ص ۱۸۳، شرح التاج الجامع للاصول)	مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے یہی جمہور اہل اسلام اور امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مسلک اور مذہب ہے۔

لہ امام نوویؒ (المتوفی ۶۷۶ھ) لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق۔ جلالتِ شان اور فقہی کمال پر سب کا اتفاق ہے۔ امام شعبیؒ نے انکی وفات کے وقت کہا کہ ابراہیمؒ نے اپنے بعد اپنے سے بڑا عالم اور فقیہ کوئی نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے کہا کیا حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بھی نہیں؟ تو شعبیؒ نے کہا کہ نہ صرف حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بلکہ اہل بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام میں کوئی بھی نہیں۔ (تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ ص ۱۰۴) علم حدیث میں ان کے اس قدر وسیع معلومات تھے کہ مشہور محدث اعمش رح کا بیان ہے کہ میں نے جب کبھی ابراہیم رح کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام زہری[ا]: (المتوفی ۱۲۴ھ) جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراۃ سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ (کتاب القراۃ ص ۵۷، مغنی ابن قدامہ جلد ا ص ۶۰۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱)

(بقیہ پچھلا صفحہ) سامنے کوئی حدیث پیش کی تو انھوں نے اس میں میرے معلومات اور بڑھائے۔ بڑے بڑے فقہا فقہی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ سعیدؒ بن جبیرؒ کے پاس جب کوئی فتویٰ پوچھنے کے لیے آتا تو اس سے کہتے، ابراہیمؒ کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو؟

ابو وائلؒ کے پاس جب کوئی مستفتی آتا تو اس کو ابراہیمؒ کے پاس بھیج دیتے۔ اور اس سے کہہ دیتے، جب وہ جواب دیں مجھے بتانا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۱۸۹) وہ اتنے محتاط تھے کہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے مفسر بن بیٹھتا ہے۔ مجھے زیادہ پسند ہے کہ علم کے متعلق ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالوں جس زمانہ میں میں فقیہ ہوا وہ بہت ہی انحطاط کا زمانہ ہے۔ (طبقات الکبریٰ شعرانی جلد ا ص ۳۶) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ العراق اور صاحب اخلاص بلند پایہ علماء میں تھے اور احادیث کے پرکھنے میں وہ صراف اور نقاد تھے۔ اور گمنامی کی زندگی کو بہت پسند کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ا ص ۶۹)

[ا] امام زہریؒ، امام ابن مدینیؒ کا بیان ہے کہ حجاز میں ثقات کا سارا علم زہریؒ اور عمرو بن دینارؒ کے درمیان تقسیم تھا۔ (تذکرہ جلد ا ص ۹۹) عمرؒ بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اب زہریؒ سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں رہا (ایضاً) عمرو بن دینارؒ جو خود بھی بہت بڑے محدث تھے فرماتے تھے کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ حدیث میں کسی کو ناقد نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۸) فقہ میں وہ بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ مدینہ کے ساتوں مشہور فقہا کا علم ان کے سینہ میں محفوظ تھا۔ (ابن خلکان جلد ا ص ۴۵۱) اسی فقہی کمال کی وجہ سے وہ مدینے کی مجلس افتاء کے مسند نشین تھے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ محمدؒ بن نوحؒ نے فقہی ترتیب سے ان کو تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا تھا۔ (اعلام الموقعین جلد ا ص ۲۶) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر حافظ حدیث، عالم اور احادیث کی جمع و ترتیب کرنے والا اور کوئی نہ تھا (کتاب القراۃ ص ۵۷) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد الاعلام من ائمۃ الاسلام اور تابعی جلیل واعلم الناس لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۴۴) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ ہمارے نزدیک حدیث تفسیر اور رجال کی توثیق کرنے کے امام ہیں۔ (الرسالہ للامام الشافعیؒ ص ۶۴) اور حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ (بقیہ اگلے صفحہ پہ)

اور اسی طرح امام سفیانؒ ثوریؒ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۶۱ھ)۔

امام لیثؒ بن سعدؒ (المتوفی ۱۷۵ھ) امام عبداللہؒ بن المبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ)

(بقیہ پچھلا صفحہ) اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵)

۱۔ سفیان ثوریؒ، علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، شیخ الاسلام، سید الحفاظ اور الفقیہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۰) امام شعبہؒ و ابن معینؒ اور ایک بہت بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ سفیانؒ فن حدیث میں امیر المؤمنین تھے۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے گیارہ سو شیوخ سے احادیث کی سماعت کی ہے جن میں سفیان ثوریؒ سے افضل کوئی بھی نہ تھا۔ ان کی تعریف و توصیف کے لیے یہ الفاظ کیا کم ہیں؟ شعبہؒ فرماتے ہیں۔ سفیانؒ مجھ سے بڑے حافظ ہیں۔ ورقاءؒ فرماتے ہیں: سفیانؒ نے اپنا نظیر خود بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ امام احمدؒ فرماتے تھے میرے نزدیک سفیانؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اس سرزمین پر کوئی ایسا نہیں رہا جس پر تمام امت متفق ہو۔ ہاں مگر وہ صرف سفیان ثوری ہی ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱)

امام قطانؒ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ سے سب چیزوں میں بڑھ کر ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ مسلمین کے بہت بڑے امام اور اعلام دین کے بہت بڑے علم تھے۔ سب کا ان کی امامت پر اتفاق ہے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۵۲، تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۴) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد ائمۃ الاسلام اور عابد متقی اور بے شمار تابعینؒ سے روایتیں کرنے والے تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۳۴)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام سفیانؒ ثوری از اصحاب مذاہب متبوعہ بود محدث جلیل و عارف نبیل علم را باسلوک یکجا داشت۔ (تقصار ص ۲۷)

۲۔ امام لیثؒ بن سعدؒ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام احمدؒ ان کو کثیر العلم اور صحیح الحدیث کہتے تھے۔ ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۴۶۱) ابن وہبؒ کا بیان ہے کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم نے لیثؒ سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۳۸) امام نوویؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ کی مہارت فقہ پر علما کا اجماع ہے۔ اس کمال تفقہ کے باعث اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے مفتی بھی تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ حصہ ۲) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ وہ الامام، الحافظ اور دیار مصر کے علماء کے شیخ اور رئیس تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۰۸) یحییٰ بن بکیرؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ سے زیادہ کامل اور فقیہ البدن

(باقی اگلے صفحہ پر نمبر ۳ بھی)

امام اوزاعیؒ[1] رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۵۷ھ)

(بقیہ او رنمبر ۲ پچھلے صفحہ) میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ سعید بن ایوبؒ کہتے ہیں اگر امام مالکؒ اور لیثؒ کسی موقع پر مجتمع ہوتے تو مالک کو ان کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۶) امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ امام مالکؒ سے زیادہ احادیث اور آثار کا اتباع کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲) حافظ ابن کثیرؒ ان کو امام فی الفقہ والحدیث والعربیۃ سے یاد کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۶۶) امام احمد فرماتے ہیں کہ لیث کثیر العلم اور صحیح الحدیث تھے۔ اور نیز فرمایا کہ اہل مصر میں ان سے زیادہ اصح الحدیث اور کوئی نہ تھا (بغدادی جلد ۱۳ ص ۱۲)

[3] امام عبداللہ بن المبارکؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام العلامۃ الحافظ، شیخ الاسلام، فخر المجاہدین اور قدوۃ الزاہدین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۳) امام ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہ ہوئے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۸۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو متقن حجت اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۸۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ، فقہ، عربیت، زہد، شجاعت اور شعر کے مسلم امام تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۷۷)۔ علامہ خطیبؒ فرماتے ہیں کہ وہ علم میں حق پرستوں کے گروہ میں تھے۔ اور حفظ و زہد کے ساتھ متصف تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۵۲) مولانا مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۲۰)

[1] امام اوزاعیؒ: علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام اور حافظ تھے۔ اور وہ اس قابل تھے کہ ان کو وقت کا خلیفہ بنایا جاتا۔ امام ابو اسحاق فزاریؒ کا بیان ہے کہ اگر تمام امت کا خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار مجھے دیا جائے تو میں امام اوزاعیؒ کا انتخاب کروں گا۔ اہل شام اور اندلس میں ایک عرصہ تک ان کی تقلید ہوتی رہی۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۸) امام ابو زرعہؒ فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ سے فقہ اور دین کی بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ اسی علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اہل شام کے مفتی اعظم تھے۔ امام ابن مہدیؒ کا بیان ہے۔ حدیث کے مرکزی امام صرف چار ہیں۔ امام اوزاعیؒ (۲) امام مالکؒ (۳) امام ثوریؒ (۴) امام حماد بن زیدؒ۔ نیز ان کا بیان ہے کہ اہل شام میں ان سے بڑا کوئی سنت کا عالم نہ تھا۔ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۳۹) حافظ ابن کثیرؒ ان کو الامام الجلیل علامۃ الوقت اور فقیہ اہل الشام لکھتے ہیں۔ امام عبیداللہ بن عبدالکریمؒ فرماتے ہیں: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۳۸ھ) اور امام سفیان بن عیینہ رح (المتوفی ۱۹۸ھ) وغیرہ جہری نمازوں میں مطلقاً اور سرّی میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اختصاراً اپنے اس دعوے کی دلیل بھی عرض کر دیں چنانچہ امام موفق الدین ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں نے امام اوزاعیؒ سے بڑا عقلمند، پرہیزگار، عالم، فصیح، باوقار، حلیم اور خاموش طبع کوئی اور نہیں دیکھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۱۵) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام الشام فی وقتہ اور احد ائمۃ الدنیا تھے۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۸۰)

لے امام اسحاق بن راہویہ: علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حافظ کبیر عالم نیشاپور بلکہ جملہ اہل مشرق کے شیخ تھے۔ محدث ابو زرعہ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی حافظ دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کے اتقان اور اصابت رائے پر آفرین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑا حافظہ عطا فرمایا تھا۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹)

امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ یقیناً ان کے علم اور فقہ کا اقرار کرتے۔ امام احمدؒ ان کو امام من ائمۃ المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۳۵۰) ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانے میں فقہ، علم اور حفظ میں یکتا تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۷) سعید بن ذویبؒ کا بیان ہے کہ وہ عدیم النظیر تھے۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۳۵۰)

لے امام سفیان بن عیینہؒ: امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت جلالت شان اور عظمت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہؒ سے بڑا کوئی عالم سنن نہیں دیکھا۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۲۴) ابن حماد حنبلیؒ انہیں شیخ الحجاز اور احد الاعلام لکھتے ہیں: ابن ناصر الدین کہتے ہیں: سفیان بن عیینہؒ امام عالی مقام اور حرم محترم کے محدث تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۵۴)۔ ابن وہب کہتے تھے۔ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآن مجید کا عالم نہیں دیکھا۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۸۵)

علامہ ذہبیؒ ان کو العلامہ، الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، حجت، وسیع العلم اور بلند قدر تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا کہ فتویٰ دینے میں احتیاط کرتا ہو اور حدیث کی تفسیر میں بھی ان سے بہتر کوئی نہیں دیکھا۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴۲)

وجملة ذلك ان القرأة غير واجبة على العموم فيما جهر به الامام ولا فيما اسرّ به نص عليه احمد فی روایة الجماعة و بذلك قال الزهریؒ والثوریؒ وابن عیینةؒ ومالكؒ وابوحنیفةؒ واسحاقؒ بن راهویهؒ۔ (مغنی جلد ۱ ص۶۰۲)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا نہ جہری نمازوں میں واجب ہے، نہ سرّی میں، ایک بڑی جماعت نے امام احمدؒ سے اس کی تصریح نقل کی ہے اور یہی امام زہریؒ، سفیان ثوریؒ، سفیانؒ بن عیینہؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور اسحاقؒ بن راہویہؒ کا مسلک اور مذہب ہے۔

امام شمس الدینؒ ابن قدامہ الحنبلیؒ:

(المتوفی ۶۸۲ھ) جن کا نام عبدالرحمٰنؒ بن ابی عمر محمدؒ بن احمدؒ بن محمدؒ بن قدامہؒ ہے۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ الامام اور شیخ الاسلام تھے (تذکرہ جلد ۴ ص۲۷۳)۔ فرماتے ہیں کہ

ولا تجب القرأة علی المأموم هذا قول اکثر اهل العلم وممن کان لا یری القرأة خلف الامام علیؓ وابن عباسؓ وابن مسعودؓ وابوسعیدؓ وزیدؓ بن ثابت وعقبةؓ بن عامر وجابرؓ وابن عمرؓ وحذیفةؓ بن الیمانؓ وبه یقول الثوریؒ و ابن عیینةؒ واصحاب الرأی ومالكؒ والزهریؒ والاسودؒ وابراهیمؒ وسعیدؒ بن جبیرؒ قال ابن سیرینؒ لا اعلم من السنة القرأة خلف الامام اھ (شرح مقنع جلد ۲ ص۱۱ طبع مصر)

اور مقتدی پر قرأۃ واجب نہیں ہے اور یہی اکثر اہلِ علم کا قول ہے اور جو حضرات قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے ان میں خصوصیت سے حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، ابو سعیدؓ، زیدؓ بن ثابت عقبہؓ بن عامر، جابرؓ، ابن عمرؓ، حذیفہؓ بن الیمانؓ قابلِ ذکر ہیں اور یہی قول امام سفیان ثوریؒ، سفیانؒ بن عیینہ، فقہاءِ حنفیہؒ، امام مالکؒ، زہریؒ، اسودؒ، ابراہیمؒ وسعیدؒ بن جبیرؒ کا ہے اور محمدؒ بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ قرأۃ خلف الامام سنت ہو۔

یہ حوالہ بھی اس بات کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و اتباع تابعینؒ میں مذکورین حضرات قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے اور امام محمدؒ بن سیرینؒ قرأۃ خلف الامام کو خلاف سنت قرار دیتے ہیں اور ہم پہلے مغنی کے حوالہ سے عرض کر چکے ہیں کہ امام احمدؒ، امام زہریؒ، امام سفیانؒ بن عیینہؒ

امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ سب حضرات کے نزدیک مقتدی پر جہری اور سرّی کسی نماز میں قرأۃ واجب نہیں ہے۔ اور قاضی شوکانیؒ نے تصریح کی ہے کہ امام اسحاق بن راہویہؒ امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ وغیرہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۳)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

وقال الزهری ومالك وابن المبارك واحمد واسحاق یقرأ فیما اسرّ فیه الامام ولا یقرأ فیما جهر به۔ (تحفة الاحوذی جلد ا ص ۲۵۶)

امام زہریؒ، امام مالکؒ، ابن المبارکؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ "جن نمازوں میں امام آہستہ قرأت کرتا ہو، ان میں مقتدی قرأۃ کر سکتا ہے اور جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔"

امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے ابھی نقل کیا جا چکا ہے اور مبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے عنقریب آئے گا کہ یہ ائمہ باوجودیکہ سرّی نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل تھے۔ لیکن وجوب کے قائل نہ تھے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[۱]:

(متوفی ۵۶۱ھ) بھی مقتدی کے لیے قرأت کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ان کان مأموما ینصت الی قرأۃ الامام ویفهمها۔ (غنیة الطالبین، طبع مصر، ص ۶۷۴)

اگر نماز پڑھنے والا مقتدی ہے تو اس کو امام کی قرأت کے لیے خاموش رہنا چاہیے اور اس کی قرأۃ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ظاہری الفاظ پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ موصوف مقتدی کا تمام نمازوں میں یہ وظیفہ بتا رہے ہیں کہ وہ نہایت توجہ اور دلجمعی کے ساتھ امام کی قرأۃ کو سنے اور خود خاموش رہے اور اگر اس امر پر بھی دھیان رکھا جائے کہ صاحب موصوف امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد تھے[۲]۔ تو اس عبارت

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو الشیخ اور القدوۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۴ ص ۱۷۲) علامہ سیوطیؒ ان کو الشیخ لکھتے ہیں۔ (تاریخ الخلفاء ص ۳۰۵) اور حافظ ابن القیمؒ ان کو الشیخ الامام العارف اور قدوۃ العارفین لکھتے ہیں (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۱۰۱) نواب صاحبؒ ان کو امام الصوفیہ لکھتے ہیں۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۳۷)

[۲] اگلے صفحہ پر دیکھیے

سے جہری نمازوں میں ممانعت ثابت ہوگی۔ اور چونکہ امام احمدؒ سری نمازوں میں وجوب قرأۃ کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے صاحب موصوف کا مسلک بھی یہی ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ[1] (المتوفی ۷۲۸ھ) مسئلہ خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "کہ امام کے جہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ پڑھے اور مقتدی سنیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں جب وَلَا الضَّالِّيْنَ پڑھتا ہے تو مقتدی بھی آمین کہتے ہیں اور سری نمازوں میں چونکہ مقتدی سنتے نہیں۔ اس لیے وہ آمین بھی نہیں کہتے۔ اگر امام بھی قرأت کر رہا ہو اور مقتدی بھی پڑھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو سناؤ جو اس کے لیے آمادہ نہیں اور ایسی قوم کو خطبہ اور وعظ کہو جو توجہ نہیں کرتی۔ اور یہ ایسی کھلی حماقت ہے جس سے شریعت مطہرہ کا دامن بالکل پاک ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص خطبۂ امام کے وقت باتیں کر رہا ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا ہو۔ ایسا ہی وہ شخص ہے جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو۔"

(فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، جلد ۲ ص ۱۴۷)

یعنی نہ گدھا کتابوں سے منتفع ہو سکتا ہے اور نہ مقتدی قرأت امام سے۔ غور کیجئے کہ کتنی نازک تشبیہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو گدھے سے مثال دی گئی ہے۔

(نمبر ۳ پچھلے صفحہ کا) نواب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہ در طبقات صوفیہ سرخیل طوائف اولیاء ست انجام کار در مذہب احمد بن حنبلؒ انتقال برحمت الٰہی فرمود و او را نیز در مجتہدین شمردہ اند جم غفیر از حنفیہ قدیماً و حدیثاً مریداں خانوادہ و آخذ طریق او ست۔" (ہدایۃ السائل ص ۲۸۲)

[1] علامہ ذہبیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں۔ "شیخ الاسلام، العلامہ، الحافظ، الناقد، المفسر، المجتہد، عالی قدر، رئیس الزہاد، یگانۂ دوراں، بحر العلوم، الذکی، الشجاع، السخی اور لکھتے ہیں کہ مخالف اور موافق سب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔" (تذکرہ جلد ۴ صفحہ ۲۷۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں "کہ وہ شیخ الاسلام، امام الائمہ اور مجتہد مطلق تھے۔ علامہ ابن حزمؒ کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ہم پایہ کوئی امام پیدا نہیں ہوا۔" (تقصار ص ۷۶)

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ لکھتے ہیں: "شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علماء اسلام میں بلحاظ جامعیت علوم و فنون خصوصیت سے ممتاز ہیں۔" (تفسیر واضح البیان ص ۳۸)

قارئین کرام! اگر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کی کچھ بھی اجازت ہوتی یا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے خزانۂ معلومات میں ممانعت پر کوئی وزنی دلیل اور امت کی اکثریت کی معیت نہ ہوتی تو یقیناً وہ کبھی ایسی نازک تشبیہ نہ نقل کرتے اور یہی شیخ الاسلامؒ ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں:

والامر باستماع قرأۃ الامام و الانصات له مذکور فی القرآن و فی السنة الصحیحة وهو اجماع الامة فیما زاد علی الفاتحة وهو قول جماهیر السلف من الصحابةؓ فی الفاتحة وغیرها وهو احد قولی الشافعیؒ واختاره طائفة من حذاق اصحابه کالرازیؒ و ابی محمد بن عبد السلامؒ فان القرأۃ مع جهر الامام منکر مخالف القرآن و السنة وما کان علیه عامة الصحابةؓ۔ (تنوع العبادات ص۸۵)

امام کی قرأۃ سننے اور اس کے لیے چپ رہنے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث میں مذکور ہے اور اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی قرأت نہیں ہے اور یہی جمہور اور اکثر حضرات صحابہ کرامؓ کا مسلک ہے کہ مقتدی پر نہ سورۂ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے اور نہ کوئی اور سورۃ۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے اور ان کے پیروکاروں کے گروہ میں جو بڑے ماہر تھے۔ مثلاً امام رازیؒ اور امام ابن عبد السلامؒ ان کا بھی یہی قول ہے اور اسی کو انھوں نے پسند کیا ہے۔ کیونکہ جہر امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا قرآن کریم اور سنت کے خلاف بھی ہے۔ اور فی نفسہٖ بُرا بھی ہے اور اکثر حضرات صحابہ کرامؓ کے تعامل کے بھی سراسر خلاف ہے۔

حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کا مسلک پوری تفصیل کے ساتھ پہلے نقل کیا جا چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شیخ الاسلام کی عبارت بھی بڑی صاف اور واضح ہے۔ مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے اور ہم شیخ الاسلامؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کر آئے ہیں کہ امام احمدؒ سے وہ نقل کرتے ہیں کہ جہری نمازوں میں مقتدی کا امام کے پیچھے قرأۃ کرنا شاذ بھی ہے اور خلاف اجماع بھی۔ اور لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک نہ جہری نمازوں میں مقتدی پر قرأت واجب ہے اور نہ سرّی نمازوں میں۔ (تنوع العبادات ص۸۶)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کے قائل تھے جیسا کہ

انھوں نے اپنے فتاویٰ (جلد ۲ ص ۱۴۹) میں اس کی تصریح کی ہے، لیکن چونکہ وہ حنبلی تھے اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ ان کا مسلک بھی امام احمد بن حنبلؒ کی طرح صرف استحباب کا ہونا چاہیے، نہ کہ وجوب کا۔ اور امام ابن قدامہ کی عبارت سرّی نمازوں میں عدم وجوب کی پہلے نقل کی جاچکی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص۳۱ و ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں سکتاتِ امام میں پڑھنے سے بھی فرض ادا ہوجاتا ہے (محصلہ) لیکن اپنے مقام پر تفصیل کے ساتھ آئے گا کہ شیخ الاسلامؒ سکتات کے قائل نہیں ہیں اس لیے یہ توجیہ مردود ہے۔ رہا شیخ الاسلامؒ کا حنبلی ہونا؟ تو اس پر سینکڑوں حوالے نقل کیے جاسکتے ہیں مگر ہم صرف نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کے ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام کو شیخ الحنابلہ لکھتے ہیں۔
(الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۳۸)

حافظ ابن القیمؒ[۱]: (المتوفی ۷۵۱ھ) مسئلہ خلف الامام کی تحقیق میں ارشاد فرماتے ہیں:
کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقتدی پر سے سجدہ سہو ساقط کردیا ہے۔ بایں طور کہ امام کے پیچھے مقتدی کے بھولنے سے مقتدی پر سہو لازم نہ ہوگا۔ یعنی جب امام کی نماز صحیح ہوگئی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ہوگی۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بھی ساقط کردیا ہے، کیونکہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

فقرأۃ الامام وسترتہ قرأۃ لمن خلفہ وسترۃ لہ۔ (کتاب الروح لابن القیمؒ ص۱۶۶)	یعنی امام کی قرأۃ مقتدیوں کی قرأۃ ہے اور امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ ہے (نہ ان کو الگ قرأۃ کی ضرورت ہے اور نہ سترہ کی)

---

[۱] امام سیوطی لکھتے ہیں کہ انھوں نے تصنیف کتب، مناظرہ اور مسائل کے استنباط میں بڑی جدت کی اور محنت اٹھائی ہے۔ حتیٰ کہ علم حدیث، تفسیر اور فقہ میں وہ کبار ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ (بغیۃ الوعاۃ ص۲۵)
ملا علی قاریؒ حنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ اکابر اہل السنۃ والجماعت میں تھے۔ اور اس امت کے اولیاء میں ان دونوں کا شمار ہوتا ہے۔ (جمع الوسائل شرح شمائل طبع مصر، جلد ۱ ص۲۰۸)
نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ المتکلم الحافظ اور الامام تھے۔ (دلیل الطالب ص۹۰۳)
اور دوسرے مقام پر یوں پھول برساتے ہیں۔ علامہ کبیر مجتہد مطلق تمام علوم وفنون میں اپنے معاصرین پر تفوق رکھنے والے اور مذاہب کے جاننے میں تمام آفاق میں مشہور اور علوم کے سمندر تھے۔ (تقصار ص۸۱)

یہ مضمون بھی نہایت روشن ہے اور غیر مبہم ۔ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

امام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ[۱]: (المتوفی ۱۱۷۶ھ) ان کو بھی بعض حضرات نے (جن میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوریؒ بھی شامل ہیں۔ دیکھیے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص۵ وغیرہ) مجوزین قرأۃ خلف الامام میں شامل کر لیا ہے۔ حالانکہ معاملہ یوں نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان جهر الامام لم يقرأ الا عند الاسكات وان خافت فله الخيرة۔ (حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص۹ طبع مصر)

اگر امام جہر سے قرأت کرتا ہو تو مقتدی کو اس کے پیچھے قرأۃ نہیں کرنی چاہیے، ہاں مگر سکتاتِ امام میں اور سری نمازوں میں مقتدی کو اختیار ہے چاہے پڑھے چاہے نہ پڑھے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا دلالت نمی دارد مگر در جہر۔ (انفاس العارفین ص۵) یہ بحث تو اپنے مقام پر آئے گی کہ سکتاتِ امام کا کیا کہاں اور کتنا ثبوت ہے؟ اور یہ بھی کہ آیت مذکورہ سری نمازوں کو بھی شامل ہے نہ کہ فقط جہری نمازوں کو۔ لیکن یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ شاہ صاحبؒ قرأۃ خلف الامام کے جہری نمازوں میں مطلقاً اور سری نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔

قاضی مقبول احمد صاحب نے مغالطات احسن الکلام ص۳۱ اور الاعتصام ۳۱ اگست ۱۹۶۲ء، ص۵ کالم ۳ میں خاصا واویلا کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی صاحبؒ کی عبارت کے نقل کرنے میں خیانت کی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی غلط ترجمانی کی بخلاف اس کے مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ مبارکپوری نے صحیح ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ عبارت ہضم کر لی گئی ہے اور اگر پڑھے تو سورہ فاتحہ کو اس طرح پڑھے کہ امام کو خلجان میں نہ ڈال دے۔ اور میرے نزدیک یہ بہتر قول ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۹ بمغالطات احسن الکلام ص۳۱)

---

[۱] نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: کہ وہ المحدث اور المشہور تھے۔ (اکسیر ص۹) نیز لکھتے ہیں کہ وہ الشیخ الاجل اور المحدث تھے۔ (الجنۃ ص۳۸) مولانا میر سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بعد اس وقت تک ہندوستان میں تو ایسا شخص نہیں ہوا۔ کہ اسے امام کہہ سکیں اور دوسرے ممالک کا حال خدا جانے۔

(اخبار اہل حدیث ۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء)

اور الاعتصام میں لکھتے ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا عبد الرحمٰن صاحبؒ مبارکپوری کی یہ عبارت بھی نقل کر دی جائے تاکہ قارئین اچھی طرح اندازہ فرما سکیں کہ شاہ ولی اللہ الدہلوی علیہ الرحمۃ کا مسلک بیان کرنے میں کس نے غلطی کی ہے۔ مولانا مبارک پوری نے یا مولانا سرفراز نے؟

مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے بھی باوجود حنفی المذہب ہونے کے امام کے پیچھے الحمد پڑھنے کو اولی الاقوال بتایا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ا ص۵) آپ دونوں عبارتیں ملاحظہ فرمائیں اور بتائیں کہ کیا مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوریؒ نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی غلط ترجمانی کی ہے یا مولوی سرفراز نے؟

الجواب: قاضی صاحب غصہ جانے دیجیے احسن الکلام کے ٹھوس دلائل اور محکم براہین نے آپ کے اور آپ کی جماعت کے دماغ کو ضرور ماؤف کر دیا ہے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے اور اپنے متعصب حواریوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ مغالطاتِ احسن الکلام ہماری طرف سے مکمل جواب ہے یا الاعتصام میں بے سوچے سمجھے چند مضامین درج کر کے احسن الکلام کا جواب تصور کر لینا علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہاں اپنے جذباتی حواریوں کو جماعت میں منسلک رکھنے کے لیے قدرے سنبھالا ہو سکتا ہے۔ مگر تابکے؟ لوگ دلائل دیکھا کرتے ہیں۔ ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مکمل عبارت نقل کرتے ہیں اور قارئین کرام سے التماس کرتے ہیں کہ وہ انصاف سے فرمائیں کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت میں خیانت کس نے کی ہے؟ آیا مولانا مبارک پوری صاحبؒ اور ان کے وکیل قاضی مقبول احمد صاحب نے یا سرفراز نے؟ حضرت شاہ صاحب کی عبارت مع ترجمہ یہ ہے:

وان کان مأموما وجب علیہ الانصات	اور اگر وہ مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننے
والاستماع فان جهر الامام لم یقرأ الا	کے لیے توجہ کرنا واجب ہے۔ پس اگر امام جہر سے پڑھے تو
عند الاسکتة وان خافت فله الخیرة فان	مقتدی قرأۃ نہ کرے مگر سکتہ میں اور اگر امام آہستہ پڑھے
قرأ فلیقرأ الفاتحة قرأة لا یشوش علی الامام	تو مقتدی کو اختیار ہے پس اگر مقتدی پڑھے تو فاتحہ پڑھے
وھذا اولی الاقوال عندی وبه یجمع بین	اس طرح کہ امام کو خلل میں نہ ڈالے اور یہ میرے نزدیک سب سے
احادیث الباب والسر فیه ما نص علیه من	بہتر قول ہے اور یونہی اس باب کی حدیثیں باہم جمع کی جاتی
ان القرأة مع الامام تشوش علیه وتفوت	ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ شارع نے صراحت کے ساتھ

التدبر وتخالف تعظيم القرآن ولم يعزم عليهم ان يقرؤا اسرارًا من العامة متى ارادوا ان يصححوا الحروف باجمعهم كانت لهم لجة مشوشة فسجل في النهى عن التشويش ولم يعزم عليهم مايؤدي الى المنهي وابقى خيرة لمن استطاع و ذلك غاية الرحمة بالامة انتهى۔
(حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص۹ طبع مصر)

بتایا ہے کہ امام کے ساتھ قرآۃ کرنا اس کو خلل میں ڈالتا ہے اور تدبر کو فوت کر دیتا ہے اور تعظیم قرآن کے مخالف ہے۔ اور تاکیداً ان کو نہیں فرمایا کہ وہ ضرور آہستہ پڑھیں کیونکہ عام لوگ جب مل کر تصحیح حروف کا ارادہ کریں گے تو ان کی آواز بلند ہوگی جو باعث تشویش ہوگی سو اس تشویش کی نہی میں تو تاکید کی ہے مگر آہستہ پڑھنے کی تاکید نہیں کی جو اس ممنوع چیز تک ان کو پہنچا دے اور اختیار دیا گیا ہے کہ جو پڑھ سکتا ہے پڑھے اور یہ امت کے ساتھ انتہائی رحمت ہے۔

یہ تمام خط کشیدہ عبارت قاضی مقبول احمد صاحب شیرِ مادر سمجھ کر پی گئے ہیں جس سے سرّی نمازوں میں قرآۃ کرنے اور نہ کرنے کے اختیار کا راز کھلتا ہے۔ اور فان قرأ فليقرأ الخ کا (جو ولم خافت فله الخيرة کی تفریع ہے) معنی اور اگر پڑھے الخ کر کے اپنی لیاقت کا ثبوت دیا ہے اور غصہ ہم پر آرہا ہے کہ غلط ترجمانی ہم نے کی ہے۔ یہ ہے فریقِ ثانی کے علماء کا علم اور لیاقت سبحان اللہ تعالےٰ قاضی صاحب! حضرت شاہ صاحبؒ حرف فا کے ساتھ (جو تفریع اور ترتیب کے لیے ہوتا ہے) یہ فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی نے سرّی نمازوں میں پڑھنے کی شق کو اختیار کیا تو اس طرح فاتحہ پڑھے کہ امام کے لیے باعث تشویش نہ ہو حرف واؤ کے ساتھ بیان نہیں کر رہے جس کا معنی اور اگر پڑھے الخ الاولى والسر فيه سے آہستہ پڑھنے کا اور الخيرة کا راز بیان فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے تمام سرّی اور جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کو اولی الاقوال نہیں فرمایا جیسا کہ مبارکپوری صاحب نے دھوکہ کھایا ہے اور قاضی صاحب موصوف دھوکہ دہی پر کمربستہ ہیں کسی عربی کے ماہر ثالث سے فیصلہ کرالیں کہ اس کا مطلب سرفراز ٹھیک بیان کر رہا ہے؟ یا مبارکپوری صاحبؒ جو فرماتے ہیں وہ درست ہے؟

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر!

قارئین کرام! آپ کو اس ماسبق بحث سے یہ اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ اور ائمہ اربعہؒ اور ان کے علاوہ امت کی اکثریت کے نزدیک

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا شاذ، مخالف قرآن وسنت اور مخالفِ اجماع سمجھتے تھے اور سری نمازوں میں بھی اُمّت کی اکثریت وجوبِ قرأۃ کی قائل نہ تھی۔ اس بحث کے پیشِ نظر فریقِ ثانی کے یہ باطل اور بے بنیاد دعاوی کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے بے نماز مفسدینِ صلوٰۃ اور تارکِ سُنت ہیں اور ان کے ساتھ مُباہلہ تک کرنا بھی صحیح ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ کہاں تک صحیح ہیں؟ اور ان کے ان غلو آمیز اور شر انگیز گستاخانہ کلمات سے کون امام بچ سکتا ہے؟ ہم نے محض نمونہ کے طور پر بعض حضرات ائمہؒ کی عبارات مقدمہ میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ باب اوّل میں آیت کی تفسیر میں حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ کے جو آثار بیان ہوں گے۔ نیز باب سوم میں آثار حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے تحت جو آثار ذکر کیے جائیں گے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں اور اگر آپ کی نزاکت طبع وقلتِ فرصت کا خیال دل کی گہرائیوں میں دب دب کر نہ اُبھرتا تو ہم ان کو بھی مقدمہ میں جگہ دیتے۔ کیونکہ ؎

رہ رواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ہست وہم خود منزل است

اب ہم مقدمہ میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے صرف حضرت امام احمدؒ بن حنبل کی ایک جامع ومانع عبارت نقل کرتے ہیں۔ بغور پڑھیے۔ امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

قال احمدؒ[1] ما سمعنا احدًا من اھل الاسلام یقول ان الامام اذا جھر بالقرأۃ لا یجزیٔ صلوٰۃ من صلّٰی خلفہ اذا لم یقرأ وقال ھذا النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ والتابعون وھذا مالکؒ فی اھل الحجاز وھذا الثوریؒ

امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا کہ ہم نے اہل اسلام میں کسی سے نہیں سنا۔ جو یہ کہتا ہو کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے قرأۃ نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے اور فرمایا یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ آپ کے صحابہؓ اور تابعینؒ ہیں اور یہ امام مالکؒ ہیں اہل حجاز میں اور یہ امام ثوریؒ ہیں

[1] اور نواب صدیق حسن خان صاحبؒ دارقطنی کے حوالہ سے ایک روایت رجالہ کلھم ثقات کے الفاظ سے نقل کرکے آگے لکھتے ہیں کہ حدیث دلیل است بر عدم قرأۃ چیزی در پس امام در حالت جہر امام والہٰذا احمدؒ گفتہ ما سمعنا احدًا یقول ان الامام اذا جھر بالقرأۃ لا تجزیٔ صلوٰۃ من لم یقرأ۔ اھ (ھدایۃ السائل ص ۱۹۳)

فی اھل العراق وھذا الاوزاعیؒ فی اھل الشام وھذا اللیثؒ فی اھل مصر ما قالوا الرجل صلّٰی وقرأ امامہ ولم یقرأ ھو صلوٰتہ باطلۃ۔ (مغنی ابن قدامہ ج اص ۶۰۶ بعینھا یہ عبارت شرح مقنع جلد ۲ص ۱۳ میں بھی ہے)	اہل عراق میں اور یہ امام اوزاعیؒ ہیں اہل شام میں اور یہ امام لیثؒ بن سعد ہیں اہل مصر میں ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے اور اس کا امام قرأۃ کرے اور مقتدی خود قرأۃ نہ کرے تو اس کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔

درماندگی:

مصنف خیر الکلام نے حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس واضح اور صریح عبارت کا جو جواب دیا ہے اس کو پڑھ کر ان کی علمی حالت پر بے ساختہ ترس آتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

(۱) اس کا مطلب بھی یہی لینا چاہیئے کہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنا کسی کے نزدیک ضروری نہیں بلکہ قرأۃ کا فریضہ (جن کے ہاں قرأۃ فرض ہے) سکتات میں ادا ہو سکتا ہے۔ (الخ) (خیر الکلام ص ۳۲)

(۲) یا امام احمدؒ بن حنبلؒ کی عبارت کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس لیے کسی کی تحقیق میں فاتحہ فرض نہ ہو تو وہ جہری نمازوں میں نہ پڑھے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ امام صاحبؒ نے جہر کی قید کیوں لگائی ہے اس اختلافی مسئلہ میں تو جہر اور سر برابر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سری نمازوں میں منع کی چونکہ کوئی دلیل نہیں اس واسطے بعض علماء نے اس کو اختلافی مسئلہ قرار نہیں دیا بلکہ اتفاقی سمجھ کر یہ فتویٰ لگایا کہ سری نمازوں میں جو شخص نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے۔ الخ (ص ۳۲ خیر الکلام)

(۳) بعض حنفیہ (احسن الکلام ص ۲۴) نے علامہ کی عبارت سے قرأ امامہ امام پڑھ رہا ہو گا جملہ حذف کر دیا ہے پھر امام احمد بن حنبلؒ سے یہاں اوزاعیؒ اور لیثؒ کا نام بھی نقل کر دیا ہے حالانکہ امام ابن عبد البرؒ نے ان دونوں سے فاتحہ کی فرضیت نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کو ان کے اس قول کا علم نہیں۔ الخ (ص ۳۳ و ۳۴)

الجواب: یہ ہے فریق ثانی کے رئیس المحدثین قدوۃ السالکین اور استاذ الاساتذہ کا جواب جس میں ایک رتی جان بھی نہیں ہے۔ ترتیب وار سنیئے:

۱۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سکتات کا مسئلہ نہیں بیان فرما رہے ہیں بلکہ تصریح کرتے ہیں کہ جہری

نمازوں میں امام کے پیچھے مطلق قرأۃ نہ کرنے والے کی نماز تمام اہل اسلام کے نزدیک جائز ہے اور اس کا ایک شخص بھی منکر اور مخالف نہیں ہے۔ اگر امام احمد بن حنبلؒ کے علم میں یہ ہوتا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (یا کوئی اور) اس کا مخالف ہے تو باوجود قرب زمانے کے بلکہ امام شافعیؒ کا شاگرد ہونے کے (دیکھیے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۷۲) کبھی یہ دعویٰ نہ کرتے کہ اہل اسلام میں اس کا کوئی قائل نہیں۔ چودھویں صدی کے مجتہدین کا تو انہیں کوئی علم نہ تھا کہ ان کے لیے کوئی گنجائش چھوڑ دیتے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہ ارشاد امام شافعیؒ کے مسلک کی وضاحت کے لیے ایک مستقل دلیل ہے اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے قرأت ترک کرنیوالے کی نماز بالکل صحیح ہے۔

ع۲۔ امام احمد بن حنبلؒ تو جہری نمازوں میں تمام اہل اسلام کا اتفاق نقل فرماتے ہیں۔ پھر ان کی عبارت کا مطلب چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے الخ کس طرح صحیح ہوا۔ رہا سری نمازوں کے بارے میں مصنّف خیر الکلام کا یہ فرمانا کہ چونکہ دلیل نہیں ..... الخ (محصلہ) ممکن ہے اس چونکہ سے ان کے حواری تو شاید مطمئن ہو جائیں مگر علمی دُنیا کبھی اس چونکہ سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سری نمازوں میں بھی عدم قرأت کی دلیل ایک نہیں کئی ٹھوس دلائل ہیں اور صرف ایک برہان نہیں بلکہ متعدد براہین موجود ہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی خاصا اختلافی ہے اور جو حضرات پڑھنے کے قائل ہیں۔ مثلاً: امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ تو وہ بھی سری نمازوں میں وجوب کے قائل نہیں ہیں سوائے گنے چنے چند حضرات کے کوئی امام سری نمازوں میں قرأۃ نہ کرنے والے کی نماز کے بطلان کا ہرگز قائل نہیں اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔

ع۳ قدوۃ السالکین کا تعصب ملاحظہ ہو کہ یہ حسن ظنی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہی نہیں ہوتی کہ یہ لفظ چھوٹ گیا ہے بلکہ فرماتے ہیں حذف کر دیا ہے اور خیر الکلام ص۵۵۶ مناقشہ ۹ میں لکھا ہے کہ اس عبارت میں سے جملہ وقرأ امامہ اور اس کا امام پڑھتا ہو چھوڑ دیا ہے تاکہ جہری و سری سب نمازوں کو یہ فتویٰ شامل ہو۔ انتہیٰ بلفظہ۔ فریق ثانی کے رئیس المحدثین کو معلوم ہونا چاہیے کہ احسن الکلام جلد ۱ ص۲۴ پر جہاں یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس کے ترجمہ میں یہ لفظ موجود ہیں کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو الخ اس کی موجودگی میں یہ احتمال کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوا کہ سری نمازیں بھی اس میں شامل ہوں جب کہ راقم کے نزدیک سری کو یہ شامل ہی نہیں تو سب کو شامل

ہونے کا کیا معنیٰ؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چار سو صفحات کی کتاب میں کسی ایک آدھ جملہ کا
چھوٹ جانا یا کتابت میں غلطی کا واقع ہونا غیر اغلب نہیں ہوتا۔ آپ کے ذہن مبارک سے
اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ کیوں نکل گیا؟ باقی امام عبد البرؒ سے بدرجہا زیادہ امام احمدؒ بن حنبلؒ امام
اوزاعیؒ اور امام لیثؒ کے مسلک کو جانتے ہیں۔ مجتہد مطلق بھی ہیں اور قرب زمانہ بھی ہے
اور یہ حوالہ علامہ ابن قدامہؒ کے علاوہ اور دیگر ثقہ اور ثبت حضرات محدثین عظامؒ نے بھی
نقل فرمایا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں امام احمدؒ بن حنبلؒ کا علم بالکل صحیح ہے اور مؤلف
خیر الکلام کی بات پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

اقرار کے ساتھ انکار کی دم:

مصنف خیر الکلام نے جب بخوبی یہ محسوس کر لیا کہ حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس
ٹھوس اور واضح عبارت کے جواب میں میری لکھی ہوئی سینہ زاد باتیں ناکام ہیں تو آخر میں
اقرار بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ پس زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ
کے قول کا مطلب وہی ہے جو ناقل (سرفراز) نے سمجھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ
نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تاویل کی ہے اور صحابہ کرامؓ کے اقوال ان کو بسند صحیح نہیں
پہنچے۔ مگر امام بخاریؒ اور دیگر محدثینؒ کو وہ اقوال بسند صحیح پہنچ گئے اس لیے انہوں نے آں حضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کے قول لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔
اس کی تاویل نہیں کی جیسا کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے تاویل کی ہے۔ الیٰ ان قال بہر صورت اس اختلافی
مسئلہ میں ایک امام کی رائے ہے جو دوسرے ائمہ حدیث خصوصاً امام بخاریؒ (جو بنقل حافظ ابن حجرؒ امام
احمدؒ سے فقہ اور حدیث میں بیس گنا سے زیادہ ہیں۔ مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۷) کی رائے کے خلاف
ہے پس کسی صورت میں یہ قابل التفات نہیں۔ (خیر الکلام ص ۳۴ و ۳۵)

الجواب: حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ اس مقام پر اہلِ اسلام کا متفقہ فیصلہ اور ائمہ مذکورین
کا اجماع نقل کر رہے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کی نماز فاسد اور باطل ہونے کا کوئی
قائل نہیں۔ حدیث کی تاویل اور عدم تاویل کا ذکر وہ یہاں نہیں فرما رہے وہ تو اہلِ اسلام کا متفقہ فیصلہ
نقل فرما رہے ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال اگر امام احمدؒ بن حنبلؒ کو بسند صحیح نہیں پہنچے تو

اور کس کو پہنچے ہیں ؟ اور جو اقوال حضرت امام بخاریؒ کو بقول مصنف خیر الکلام بسند صحیح پہنچے ہیں ان کا حال بھی اپنے مقام پر احسن الکلام جلد دوم میں واضح کر دیا گیا ہے جن کو مؤلف مذکور نے تنکوں کا سہارا دے کر تھامنے کی بے جا سعی کی ہے مگر سنبھلے پھر بھی نہیں۔ رہا یہ کہ امام بخاریؒ امام احمدؒ بن حنبلؒ سے بیس گنا فقہ و حدیث میں زیادہ ہیں۔ صرف عقیدت کی نقل سے کچھ نہیں بنتا۔ اس کا قائل اور اس کا درجہ معلوم ہونا چاہیے اور اس کی علمی شہرت اور اکثر امت کا اعتماد باحوالہ درکار ہے۔ محض نقل کی حیثیت کیا ہے ؟ اور اگر وہ کوئی معتبر امام ہے تو یہ صرف ان کی غلو فی العقیدت کا اظہار ہے۔ حضرت امام بخاریؒ کا جو مقام حدیث و فقہ میں ہے اس کا کون منکر ہے یا ہو سکتا ہے ؟ لیکن حدیث و فقہ میں جو مقام حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کا ہے وہ حضرت امام بخاریؒ کا نہیں ہے اس لیے کہ حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ بالاتفاق ائمہ مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں اور حضرت امام بخاریؒ کے متعلق مختلف آرا ہیں کوئی ان کو مجتہد مطلق کہتا ہے اور کوئی مجتہد فی المذہب کہتا ہے۔ اور امام سُبکیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان کو شافعی بتاتے ہیں ہم نے بقدر ضرورت طائفہ منصورہ میں اس پر باحوالہ بحث کی ہے اور امام بخاریؒ بقول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فقہی مسائل میں امام شافعیؒ اور امام ابو عبیدؒہ کے خوشہ چین اور ان کی کتب سے استمداد کرتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے لیے دونوں دل کا نُور اور آنکھوں کا سرور ہیں مگر فرق مراتب ضرور ہے لہٰذا حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کے اس واضح اور روشن حوالہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ علمی دنیا میں اس کو باور کرنے کے لیے کوئی تیار ہے۔ اور یہ صرف امام حضرت احمدؒ بن حنبلؒ ہی کی رائے نہیں بلکہ جمہور حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اتباع تابعینؒ اور ائمہ دینؒ کی رائے ہے اور اتنی بڑی وزنی رائے ہے جس نے فریق ثانی کے اس غلو اور بے جا تعصب کا بھیجا نکال دیا ہے کہ قرأۃ خلف الامام نہ کرنے والوں کی نماز بےکار، باطل اور کالعدم ہے۔ اس لیے امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس مسئلہ میں لاعلمی کا دعویٰ (جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے) بالکل بے بنیاد اور سراسر مردود ہے۔ عجب نہیں کہ مؤلف مذکور یہ کہہ دیں: ؏

مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ اور بعض دیگر ائمہؒ (جن سے آپ ماسبق حواشی میں اچھی طرح روشناس ہو چکے ہیں) کا یہ فیصلہ دیکھ لیجئے۔

اور فریق ثانی کے مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہونے کے خالص متعصبانہ فتوے اور مباہلہ کے اعلان اور فراخ دلی سے انعامی چیلنج ملاحظہ کر لیجیے اور پھر فرمائیے کہ تکفیر کس کی ہوگی؟ اور بے نماز کون ہوگا؟ مفسدِ صلوٰۃ کون ہوگا؟ اور مباہلہ کس سے ہوگا؟ تارک سنت کون ہوگا اور انعامی شاہی چیلنج کا مستحق کون ہوگا؟ افسوس ہے کہ فریق ثانی نے تعصب اور کم فہمی کی وجہ سے ایسا ایٹم بم ایجاد کر لیا کہ اس کی زد سے نہ بڑے بڑے ائمہ بچ سکتے ہیں اور نہ حضرات تابعینؒ بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حتیٰ کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی ان کے لایعنی فتووں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ) دیکھئے اس ناروا فتوے کی زد سے کون بچ سکتا ہے؟ ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی!

باوجود اس کے کہ حق جمہور کے ساتھ ہے اور سو فیصدی ان کی رائے درست اور صحیح ہے۔ مگر وہ فریق ثانی کی طرح اس مسئلہ میں (بلکہ دیگر تمام اختلافی مسائل میں) نہ تو مجوزین قرأۃ خلف الامام کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ قسم اٹھا کر ان کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کہتے ہیں اور نہ ان کو مباہلہ کا چیلنج دیتے ہیں۔ بلکہ جن اکابر (مثلاً امام بخاریؒ و امام بیہقیؒ وغیرہ) نے اپنی انتہائی وسعت اور کوشش صرف کر کے جمہور کی رائے کے ساتھ اختلاف رائے کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کو معذور تصور کرتے ہیں بلکہ ماجور بھی سمجھتے ہیں اور ائمہ دین اور دیگر حضرات سلف صالحینؒ کی نسبت بدظنی اور سوء اعتقاد کو کسی طرح بھی روا نہیں سمجھتے: ؎

وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو فریق ثانی کے بے بنیاد اور پا در ہوا دعووں اور فتووں کا جواب تو اس مقدمہ ہی سے پورا ہو جاتا ہے اور مزید کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر چونکہ ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ مسئلہ زیر بحث کو پوری طرح بے نقاب کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کے بعد اصل بحث اور اس کے دلائل عرض کرتے ہیں ——— لیکن باب اوّل شروع کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم امام ترمذیؒ[1] (المتوفی ۲۷۹ھ) اور علامہ بدر[2] الدین عینیؒ

---

[1] و [2] کا مکمل حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

(المتوفی ۸۵۵ھ) کی بعض عبارتوں کو یہیں حل کرتے جائیں، جن سے بہت ممکن ہے کہ بعض اہل علم کو مغالطہ لگ جائے اور طالب علموں کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا تو بہت اغلب ہے، رہے وہ حضرات جو غلط فہمی اور مغالطہ کو متاعِ عزیز سمجھ کر سینہ سے لگائے پھرتے ہیں۔ ان کے لیے ہمارے پاس کوئی علاج اور دوا موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی صرف اسی کو ہدایت دیتا ہے جو دل میں اس کی تڑپ اور جذبہ پیدا کرے۔ اور عملاً اس کی طرف پیش قدمی کرے ورنہ اس دربارِ عالی سے بھی محرومی کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا: ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

امام ترمذیؒ تحریر فرماتے ہیں: اکثر اہلِ علم جن میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ شامل ہیں اور خاص طور پر امام مالکؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحٰقؒ کا یہ مسلک ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأۃ کرنی چاہیے (ترمذی جلد ۱ ص۴۱) ہم پہلے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام عبداللہ بن مبارکؒ امام اسحٰقؒ

(پچھلے صفحے کے حاشیے) ؎ امام ترمذیؒ، علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں جو مشہور کتاب "الجامع" ہے۔ وہ انہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ کتاب "العلل" بھی انھوں نے لکھی ہے۔ حافظہ میں وہ ضرب المثل تھے۔ (تذکرہ ۲ ص۲۵۱) مگر افسوس یہ امام عالی مقام بھی جرح سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ترمذی صاحب الجامع مجہول ہیں (میزان الاعتدال جلد ۳ ص۱۱۷) اگر امام ترمذیؒ مجہول ہیں تو دنیا میں معروف کون ہوگا؟

؎ علامہ بدر الدین عینیؒ، مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ وہ امام، عالم، علامہ عالم بالعربیۃ والتصریف اور حافظِ لغت تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اگر ان میں مذہبی تعصب نہ ہوتا تو کیا خوب ہوتا (فوائد البہیہ ص۲) بعض غیر مقلد حضرات علامہ عینیؒ کے تعصب پر مولانا لکھنویؒ کی یہ عبارت لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ تو فرمائیں کہ ذرا تعصب سے کون امام بچ سکا ہے۔ علامہ ذہبیؒ جن کے بعد آج تک کوئی ناقد رجال پیدا نہیں ہوا۔ اور حافظ الدنیا ابن حجرؒ بھی ان کے ناقد رواۃ ہونے پر نہ صرف اعتماد کرتے ہیں بلکہ ان کے خوشہ چین بھی ہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص۱۱۱) مع ہذا شیخ الاسلام تاج الدین سبکیؒ لکھتے ہیں کہ ذہبیؒ بڑے متعصب ہیں وہ ہمارے استاد ہیں اور ہم پر ان کا حق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا حق ان پر مقدم ہے ہم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی حنفی یا شافعی کے حق میں ذہبی

بن راہویہ کا مسلک پوری وضاحت سے نقل کر آتے ہیں کہ جہری نمازوں میں ان میں کوئی بھی قرأۃ خلف الامام کا قائل نہ تھا اور سرّی نمازوں میں امام مالکؒ، امام احمدؒ اور عبداللہؒ بن مبارکؒ وغیرہ وجوب قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ اور خود امام ترمذیؒ نے امام عبداللہؒ بن مبارکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: بعض لوگوں نے تشدّد سے کام لیا ہے لیکن میرے نزدیک جس شخص نے امام کے پیچھے قرأۃ نہ کی اس کی نماز صحیح ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۲)

اندریں حالات اگر کسی کو امام ترمذیؒ کی اس عبارت سے کوئی شک اور شبہ پیدا ہو۔ تو ہرگز صحیح نہیں۔ المعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔ لیجیے ہم آپ کو ترمذیؒ کی اسی عبارت کی شرح مولانا مُبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے سُناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

فیہ اجمال ومقصودہ ان ھٰؤلاء الائمۃ کلھم یرون القرأۃ خلف الامام امافی جمیع الصلوٰت اوفی الصلوٰۃ السرّیۃ فقط واما علی سبیل الوجوب او علی سبیل الاستحباب والاستحسان۔

کہ امام ترمذیؒ کا یہ قول مجمل ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ ائمہ مذکورین امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل تھے۔ بعض سب نمازوں میں اور بعض صرف سرّی نمازوں میں۔ بعض وجوب کے قائل تھے اور بعض صرف استحباب اور استحسان کے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۴)

اور تصریح کرتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے وجوب کے قائل نہ تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۷) اور لکھتے ہیں کہ امام عبداللہؒ بن مبارکؒ بھی امام کے پیچھے وجوب قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ (ایضاً ج ۱ ص ۲۵۷)

رہا یہ کہ تمام نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کا قائل کون تھا؟ اور پھر خاص طور پر وجوب کا جہاں تک راقم الحروف کے محدود مطالعہ کا تعلق ہے۔ ان ائمہ میں سے جن کا تذکرہ امام ترمذیؒ نے کیا ہے۔ ایک بھی ایسا نہیں جو تمام نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کا قائل ہو اور خاص طور پر وجوب کا۔ اگر مولانا مبارکپوری صاحبؒ کو امام شافعیؒ کے مسلک میں غلط فہمی ہوئی ہو۔ تو ہم پوری وضاحت اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کا قول مسموع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ شافعیوں اور حنفیوں کے حق میں اکثر تعصب سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۹۱) والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہ۔

اور صراحت کے ساتھ امام شافعیؒ کا مسلک عرض کر چکے ہیں۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں کہ

واستدل بھذا الحدیث عبد اللہ بن المبارکؒ والاوزاعیؒ ومالکؒ والشافعیؒ واحمدؒ واسحٰقؒ وابو ثورؒ وداؤدؒ علی وجوب قرأۃ الفاتحۃ خلف الامام فی جمیع الصلوات انتھی بلفظہ۔ (عمدۃ القاری ج۳ ص۶)

یعنی حضرت عبادہؓ کی (لا صلوٰۃ لمن لم یقراء بام القرآن) کی روایت سے امام ابن مبارکؒ، امام اوزاعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ، امام ابو ثورؒ[1] اور امام داؤد ظاہریؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ تمام نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام واجب ہے۔

اس عبارت سے غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیے:

اوّلاً اس لیے کہ ہم ان حضرات ائمہ کرامؒ کی عبارتیں پوری تشریح کے ساتھ اور خود فریق ثانی کے محدث جلیل اور وکیل اعظم مولانا مبارکپوری صاحبؒ کے اقرار کے ساتھ نقل کر آتے ہیں کہ یہ ائمہ تمام نمازوں میں وجوب قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ امام ابو ثورؒ کے علاوہ باقی ائمہ کرامؒ کی عبارتیں پہلے نقل کی جا چکی ہیں اور ان کا مسئلہ زیر بحث کے متعلق محقق مسلک بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ امام ابو ثورؒ کا صحیح مسلک علی التعیین معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی پیش کردہ سابق عبارتوں سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جہری نمازوں میں وہ بھی امام کے پیچھے قرأۃ کو شاذ اور خلاف اجماع ہی سمجھتے ہوں گے اور اسی صفحہ کے حاشیہ سے انکا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے اور تحقیق وہی تھی جو حضرت امام شافعیؒ کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وثانیاً علامہ عینیؒ کی اسی عبارت پر گرفت کرتے ہوئے مولانا مبارکپوریؒ صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] امام ابو ثورؒ (المتوفی ۲۴۰ھ) علامہ ذہبی لکھتے ہیں: کہ وہ الامام، المجتہد اور الحافظ تھے۔ امام نسائیؒ ان کو ثقہ اور مامون اور احد الفقہاء کہتے ہیں۔ امام ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ فقہ، علم، ورع، فضیلت، تصنیف کتب اور تشریح سنت میں دنیا کے اماموں میں ایک تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۸۷) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ احد الثقات المامونین ومن الائمۃ الاعلام فی الدین تھے۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۶۵) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ پہلے اپنی رائے اور فقہ پر کاربند تھے۔ جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لے گئے تو امام موصوف نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا اور امام شافعیؒ کے پاس آتے جاتے رہے۔ (تہذیب جلد ۱ ص ۱۱۹) اس سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قلت هذا وهم من العيني فان عبد الله بن المبارك لم يكن من القائلين بوجوب القرأة خلف الامام كما عرفت وكذالك الامام مالك والامام احمد لم يكونوا قائلين بوجوب قرأة الفاتحة خلف الامام فی جمیع الصلوٰت۔ انتہی

(تحفة الاحوذی جلدا ص ۲۵۷)

میں کہتا ہوں کہ یہ امام بدرالدین عینیؒ کا وہم ہے کیونکہ عبداللہ بن مبارک امام کے پیچھے وجوب قرأۃ کے قائلین میں نہ تھے جیسا کہ تمہیں معلوم ہوچکا ہے اور اسی طرح حضرت امام مالکؒ اور امام احمد بھی تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے امام کے پیچھے پڑھنے کے وجوب کے قائل نہ تھے۔

مولانا مبارکپوری صاحبؒ کا یہ ارشاد فرمانا بالکل صحیح ہے۔ یہ یقیناً علامہ عینیؒ کا وہم اور ان کے سرعتِ قلم کا نتیجہ ہے، ورنہ دلائل اور براہین کے رو سے ان ائمہ کا جن کا ذکر علامہ موصوف نے کیا ہے مسلک با دلائل نہایت شرح وبسط کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہوگا اور اجمالی طور پر بقدر کفایت مقدمہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہمیں اچھی طرح اس امر کا احساس ہے کہ سلسلۂ کلام دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے اور شاید کہ آپ مقدمہ کی طوالت سے ہی گھبرا جائیں۔ حالانکہ ہم نے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کو انہی اقتباسات پر ختم کرتے ہیں اور فریقِ ثانی کی خدمت میں نہایت اخلاص سے عرض کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا غیر محتاط لفظ زبان سے نہ نکالے جس کی زد میں اکثر امت اور جمہور سلف صالحینؒ آجائیں۔ کیونکہ ہم لوگوں تک حدیث کے پہنچانے کا واحد ذریعہ یہی لوگ ہیں اور ان پر برسنے والا گویا بالواسطہ حدیث پر برس رہا ہے۔ اور ان کی گستاخی کرنے والا کبھی حدیثِ رسول کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا: ؎

تا دامن آکے چاکِ گریباں نے دم لیا
ہے دامن اور جیب میں رشتہ قریب کا

نوٹ: قرآن کریم کی ضروری تشریح حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کے فوائد سے ماخوذ ہے اور طبقات ابن سعد، شذرات الذہب، تہذیب الاسماء اور ابن خلکان وغیرہ میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ ان کتابوں کے حوالے تابعین اور غلامانِ اسلام سے ماخوذ ہیں۔ باقی جملہ کتابوں سے بندہ نے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ الا ماشاء اللہ تعالیٰ اور حوالہ جات میں صحت کی ہر ممکن کوشش مدنظر رکھی گئی ہے۔

ابوالزاہد

باب اوّل

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیثِ مصطفٰی بر جاں مسلّم داشتن

اہلِ اسلام سے یہ بات ہرگز مخفی نہیں کہ جو رتبہ، درجہ اور قطعیت اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی کتاب کو حاصل ہے۔ وہ یقیناً دنیا میں کسی اور کلام اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل اور براہین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاں سب سے پہلا نمبر صرف قرآنِ کریم کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس میں کسی انسان کی دماغی محنت اور کاوش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بخلاف احادیث کے کیونکہ پہلے ہر حدیث کو نقل بالتواتر کا درجہ حاصل نہیں ہے جیساکہ قرآنِ کریم کو حاصل ہے اور پھر احادیث میں نقل بالمعنیٰ کا بھی کافی دخل ہے[1] جیساکہ فنِ حدیث سے تعلق رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ جس گروہ کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ثبوت ہوگا۔ اس کا مسلک حق اور صحیح ہوگا اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ امام کے پیچھے قرأۃ

---

[1] بلکہ امام سیوطیؒ وغیرہ نے تو یہاں تک دعوٰے کیا ہے فان اکثر الاحادیث مروی بالمعنی۔ (الاقتراح ص۱۹)
یعنی اکثر احادیث جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بقید الفاظ مروی نہیں ہیں۔ بلکہ راویوں نے احادیث کے معانی کو اپنے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

ترک کرنے پر جمہور کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب سے قطعی اور محکم دلیل موجود ہے۔

قرآنِ کریم کے آداب:

اس سے قبل کہ ہم قرآنِ کریم کی وہ آیت اور اس کی تفسیر اور تشریح نقل کریں جس سے ہم استدلال کرتے ہیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر غور اور فکر کر لیں کہ جس وقت اور جس مقام پر قرآن کریم کی قرأۃ اور تعلیم و تدریس اور تلاوت ہوتی ہو وہاں سامعین کو کیا کرنا چاہیے؟ اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا ادب سکھلایا ہے؟ اگر اسی ایک پہلو پر سرسری غور کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ کافی حد تک بحث اسی سے حل اور طے ہو جائے۔ ہم قرآن کریم کی چند آیات اور احادیث اور علماء کرام کی بعض عبارتیں اور نقول عرض کرتے ہیں جن سے سامعین کے آداب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اور قرآن کریم کے آداب کا قابلِ تعظیم پہلو بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

(۱) شروع شروع میں جس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم لاتے۔ ان کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلد اسے یاد کر لیں اور سیکھ لیں۔ مبادا حضرت جبرائیلؑ چلے جائیں اور وحی پوری طرح محفوظ نہ ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں پوری طرح سننے اور سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آپ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنیں۔ جس وقت حضرت جبرائیلؑ پڑھیں۔ آپ اس وقت خاموش ہو کر توجہ کریں اور سنیں اور زبان مبارک کو حرکت نہ دیں۔ قرآن کریم کا حرف بحرف جمع کرنا اور آپ کی ذات سے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ آیات ملاحظہ کریں:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝

(پ ۲۹ ۔ قیٰمۃ ۱)

نہ حرکت دیجیے قرآن کے پڑھنے میں اپنی زبان کو تاکہ آپ جلدی اس کو سیکھ لیں۔ اس کا جمع کرنا اور اس کا (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے اور جب ہم (بزبان فرشتہ) پڑھیں تو آپ ان کے پڑھنے کی اتباع کریں۔ پھر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتلانا

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور تلاوت کے وقت سامعین کو خاموش رہ کر پوری

دلجمعی اور توجہ کے ساتھ قاری اور تالی کی قرأۃ سننی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن کریم کے آداب اور اتباع اور اس کی تعظیم وتکریم کا یہی واضح پہلو ہے۔

مصنف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق کہ چپ نہ رہ سکوں یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کا قرآن کریم کی تعظیم واحترام سے کوئی تعلق نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ آپ کو اس سے پہلے قرآنی آداب کا علم نہ تھا۔ اور یہ بات سراسر غلط ہے اور نیز لازم آئے گا کہ استاد جب تک سبق ختم نہ کرے شاگرد کا پڑھنا بے ادبی ہو تو پھر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہی چھوڑ دیا جاتے بلکہ اس کا مطلب جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے یہ ہے کہ قرآن کے اتارنے سے آپ کو سخت تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔

(بخاری جلد ۱ ص ۳) (محصلہ خیر الکلام ص ۳۶۲، ۳۶۳)

الجواب:

یہ جو کچھ کہا ہے محض دفع الوقتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ

هذا تعليم من الله عزّ وجلّ لرسوله صلى الله عليه وسلم في كيفية تلقيه الوحي من الملك فانه كان يبادر الى اخذه ويسابق الملك في قرأته فامره الله عزّ وجل اذا جاءه الملك بالوحي ان يستمع له وتكفل الله ان يجمعه في صدره .... الخ

(تفسیر جلد ۴ ص ۴۴۹)

اس میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دی گئی ہے کہ فرشتہ سے وحی کس کیفیت سے حاصل کرنی ہے کیونکہ آپ وحی کے لینے میں جلدی کرتے اور فرشتہ سے اس کی قرأۃ میں مسابقت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ جب فرشتہ وحی لائے تو آپ توجہ فرمائیں اور قرآن پاک کو آپ کے سینہ میں محفوظ کر دینے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھالیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ اس آیت کے نزول سے پہلے اس طرح پڑھنے کو خلاف ادب نہ سمجھتے تھے لیکن آپ پر واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ کا کام استماع ہے ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں ہے باقی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہمارے مطلب کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آپ اسی خیال سے پڑھتے تھے کہ مبادا بھول نہ جاؤں سو آپ پر منکشف کر دیا گیا کہ آپ بھولیں گے بھی نہیں اور اس طرح قرآن کریم کا ادب بھی ملحوظ رہے گا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف خیر الکلام

الف با تا پڑھنے والے ابجد خوانوں کو ذہن مبارک میں جگہ دیے ہوتے ہیں جبھی تو فرماتے ہیں کہ پڑھنا پڑھانا ختم ہو جائے گا۔ بات اُن کی ہو رہی ہے جو سن کر تدبر اور قرآن کریم کے مضمون پر غور و خوض کر سکیں اور ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ پہلے سُن لیں پھر لب کشائی کریں۔ بچوں کی بات نہیں ہو رہی۔

(۲) ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ سے خطاب فرمایا ہے:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا (پ ۱۶ طٰہٰ رکوع ۷)

اور آپ جلدی نہ کریں قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو جایا کرے اس کا اترنا۔ اور کہیے اے میرے رب زیادہ کر علم میرا اور سمجھ۔

یہ آیت بھی اس امر کو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ تلاوت اور قرأت قرآن کریم کے وقت سامعین کو پورے تدبر اور انہماک کے ساتھ قرآن سننا چاہیے اور خود ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرنی چاہیے۔

(۳) بعثتِ محمدی سے پہلے جنّوں کو کچھ آسمانی خبریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوئی تو وہ سلسلہ بند ہو گیا اور بہت کثرت سے شہب کی مار پڑنے لگی۔ جنوں کو خیال ہوا کہ ضرور کوئی نیا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبروں پر بہت زیادہ سخت پہرے بٹھلائے گئے ہیں۔ اسی کی تلاش و جستجو کے لیے جنوں کے مختلف گروہ مشرق و مغرب میں پھیل پڑے۔ ان میں سے ایک جماعت بطن نخلہ (مکہ مکرمہ کے پاس ایک مقام کا نام ہے) کی طرف سے گذری۔ وہاں اتفاق سے اس وقت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی اس ٹکڑی کا رُخ قرآن کریم سننے کے لیے ادھر پھیر دیا۔ قرآن کریم کی آواز ان کو بہت عجیب اور مؤثر و دلکش معلوم ہوئی اور اس کی عظمت اور ہیبت دلوں پر چھا گئی۔ آپس میں کہنے لگے کہ چپ رہو اور خاموشی کے ساتھ یہ کلام پاک سنو۔ آخر قرآن کریم نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہی نئی چیز ہے جس نے جنوں کو آسمانی خبروں سے روکا ہے۔ بہر حال جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرآن کریم پڑھ کر فارغ ہوتے تو یہ لوگ

اپنے دلوں میں ایمان و ایقان کا موجزن سمندر لے کر واپس ہوئے اور اپنی قوم کو نصیحت کی جس کی پوری تفصیل سورۂ جن میں کی گئی ہے اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی اسی سورت کے ذریعہ سے ان کا پورا قصہ اور واقعہ بتلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ج فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ۔

(پارہ ۲۶، احقاف ۴)

اور جب متوجہ کر دیا۔ ہم نے جنوں کا ایک گروہ آپ کی طرف وہ سننے لگے قرآن، پھر جب وہ وہاں پہنچے، بولے چپ اور خاموش رہو۔ پھر جب قرآن ختم ہوا تو اپنی قوم کی طرف چلے گئے تاکہ ان کو خدا تعالیٰ کی مخالفت اور عذاب سے ڈرائیں

اللہ تعالیٰ نے اس مضمون میں جنوں کے اس گروہ کی تعریف بیان کی ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ پوری توجہ کے ساتھ خاموش رہ کر قرآن کریم کی قرأۃ سنی بلکہ اس کار خیر پر دوسروں کو بھی آمادہ کیا اور مرد مومن کی بھی یہی عادت اور خصلت ہونی چاہیے کہ قرأۃ قرآن کے وقت خود چپ رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ خاموشی ادب و احترام کے لیے نہ تھی، تحقیق حال کے لیے تھی کیونکہ دوسری جگہ ثابت ہے کہ جب آپ نے سورۂ رحمٰن پڑھی تو جنات جواب دیتے تھے۔ (محصلہ صد ۳۶۴)

الجواب:

جنوں کا خاموش رہنا خالص ادب اور احترام کے لیے تھا اگرچہ وہ اس وقت تک مسلمان نہ تھے مگر بات سمجھنے کی اور خدائی کلام کی تعظیم کی اہلیت ان میں تھی۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کے مضامین پر مطلع ہونا اور اس سے آگاہی حاصل کرنا آپ کو کیوں ناگوار ہے؟ آپ بھی استماع و انصات سے کام لیں۔ رہا سورۂ رحمٰن میں جنوں کا جواب تو یقین رکھیے کہ وہ ساتھ ساتھ سورۂ رحمٰن ہرگز نہ پڑھتے تھے۔ جب آپ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا الآیۃ کی قرأۃ مکمل کر چکتے تو اس کے بعد جنات تائید میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ مقتدی جہری نمازوں میں آمین کہکر تائید کرتے ہیں کیونکہ ساتھ ساتھ پڑھنا تو خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ کما مر اور سکتات کا صحیح احادیث میں کہیں وجود نہیں ہے۔

(۴۳) اللہ تعالیٰ کافروں اور مشرکوں کے ایک بُرے منصوبے کا تذکرہ یوں کرتا ہے اور اس کے بعد ان کو سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ۔ (پارہ ۲۴، حم السجدہ ۴)

اور کافروں اور منکروں نے کہا۔ اس قرآن کے سننے کے لیے کان مت دھرو اور قرأۃ قرآن کے وقت شور و غل مچا دو تاکہ تم غالب ہو جاؤ۔

اگرچہ مشرکین کا قرآن کریم کو نہ سننا اور قرآت کے وقت شور و غل مچانا، معاندانہ اور مخالفانہ طور پر تھا اور حضرات مجوزین قرأۃ خلف الامام کو قرآن کریم سے یقیناً عداوت اور عناد نہیں ہوتا اور نہ اُن کا پڑھنا من کل الوجوہ ان کافروں کے شور و غل کے برابر ہے۔ اور گو وہ از روئے دیانت پڑھتے ہیں لیکن دیکھنا صرف یہ پہلو ہے کہ قرآن کریم کی قرأۃ اور تلاوت کے وقت خود پڑھنا کیا باعثِ مخالجت و منازعت اور تشویش و ہاتھا پائی کا سبب ہے یا نہیں؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ہے تو ایسے موقع پر خود قرآن کریم کا پڑھنا آداب قرآن کریم کے خلاف اور موجب تشتّتِ افکار ہوگا، لہٰذا حق اور صواب یہی ہے کہ تلاوت قرآن کریم کے وقت خاموش رہ کر اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جن باتوں کی شریعت نے اجازت دی ہے وہ کیونکر بے ادبی ہیں۔ (محصلہ ص۳۴۶) تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرنے کا کسی شرعی دلیل سے ثبوت نہیں ہے اور یہ خلاف اجماع ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

هٰذا حال هٰؤلاء الجهلة من الكفار ومن سلك مسلكهم عند سماع القرآن وقد امر الله عباده المؤمنين بخلاف ذلك فقال واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۸۹ مع المعالم)

ان جاہل کافروں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ قرآن کی قرأۃ کے وقت خاموشی اور سکوت اختیار نہیں کرتے اور شور و غل مچاتے ہیں اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے۔

حافظ صاحبؒ کی عبارت سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ قرأۃ قرآن کے وقت مومنوں کا کام

دلچسپی کے ساتھ اس کو سننا ہے اور جاہل کافر اور ان کے پیروکار اس ضابطہ کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"اے ابن مسعودؓ! مجھے قرآن کریم پڑھ کر سناؤ۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: میں نے کہا حضرت! کیا میں آپ کو قرآن پڑھ کر سناؤں؟ حالانکہ آپ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ انی اشتھی ان اسمعه من غیری ـــــ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں۔" (مسلم جلد ۱ ص ۲۷۰)

یہ روایت بخاری جلد ۲ ص ۶۵۹ اور ترمذی جلد ۲ ص ۱۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے سورۃ نساء کا کافی حصہ پڑھ کر سنایا اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پورے ذوق و شوق سے سنا۔ امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں اس سے جو احکام اور فوائد اخذ ہو سکتے ہیں۔ ان کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

منها استحباب استماع القرأة و الاصغاء لها والبكاء عندها وتدبرها و استحباب طلب القرأة من غيره ليستمع له وهو ابلغ في الفهم والتدبر من قرأته بنفسه۔ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۷۰)

ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کا بغور سننا اور توجہ کرنا اور رونا اور تدبر کرنا پسندیدہ بات ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ دوسرے سے قرآن کریم سنے اور دوسرے سے سننا خود پڑھنے سے فہم و تدبر میں زیادہ ممد و معاون ہے۔

یعنی اگرچہ قرآن کریم کا پڑھنا کار ثواب ہے لیکن جس طرح دوسرے سے سننے میں فہم و تدبر اور غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ وہ یقیناً خود پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خود پڑھنے کے بجائے بعض اوقات دوسرے سے سننا افضل اور اعلیٰ ہے۔

مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ نماز میں نہ تھا اور آپ نے کمال توجہ سے سنا آخر میں آپ نے رونا شروع کیا اور فرمایا بس اتنا ہی کافی ہے معلوم ہوا کہ مناسب کلمہ کہنا بے ادبی نہیں ورنہ تکبیر تحریمہ کا پڑھنا خلاف ادب ہوگا۔ (محصلہ ص ۳۶۵)

الجواب:

ہم نے کب کہا ہے کہ وہ نمازیں تھے۔ بتلانا تو صرف قرآن کریم کی تعظیم کا پہلو ہے۔ دیکھیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باقرار شما کس غور سے آخر تک سنا اور رونا شروع کر دیا۔ یہی اس کے تدبر اور استماع کا لازمی نتیجہ تھا اور آپ نے حَسْبُكَ کہ بس اتنا ہی کافی ہے آخر میں فرمایا ہے۔ درمیان میں اور ساتھ ساتھ نہیں فرمایا۔ باقی تکبیر تحریمہ فرض ہے۔ اس کو واجب لغیرہ کے لیے (یعنی خاموشی جو قرأۃ قرآن کے استماع کے لیے ہے) نہیں چھوڑا جاسکتا اور ساتھ ساتھ پڑھنا تو منکر اور شاذ ہے۔ کما مرّ۔

قرآن کریم کے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ——— کہ جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا ثواب ملے گا) قاعدہ سے عموماً اور اس صحیح حدیث سے خصوصاً کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے گا۔ اس کو دس نیکیاں عطا ہوں گی (ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۵) یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ خود پڑھنے والا دس نیکیوں کا مستحق ہے لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے سے قرآن سننے والے کو بیس نیکیاں ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں؛

من استمع الیٰ اٰیۃ من کتاب اللہ کتب لہ حسنۃ مضاعفۃ (الحدیث)	جو آدمی قرآن کریم کی ایک آیت سنتا ہے اس کے لیے دوہرا اجر لکھا جاتا ہے۔

(رواہ احمد فی مسندہ۔ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۱)

چونکہ مقتدی پر انصات واجب ہے اس لیے اس حدیث کے رُو سے اس کو دہرا اجر ملیگا اور غیر حافظ جب حافظ کی قرأۃ سننے کے لیے توجہ کرے تو اس حدیث کے رُو سے وہ بھی دہرے اجر کا مستحق ہے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے؟

مؤلف خیر الکلام کا طنزاً یہ کہنا کہ غیر حافظوں کے لیے یہ نسخہ اکسیر ہے ..... الخ (ص ۳۸۰) محض تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔ ملاحظہ کیجیے کس طرح صرف اپنی فاسد رائے سے حدیث کو رد کیا جا رہا ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) صرف بطور تائید ایک روایت اور ملاحظہ کریں: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ یحب الصمت عند ثلاث عند تلاوۃ القرآن وعند الزحف وعند الجنازۃ۔

(اخرجہ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

تین مقامات پر اللہ تعالیٰ خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ ان میں سے ایک قرآن کریم کی قرآۃ کا، دوسرا لڑائی کا اور تیسرا جنازہ کا وقت ہے۔

احسن الکلام طبع اول میں وعندہ تلاوۃ القرآن (الحدیث) کر دیا گیا تھا جس پر مؤلف خیر الکلام نے اعتراض کیا کہ مؤلف احسن الکلام نے چالاکی کر کے وعند الزحف .... الخ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ لڑائی کے وقت ذکر اللہ قرآن سے ثابت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصات اور ذکر جمع ہو سکتے ہیں چونکہ یہ ہماری تائید میں ہے۔ لہٰذا احسن الکلام والا اس کو کھا گیا ہے۔ (محصلہ ص ۲۷۹ ج ۱)

الجواب:

وعند الزحف کا جملہ ہمارے ہرگز خلاف نہیں ہے کیونکہ لڑائی کے موقع پر مختلف اوقات ہوتے ہیں کبھی ذکر کا حکم ہے اور کبھی انصات کا اور کبھی ذکر قلبی اور استعانت وغیرہ کا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ پس جب تم کافروں سے ملو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو اور جب وہ شور و غل کریں تو تم خاموش رہو۔

(تفسیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

اور ایک دوسری حدیث میں یلی کرنی کا معنی یوں کرتے ہیں: ای لا یشغلہ ذلک الحال عن ذکری ودعائی واستعانتی (ایضاً) یعنی لڑائی میں وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس سے مانگنے اور استعانت سے بے پروا نہ ہو تو اس میں ذکر اور انصات دونوں جمع نہیں ہوئے بلکہ دونوں اپنے اپنے موقع پر ہیں اور حیرت ہے کہ ان کو الحدیث کی اصطلاح بھی معلوم نہیں جبھی تو کہتے ہیں کہ حذف کر دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ آخر تک حدیث پڑھو اور اس کو ملحوظ رکھو۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

دل الکتاب والسنۃ والاجماع علی ان الاستماع افضل من القرآۃ۔

(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۳)

کتاب وسنت اور اجماع امت سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی قرأت کو سننا خود پڑھنے سے زیادہ اعلیٰ اور افضل ہے۔

الحاصل قرآن کریم وحدیث اور اقوال ائمہؒ سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ قرآن کریم کی

تلاوت اور قرآت کے وقت سامعین کو ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف توجہ اور تدبر کرنا چاہیے۔
اور صرف یہی پہلو قرآن کریم کی توقیر و تعظیم پر علیٰ وجہ الاتم دلالت کرتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر مشتمل ہے۔ اور اس سے
عام قاعدہ اور ضابطہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اب ہم تخصیص کے ساتھ امام کے پیچھے قرأت
کی ممانعت پر قرآن کریم کی آیت پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کی تفسیر و تشریح اور شانِ نزول
حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور معتبر مفسرینؒ سے نقل کریں گے۔ اور فریق ثانی کی طرف اس
پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کی حقیقت کو بقدر وسعت الم نشرح
کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

قرآۃ خلف الامام اور قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ — اور جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو۔ تاکہ تم پر رحم ہو۔

(پارہ ۹، اعراف ۴)

جمہور اہلِ اسلام کا بیان ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ خلف الامام پر روشنی ڈالی ہے کہ جب
امام قرآن کریم کی قرأۃ کر رہا ہو تو اس وقت مقتدیوں کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ نہایت توجہ کے ساتھ اس کی طرف
کان لگائے رہیں اور خود خاموش رہیں۔ امام کا وظیفہ قرآت کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموشی کے
ساتھ توجہ کرنا ہے اور ان کو استماع اور انصات کے علاوہ قرآت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ اس
میں شک نہیں کہ الحمد سے لے کر والناس تک سب قرآن ہے۔ لیکن قرآن کریم صحیح احادیث،
حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کا خاص اطلاق کس سورت
پر ہوا ہے؟ اور قرآن کا اولین اور بالذات مصداق کونسا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (پ ۱۴، الحجرات ۶) — اور البتہ دی ہیں ہم نے آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور دیا قرآن بڑے درجہ کا۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ام القرآن ھی السبع المثانی والقرآن العظیم۔ کہ ان سات آیتوں اور قرآن عظیم کا مصداق سورۃ فاتحہ ہے۔

(بخاری جلد ۲ ص ۶۸۳ اور اسی کے قریب الفاظ دارمی ص ۴۴۶ طبع دمشق میں ہیں)

اس کے علاوہ حضرت ابو سعید بن المعلیٰ رض اور حضرت ابی ابن کعب رض وغیرہ سے بخاری و موطا امام مالک وغیرہ میں مرفوعاً صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قرآن عظیم کا پہلے نمبر پر مصداق ام الکتاب ام القرآن اور سورۃ فاتحہ ہے۔ اور یہی حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابراہیم نخعیؒ، عبداللہ بن عبید بن عمیرؒ ابن ابی ملیکہ شہر بن حوشبؒ، حسن بصریؒ، مجاہدؒ اور قتادہؒ وغیرہ اکابر سے مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ ترجیح دیتے ہیں اور لکھتے ہیں؛

فھذا نص فی ان الفاتحۃ ھی السبع المثانی والقرآن العظیم۔ کہ یہ روایات اور اقوال مفسرین اس بات پر نص ہیں کہ سبع مثانی اور قرآن عظیم کا اولین مصداق سورۃ فاتحہ ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، جلد ۲ ص ۵۵۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کی سب سورتوں سے افضل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پڑھنا ہر نماز میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے (جو احادیث سے ثابت ہے) کہ تورات انجیل اور زبور بلکہ قرآن کریم میں اس جیسی مزیت اور فضیلت والی اور کوئی سورت نازل نہیں کی گئی اور یہ بالکل ممتنع ہے کہ استماع اور انصات کا حکم سورۃ فاتحہ کو شامل نہ ہو۔ حالانکہ استماع اور انصات کی آیت اس کو کئی طور سے شامل ہے کہ یہ آیت مطلق ہے اور سورۃ فاتحہ اس کا ایک حصہ ہے اور یہ کہ آیت عام ہے اور یہ اس کا فرد ہے (اور یہ کہ آیت مجمل ہے اور حدیث اس کی تفسیر ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ (صفدر) علاوہ بریں اس کی قرأۃ اکثر اور مشہور ہے اور یہ تمام سورتوں سے افضل ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں؛

فان قولہ واذا قرئ القرآن یتناولھا ولا یتناول غیرھا اظھر لفظا ومعناً۔ یعنی واذا قرئ القرآن کی آیت جس طرح اپنی لفظی اور معنوی حیثیت سے سورۃ فاتحہ کو شامل ہے اس طرح وہ قرآن کی کسی دوسری سورت کو شامل نہیں ہے۔

(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۳)

اس تحقیق سے یہ امر بالکل واشگاف اور ہویدا ہو جاتا ہے کہ واذا قرئ القرآن

کا صحیح، اصلی اور بالذات مصداق صرف سورۂ فاتحہ ہے۔ لہٰذا یہ حکم سُورۂ فاتحہ پر خصوصاً اور دیگر سُورتوں پر عموماً حاوی ہے۔ اور اس لحاظ سے مقتدیوں کو امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ کا ترک کرنا اصل ہوگا۔ اور باقی سُورتوں کو ترک کر اس کی فروع، امام نسائیؒ نے (جلد ۱ ص ۱۰۶ میں) جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث (جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز) اذا قرأ فانصتوا کو (کہ جب امام قرأۃ کرے تو تم مقتدی خاموش رہو) قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر اور تاویل میں نقل کر کے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچا دی ہے کہ گویا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی قرآن کی اس آیت کو نماز اور نمازیوں کے حق میں ہی سمجھتے تھے۔ اب آپ حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور معتمد مفسرین کرامؒ سے اس آیت کی تفسیر سن لیجیے کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم اس آیت کی تفسیر حضرات صحابہ کرامؓ سے نقل کریں۔ یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر کا رتبہ، درجہ اور حیثیت کیا ہے۔ امام حاکم رحہ لکھتے ہیں: کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نزدیک صحابی کی تفسیر مسند اور مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتی ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۲۳) اور یہی امام حاکم رحہ کی اپنی تحقیق ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲۰) حافظ ابن کثیر رحہ لکھتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۳۳) حافظ ابن القیم رحہ لکھتے ہیں: وتفسیر الصحابی حجۃ۔ (زاد المعاد جلد ص ۵۲) علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں وتفسیر الصحابی مرفوع۔ (تدریب الراوی ص ۶۵) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں جس صحابی نے نزولِ وحی کا زمانہ پایا ہو۔ اس کا کسی آیت سے متعلق یہ کہنا کہ یہ فلاں اور فلاں حکم میں نازل ہوئی۔ یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (توجیہ النظر ص ۱۶۵)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

وکذا حکم اقوالھم فی التفسیر فانھا اصوب من اقوال من بعدھم وقد ذھب بعض اھل العلم الی ان تفسیرھم فی حکم المرفوع۔	یعنی حضرات صحابہ کرامؓ کی تفسیر بعد کے آنے والے مفسرین سے بہت زیادہ صحیح اور صواب ہے حتیٰ کہ بعض (بلکہ اکثر) علماء کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

(الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۳۲ھ)

سے قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر یوں منقول ہے:

لہ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آفتابِ نبوت سے اکتساب نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نجوم ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے جزوی فضائل حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں ان کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضا کی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معلمینِ قرآن میں سب سے پہلا نمبر ان کا بیان کیا ہے (بخاری جلد ا ص ۵۳۱ و مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا ہے جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود رضا پسند کرتے ہیں میں اس پر راضی ہوں۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۳۱۹ صحیح) نیز فرمایا اگر بغیر مشورہ کے تمہارے لیے میں خلیفہ کا انتخاب کروں تو وہ صرف ابن مسعود رضا ہی ہوں گے اور جس چیز کو ابن مسعود رضا تمہارے لیے پسند نہ کرے میں بھی اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کروں گا۔ (الاستیعاب جلد ا ص ۳۵۹) اور فرمایا ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو۔ (ایضاً) حضرت عقبہ رضا بن عمرو فرماتے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد میں نے ما انزل اللہ (یعنی جو کچھ خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے) کا ابن مسعود رضا سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ حضرت ابو موسیٰ رضا نے فرمایا کیوں نہ ہو۔ وہ ہر وقت حضور کے پاس رہتے تھے اور حضور ان سے کسی وقت حجاب نہیں کرتے تھے۔ (مسلم ۲ ص ۲۹۳) مشہور تابعی شقیق رحہ کا بیان ہے کہ میں ابن مسعود رضا پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتا۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۳۱۹) یہی وجہ ہے کہ ابن مسعود رضا علی رؤس الاشہاد فرمایا کرتے تھے۔ اس خدا کی قسم جس کے بغیر کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ قرآن کریم کی کوئی سورت اور کوئی آیت ایسی نہیں جس کا شان نزول مجھے معلوم نہ ہو کہ کس موقع اور کس حالت میں نازل ہوئی ہے اور میں کتاب اللہ کا اپنے سے بڑا عالم کسی کو نہیں پاتا۔ (بخاری جلد ۲ ص ۷۴۸، و مسلم ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا تمام صحابہ رضہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ان سب سے کتاب اللہ کا بڑا عالم ہوں۔ (ایضاً) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضا حضرات خلفائے راشدین رضا سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور اہل علم میں ان پر وہ حضرات کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے۔ (مفتاح السعادۃ جلد ا ص ۳۵۳) حضرت عمر رضا نے ان کو علم کا انبار کہا۔ اور اہلِ کوفہ کی طرف تعلیم قرآن کے لیے ارسال کیا۔ (بغدادی جلد ا ص ۱۴۷) بعض حضرات نے مسئلہ رفع یدین کے پیش نظر حضرت عبداللہ بن مسعود رضا پر متعدد مسائل میں نسیان کا الزام عائد کیا ہے۔ لیکن نسیان تو انسان کی فطرت اور خمیر میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو اولادِ آدم کو باپ سے بطور ورثہ ملا ہے۔ اگر نسیان (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

سے محض نسیان ہی مراد ہے تو دو سروں کا ذکر بعد میں ہوگا۔ کیا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: انما انا بشر انسیٰ کما تنسون اور اگر نسیان سے مراد بعض مسائل اور احادیث سے لاعلمی ہے تو یہ قصور صرف حضرت ابن مسعود رضہ کا نہیں بلکہ دوسرے بھی اس بات میں ان کے شریک ہیں۔ کیا حضرت ابوبکر رضہ کو وراثت جدہ کی بابت اور حضرت عمر رضہ کو حکم طاعون سے متعلق بلکہ رفع یدین کے مرکزی راوی حضرت ابن عمر رضہ کو مسح علی الخفین کے مسئلہ سے ناواقفی اور لاعلمی نہ تھی؟ اور کیا یہ اکابر عموماً اور حضرت ابن عمر رضہ خصوصاً اس لیے قابل اعتماد نہ رہے۔ کہ انھوں نے مسح علی الخفین (دیکھیے موطا ص ۱۲) جیسے مسئلہ سے جس کا ثبوت متواتر احادیث اور تعامل امت سے ثابت ہے۔ لاعلمی ظاہر کی بلکہ انکار کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رح فرماتے ہیں کہ ان ابن عمرؓ انکر المسح علی الخفین مع قدیم صحبتہ وکثرۃ روایتہ اھ (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۴۵ طبع مصر) کہ بے شک حضرت عبداللہ بن عمر رضہ نے مسح علی الخفین کا انکار کیا حالانکہ وہ پرانے صحابی اور کثیر الراویہ تھے۔ باقی باتوں کا ذکر تو روایات اور احادیث سے متعلق ہے اور یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضہ پر جو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کی سورتیں نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خالص افترا اور بہتان ہے۔ علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ

کل ما روی عن ابن مسعودؓ من ان المعوذتین وام القرآن لم یکونا فی مصحفہ فکذب موضوع لا یصح۔
(محلی ابن حزم جلد ۱ ص ۱۳)

جتنی روایتیں بھی ابن مسعود رضہ سے اس مضمون کی نقل کی گئی ہیں کہ معوذتین اور ام القرآن ان کے مصحف میں نہ تھیں تو وہ خالص جھوٹی اور جعلی ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہیں۔

امام نووی رح اور علامہ سیوطی رح لکھتے ہیں:

ومانقل عن ابن مسعودؓ باطل لیس بصحیح۔
(شرح المہذب جلد ص واتقان ج ۱ ص ۷۹)

معوذتین کے قرآن میں نہ ہونے کی جتنی روایتیں ابن مسعودؓ کی طرف منسوب ہیں وہ سب باطل اور غیر صحیح ہیں۔

امام سبکیؒ فرماتے ہیں کہ دلیل قاطع اس پر قائم ہے کہ یہ حضرت ابن مسعودؓ پر جھوٹ باندھا گیا ہے اور وہ اس سے بالکل بری ہیں۔ (طبقات جلد ۲ ص ۲۰۷)

پہلی روایت: امام ابن جریر[۱] رح فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو کریب[۲] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے محاربی[۳] نے بیان کیا۔ وہ داؤد[۴] بن ابی ہند سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ یُسیر[۵] بن جابر سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

---

[۱] ان کا ترجمہ عنقریب آرہا ہے۔

[۲] ابو کریب کا نام محمد بن العلاء رح ہے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقہ اور محدث کوفہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص۷۳) امام نسائی رح ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الخفافؒ کا بیان ہے کہ میں نے اسحاق رح بن ابراہیم رح کے بعد ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ محدث مسلمہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص۳۸۶)

[۳] محاربی کا نام یحییٰ بن یعلیٰ ہے۔ امام ابو حاتم رح ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۱ ص۳۰۳) اور کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے اس روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محاربی دو ہیں۔ ایک یعلیٰ بن یعلیٰ جن کی توثیق مولانا سرفراز صاحب نے فرمائی ہے اور دوسرے عبد الرحمٰن بن محمد بن زیاد جو انتہا درجہ کے ضعیف ہیں اور قوی احتمال ہے کہ مولانا نے ضعیف محاربی کی توثیق کر کے اپنا مطلب نکال لیا ہو۔ (محصلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء ص۶ کالم ۲)

الجواب: راقم نے یعلیٰ بن یعلیٰ رح کی توثیق نہیں نقل کی بلکہ یحییٰ بن یعلیٰ المحاربی رح کی توثیق نقل کی ہے اور اس سند میں یہی محاربی ہیں۔ ہم محض قاضی صاحب کی تسلی کے لیے عبد الرحمٰن بن محمد بن زیاد المحاربی کے متعلق بھی یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ وہ انتہائی درجہ کے ضعیف نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ یہ بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے مرکزی راوی ہیں کیا فریق ثانی کے نزدیک صحاح ستہ کے مرکزی راوی بھی انتہا درجہ کے ضعیف ہوتے ہیں؟ یہ ہے غیر مقلدین حضرات کا علم و دیانت۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ اگرچہ ان کے بارے میں بعض نے مضطرب کثیر الغلط اور یہم وغیرہ کے الفاظ لکھے ہیں لیکن امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور ابو حاتمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام وکیعؒ فرماتے ہیں کہ طویل احادیث کے وہ بڑے حافظ تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث بزارؒ اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو لا باس بہ کہتے ہیں اور ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ (ملتقطاً تہذیب التہذیب جلد ۶ ص۲۶۵)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلی ابن مسعود فسمع اناسا یقرأون مع الامام فلما انصرف قال اما آن لکم ان تفقھوا اما آن لکم ان تعقلوا واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کما امرکم اللہ تعالیٰ۔

(تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص ۱۰۳)

کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے نماز پڑھی اور چند آدمیوں کو امام کے ساتھ قرأۃ کرتے سنا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تم سمجھ اور عقل سے کام لو اور جب قرآن کریم کی قرأۃ ہوتی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

یہ روایت وضاحت سے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ پڑھنے والے امام کے پیچھے قرأۃ کر رہے تھے اور حضرت ابن مسعودؓ نے ان کو فہم و عقل سے کام نہ لینے پر تنبیہ کرتے ہوئے قرأۃ سے منع کیا اور یہ بات بھی عیاں کر دی کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو استماع اور انصات کا حکم دیا ہے۔ جو امام کے ساتھ اس کی اقتدا میں نماز ادا کر رہے ہوں اور یہ وہی ابن مسعودؓ ہیں جو کتاب اللہ کے عالم ہونے میں تمام حضرات صحابہؓ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) قاضی صاحب مؤلف احسن الکلام سے بے شک اختلاف رکھیے، مگر صحاح ستہ کے ثقہ راوی کو تو انتہا درجہ کا ضعیف نہ قرار دیجیے۔

[۴] داؤد بن ابی ہندؒ کو امام احمدؒ، سفیان ثوریؒ، ابن معینؒ، ابو صالحؒ اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن ابی شیبہؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو متقنین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو ثقہ اور ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۳ ص ۲۰۴) ذہبیؒ ان کو الامام اور الثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۵)۔

[۵] یسیر بن جابرؒ، ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام عجلیؒ ان کو من ثقات اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں۔ عوام بن حوشبؒ ان کو صحابی بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سنہ ھ میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۷۹) حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ بھی ان کو صحابی بتلاتے ہیں۔

(الاستیعاب جلد ۲ ص ۶۱۷)

نوٹ: تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر کے بعض نسخوں میں کاتب کی غلطی سے بشیر بن جابر لکھا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے مسند احمد جلد ۱ ص ۳۸۴ اور مسند طیالسی ص ۵۱ اور صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۹۲ میں ایک دوسری حدیث کی سند میں یسیر بن جابرؒ ہی آیا ہے جو صحیح ہے مزید تشریح کے لیے نووی جلد ۱ ص ۳۹۲۔ اور تجرید اسماء الصحابۃؓ للذہبیؒ جلد ۲ ص ۱۵۳ وغیرہ کی طرف مراجعت کیجیے۔

کرام رضؓ حتیٰ کہ حضرات خلفائے راشدین رضؓ سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور جن کو ہر سورت اور ہر آیت کا شان نزول بخوبی معلوم تھا۔ مؤلف خیر الکلام نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ شانِ نزول نہیں بیان کر رہے بلکہ استدلال کر رہے ہیں اور استدلال بھی ان کی بے جا حرکت پر تھا کیونکہ وہ امام کے ساتھ ساتھ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے جیسا کہ لفظ استماع سے معلوم ہوتا ہے...... الخ (محصلہ ص ۳۵۱)۔

الجواب:

حضرت ابن مسعودؓ تو کما امرکم اللہ سے اس کا شانِ نزول بیان فرما رہے اور اگر استدلال بھی مان لیا جائے تو ما و شما کا استدلال تو نہیں بلکہ حضرت ابن مسعودؓ صحابی کا استدلال ہے جو پہلے درجہ کے مفسر ہیں۔ اور مقتدیوں کی بیجا حرکت امام کے ساتھ قرآۃ تھی نہ کہ جہر۔ جیسا کہ یقرؤن کے الفاظ اس پر دال ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد میں لفظ انصات اس کی واضح دلیل ہے اور حضرت ابن مسعودؓ نے قرآۃ کی اس بیجا حرکت سے انھیں منع فرمایا ہے اور مطلق قرآۃ پر جہر کا اطلاق محض مجازی طور پر ہوتا ہے جس کے لیے قرینہ صارفہ درکار ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

دوسری روایت۔ امام بیہقیؒ [۱] فرماتے ہیں۔ ہم سے ابوالحسن، محمدؒ [۲] بن الحسینؒ بن داؤد علویؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے ابوالحسنؒ علیؒ [۳] بن محمدؒ بن حمشاذ العدلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں۔ مجھ سے محمدؒ بن حسینؒ [۴] انماطی بغدادیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے یحیٰی بن ایوبؒ [۵] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عبدالوہاب [۶] ثقفی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

---

[۱] امام ابوبکر احمدؒ بن الحسین البیہقیؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، العلامہ اور شیخ خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ ۳ ص ۳۰۹)

[۲] جلیل القدر عالم اور بڑے پایہ کے صوفی تھے۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۲۲۸) علامہ ذہبیؒ ان کو امام بیہقیؒ کے مشائخ اور زمرۂ محدثین میں بیان کرتے ہیں۔ (تذکرہ ۳ ص ۲۰۹)۔

[۳] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۳ ص ۶۹)

[۴] ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۲۲۸)

[۵] علی بن مدینیؒ اور ابوحاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور حسین بن فہمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور مامون۔ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۸۸)

[۶] الحافظ الامام اور ثقہ تھے۔ (تذکرہ ۱ ص ۲۹۵) آخر عمر میں ان کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ (تقریب ص ۲۲۹)

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایوبؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ منصورؒ[2] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو وائلؒ[3] سے روایت کرتے ہیں :

قال عبد اللہؓ فی القرأۃ خلف الامام انصت للقرآن کما امرت فان فی القرأۃ لشغلا وسیکفیک ذلک الامام۔ (کتاب القرأۃ صـ۱۳۷)

کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ امام کے پیچھے خاموشی اختیار کرو۔ جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ خود پڑھنے کی وجہ سے امام کی قرأۃ سننے سے آدمی رہ جاتا ہے اور امام کا پڑھنا ہی تمہیں کافی ہے۔ (الگ قرأۃ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔)

حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت صحیح ہے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور خطاب ان لوگوں کو تھا جو امام کے پیچھے اس کی اقتدا کر رہے تھے۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور یہ سری و جہری تمام نمازوں کو شامل اور فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو حاوی ہے اس میں قرآت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب وغیرہ نے کیا ہے سراسر باطل ہے اور اس روایت میں گو امرت ہے لیکن پہلی روایت میں تصریح ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور امر بھی واذا قرئ القرآن۔ الآیۃ سے واضح ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اسی مضمون کی روایتیں مختلف اسانید سے اور بھی مروی ہیں مگر ہمارا مقصد استیعاب نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ[4] رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۶۸ھ) سے اس آیت کی تفسیر میں متعدد روایات مروی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو روایتیں نقل کرتے ہیں۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) لیکن اس فتور کے زمانہ میں انھوں نے کوئی روایت بیان نہیں کی۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ صـ۱۶۱)

[1] ثقہ، ثبت اور حجت تھے۔ (تقریب صـ۴۶)

[2] الامام الحافظ اور الحجۃ تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۱۳۴) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ بڑے متقن تھے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ عجلیؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حجت کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱۰ صـ۳۱۵)

[3] ابو وائلؒ ان کا نام شقیق بن سلمہؒ ہے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں وہ ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے متعلق سوال نہیں ہو سکتا۔ امام وکیعؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً ۴ صـ۳۶۲)

[4] تمام حضرات صحابہ کرامؓ میں فن تفسیر میں حضرت ابن مسعودؓ کے بعد نمبر حضرت عباسؓ کا آتا ہے۔ اور کیوں نہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے ابوزکریا بن ابی اسحاق مزکیؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے ابوالحسن[۱] احمد بن محمد بن عبدوسؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے عثمان بن سعیدؒ[۲] نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے عبداللہ بن صالحؒ[۳] نے بیان کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ اور قرآن کریم کی تفسیر اور تاویل کی مہارت عطا فرما۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۲۸ قال الھیثمی رح رجاله رجال الصحيح مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۷۶ وصححہ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۹۵) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ وہ اعلم الناس بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ایضاً البدایہ جلد ۸ ص ۳۰۰)۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ دین کے امام علم کا سمندر اور بہت بڑے عالم تھے۔ (تذکرہ ۱ ص ۳۷) یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ ایسے محقق اور صاحب بصیرت بھی قرآن کریم کی تفسیر میں ان کی طرف مراجعت کرتے تھے۔ (بخاری ۲ ص ۷۴۳)۔

[۱] علامہ ذہبیؒ انکو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۵) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ادیب مورخ کثیر العلوم تھے اور علاقہ نیشاپور میں علم حدیث کا درس دیتے تھے (بغدادی جلد ۴ ص ۲۳۹) [۲] علامہ سبکیؒ نے طبقات جلد ۲ ص ۹۸ میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبیؒ ان کو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۶۶) [۳] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحجۃ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷۶)

[۴] امام ابن معینؒ انکو ثقہ اور ابوحاتمؒ صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۶) عبدالملک بن شعیبؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابوزرعہؒ انکو حسن الحدیث اور ابن عدیؒ مستقیم الحدیث کہتے ہیں مسلمہ بن قاسمؒ لا بأس بہ کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۹) امام ابن معینؒ نے ان کو ثبت فی کتاب کہا ہے (تہذیب جلد ۵ ص ۲۶۰) یعقوب بن سفیانؒ انکو الرجل الصالح کہتے ہیں (تہذیب جلد ۵ ص ۲۵۹) ابوہارون الخربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوصالحؒ سے اثبت اور کوئی نہیں دیکھا اور ابن القطانؒ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہیں۔ ان پر ایسا کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا جسکی وجہ سے انکی حدیث ساقط الاعتبار ہو۔ ہاں وہ مختلف فیہ ہیں (فحدیثہ حسن) انکی حدیث حسن ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۱) حافظ ابن حجرؒ نے اس کی نشان دہی کی ہے کہ یہ صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ (ایضاً) اور صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۳ میں انکی روایت موجود ہے اور جن حضرات محدثین کرامؒ نے ان میں کلام کیا ہے تو اسکی اصل وجہ ان کا ایک شریر پڑوسی تھا جس کا نام خالد بن نجیح تھا، ابوصالح عبداللہ بن صالحؒ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تہذیب التہذیب (جلد ۵ ص ۲۵۹) وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور امام بخاریؒ نے ادب المفرد اور جزء القراۃ وغیرہ میں ان سے باقاعدہ تعجب کیا ہے فریق ثانی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ محض تعصب کی وجہ سے ایسے مسلّم راویوں کو بھی مجروح اور ضعیف گردانتے کے درپے ہے۔ امام حاکمؒ انکی سند سے ایک حدیث کو صحیح الاسناد اور ذہبیؒ صحیح کہتے ہیں (مستدرک ۲ ص ۱۹۹) اور انکی سند سے ایک روایت کو علامہ ذہبیؒ سندہ قوی کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۶) اور حافظ ابن کثیرؒ انکی سند سے ایک حدیث کو اسناد جید سے تعبیر کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ص و تفسیر جلد ۳ ص ۴۲۸) قاضی مقبول احمد صاحب لکھتے ہیں کہ ابن عدیؒ نے ان کو مستقیم الحدیث کہا

وہ کہتے ہیں مجھ سے معاویہ بن صالح نے بیان کیا۔ وہ علی بن ابی طلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ

عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون یعنی فی الصلوٰۃ المفروضۃ

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اذا قرئ القرآن الآیۃ فرضی نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (کتاب القراۃ صہ)

حضرت ابن عباس کی اس روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس آیت میں استماع اور انصات کا جو حکم آیا ہے وہ شان نزول کے لحاظ سے صرف فرضی نماز کو شامل ہے اور یہی اس کا شان نزول ہے۔ گو غیر فرضی نمازوں (مثلاً نماز عید و تراویح وغیرہ) اور خطبہ کو بھی عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے۔

تنبیہ: علیؒ ابن ابی طلحہ ہاشمیؒ کی براہ راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سماعت نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ حضرت مجاہد بن جبرؒ اور سعید بن جبیرؒ کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں ثقہ ہیں (جیسا کہ اپنے موقع پر ذکر ہوگا) اس لیے یہ روایت بلاشک و شبہ

(پچھلے صفحہ کا باقی) ہے مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ سند اور متن میں غلطی کر جاتا ہے۔ عمداً جھوٹ نہیں کہتا۔ (تہذیب جلد ۵ صہ۲۵۷) اس لیے عبداللہ بن صالح پر شدید جرح موجود ہے۔ اھ مجلہ الاعتصام ۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ء صہ۱ کالم ۲) مگر جمہور محدثین کی تعدیل کے مقابلہ میں صرف ابن عدیؒ کا یہ بیان ادنیٰ جرح بھی نہیں چہ جائیکہ شدید جرح ہو۔

[1] علامہ خطیبؒ ان کو ثقات میں بیان کرتے ہیں (بغدادی جلد ۱۱ صہ۴۲۵) امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن عدیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ۲۰۹) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الفقیہ اور قاضی اندلس لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ صہ۱۶۶) حاکمؒ ان کی سند سے ایک روایت کو صحیح سے (مستدرک ۱ صہ۱۰۹) اور ذہبیؒ حسن الاسناد، اور صالح الاسناد سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صہ۳۵۲ و صہ۳۵۳) بلکہ ذہبیؒ بھی ان کی ایک سند کو صحیح کہتے ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۴ صہ۸) اور سیوطیؒ ان کی سند سے ایک روایت کو اسنادہ صحیح سے تعبیر کرتے ہیں (تاریخ الخلفاء صہ۱) اور مستدرک جلد ۳ صہ۲۳) میں ایک روایت کی سند یوں ہے۔ عبداللہ بن صالح عن معاویۃ بن صالح عن علی بن ابی طلحۃ عن ابن عباسؓ ..... الخ امام حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں فرماتے ہیں صحیح۔

[2] امام نسائیؒ ان کی لیس بہ باس سے توثیق کرتے ہیں (میزان جلد ۲ صہ۲۲۶) ابو داؤدؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح اور معتبر ہے۔ (دیکھیے مزید تحقیق کے لیے میزان الاعتدال ۲ صـ۲۲۸ فتح الباری ۸ صـ۲۴۲ ، تہذیب التہذیب ۷ صـ۳۳۹ ، اور تفسیر اتقان ج ا صـ۱۸۸)

علیؒ بن ابی طلحہؒ کے اس تفسیری صحیفہ کو صحیح اور معتبر سمجھتے ہوئے امام ابو جعفر نحاسؒ نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں استفادہ کیا ہے (اتقان جلد ا صـ۱۸۸) اور اسی صحیفہ سے امام بخاریؒ نے صحیح میں اور امام ابن جریرؒ و ابن ابی حاتمؒ اور امام ابن المنذرؒ وغیرہ نے تفاسیر میں خوشہ چینی کی ہے۔ (فتح الباری جلد ۸ صـ۳۳۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: اما روایت از ابن عباس بطریق مختلفہ آمدہ اجود آنہا طریق معاویہؒ بن صالحؒ از علیؒ بن ابی طلحہؒ از ابن عباسؓ است، بخاری در صحیح خود اعتماد بر ہمیں طریق کردہ پس ہیں۔ اکسیر فی اصول التفسیر صـ۱۱)

مصنف خیر الکلام نے اس سے جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے کہ علیؒ بن ابی طلحہؒ کی ابن عباسؓ سے باقرار مصنف احسن الکلام سماعت نہیں۔ لہٰذا یہ منقطع ہے اور مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیرؒ کا واسطہ تفسیری صحیفہ میں ہے جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ یہ اسی صحیفہ کی روایت ہے۔ تو اتصال ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ لہ اشیاء منکرات۔ (میزان جلد ۲ صـ۲۲۸) اس کے لیے کچھ منکر چیزیں بھی ہیں اور متن کے لحاظ سے اس میں کوئی ذکر نہیں کہ مقتدی کو آیا جہر سے روکا گیا ہے یا کلام کرنے یا شور ڈالنے سے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آیت فرضی نماز جمعہ اور عید سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں نماز کو دوسرے مقامات پر ترجیح نہ ہوگی۔

(محصلہ خیر الکلام صـ۳۴۷ و ۳۴۸)

الجواب:

ہم نے باحوالہ ثابت کیا ہے کہ علیؒ بن ابی طلحہؒ صحیح مسلم کا راوی اور ثقہ ہے اور اس نے مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیرؒ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر حاصل کی ہے اور اسی کو امام حاکمؒ اور ناقد فن رجال علامہ ذہبیؒ وغیرہ صحیح کہتے ہیں جیسا کہ باحوالہ گذر چکا ہے اور ہم نے باحوالہ نواب

(بقیہ پچھلا صفحہ) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ صـ۳۳۹ اور صحیح مسلم جلد ا صـ۲۶۵ میں ان کی روایت موجود ہے۔

صاحبؒ سے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عباسؓ کی روایت کے طرق تو متعدد ہیں مگر اجود ترین طریقہ معاویہؒ بن صالحؒ از علیؒ بن ابی طلحہؒ از ابن عباسؓ ہے اور اسی طریق پر امام بخاریؒ نے اعتماد کیا ہے۔ صحیفہ کی قید مؤلف خیر الکلام کی محض سینہ زاد ہے۔ جس کی پرکاہ بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روایت اصولِ حدیث کے رُو سے بالکل صحیح اور متصل ہے۔ رہا امام احمدؒ کا یہ فرمانا کہ لہ اشیاء منکرات تو بجا ہے لیکن اس کی وجہ ان کا روایت میں ضعف نہیں بلکہ اس لیے کہ

ولکن لہ رأی سوء کان یری السیف (تہذیب التہذیب جلد ۷، صہ۳۴۰)

ان کی رائے اچھی نہ تھی کیونکہ وہ خلیفہ کے مقابلہ خروج کو جائز سمجھتے تھے۔

اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ

ونقل البخاری من تفسیرہ روایۃ معاویۃ بن صالح عنہ عن ابن عباسؓ شیئًا کثیرًا فی التراجم وغیرھا ولکنہ لا یسمیہ یقول قال ابن عباسؓ او یذکر عن ابن عباسؓ وقد وقفت علی السبب الذی قال فیہ ابو داؤد یری السیف اھ (تہذیب التہذیب جلد ۷، صہ۳۴۰)

امام بخاریؒ نے اپنی تفسیر میں معاویہؒ بن صالحؒ عن علیؒ بن ابی طلحہؒ عن ابن عباسؓ کے طریق سے اپنے ابواب کے تراجم وغیرہا میں بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن وہ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ کہدیتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا یا ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے اور میں اس کی وجہ پر مطلع ہو چکا ہوں وہ یہ ہے کہ امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ وہ بادشاہ کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دیتے تھے۔

ان کے ایسے خیالات اشیاء منکرات کی مد میں ہیں اور ایسے راوی جو شیعہ، مرجی اور قدری وغیرہ ہیں صحیحین میں ان کی بے شمار روایتیں موجود ہیں۔ یہ ان کی ضعف کی وجہ نہیں ہے اہل علم سے یہ امر مخفی نہیں ہے اگر ضرورت پڑی تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل عرض کریں گے اور اس ارشاد سے مقتدی کو قرأۃ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ وَاِذَا قُرِیَٔ... الآیۃ اس کا واضح قرینہ ہے۔ باقی جہر اور شور و غل وغیرہ حضرات صحابہ کرامؓ سے جماعتی رنگ میں حضورؐ کے پیچھے نہ ہوتا تھا۔ افراد کا معاملہ الگ ہے اور نماز میں قرأت سے منع کرنا اس آیت کا اولین مصداق ہے کیونکہ جمعہ اور عید وغیرہ کا حکم ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور آیت مکیؔ ہے۔ ہاں ضمنی طور پر وہ بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ بقول مؤلف خیر الکلام شانِ نزول کے حکم میں اس قسم کی وسعت ہوتی ہے۔

دوسری روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے ابوالحسن[1] علی بن محمدؒ بن عبداللہؒ بن بشرانؒ نے بغداد میں بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ابوجعفر[2] محمدؒ بن عمرو الرزازؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے سعدانؒ[3] بن نصرؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے مسکینؒ[4] بن بکیر الحرانیؒ نے بیان کیا۔ وہ ثابتؒ بن عجلانؒ[5] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ سعیدؒ[6] بن جبیرؒ سے اور وہ عبداللہؓ بن عباسؓ سے انھوں نے فرمایا:

المؤمن فی سعة من الاستماع الیه الا فی صلٰوة مفروضة او المکتوبة او یوم جمعة او یوم فطر او یوم اضحٰی یعنی واذا قرئ القراٰن .... الاٰیة

(کتاب القراۃ ص۱۳۷)

کہ آیت واذا قرئ القراٰن کے پیش نظر مومن پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کو گنجائش ہے کہ سنے یا نہ سنے مگر مفروضہ نماز جمعہ، عید الفطر، عید الاضحیٰ کے موقع پر اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(ان حالات میں اس کو بہرحال خاموش رہنا اور استماع و انصات کرنا ضروری ہے)

---

[1] امام خطیبؒ ان کو ثقہ، صدوق، ثبت، حسن الاخلاق اور تام المروۃ لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد۱۲ ص۹۹)

[2] علامہ بغدادیؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد۳ ص۱۳۲)

[3] امام ابوحاتمؒ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد۹ ص۲۰۵)

[4] امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کی لا باس کہتے ہوئے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن عمارؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابوحاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور لا باس بہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ حدیث کے حافظ تھے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ تقریب میں اس کو خطاکار کہا ہے اور امام احمدؒ اور ابو احمدؒ نے اس کو بہت وہمی اور کثیر الخطا کہا ہے۔ (مجلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص۸ کالم ۱) لہٰذا اس حدیث پر کسی طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ (ایضاً)

الجواب۔ ان کا وہم اور خطأ وغیرہ جو کچھ ہے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف سعیدؒ بن عبدالعزیزؒ کی روایت میں ہے۔ چنانچہ خود ابو احمدؒ نے تصریح کی ہے ومن این کان مسکین یضبط عن سعید اھ۔ (تہذیب جلد۱۰ ص۱۲۱) کہ مسکینؒ کو سعیدؒ کی روایت میں ضبط کہاں سے نصیب ہوا؟ اور اس سند میں روایت ثابتؒ بن عجلانؒ سے ہے نہ کہ سعیدؒ سے۔

[5] امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ دحیمؒ اور نسائیؒ لیس بہ باس سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابوحاتمؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد۲ ص۱) [6] ان کا ذکر عنقریب آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباسؓ کی سابق روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول فرضی نماز ہے۔ اور اس روایت میں وہ عموم الفاظ کے پیشِ نظر جمعہ اور عیدین کی نماز اور خطبہ وغیرہ کا حکم بھی استماع وانصات بیان کرتے ہیں اور اس کی پوری تحقیق اپنے مقام پر آئے گی کہ نصوص میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ نہ کہ خصوص اسباب کا۔ اور یہ کہ کوئی آیت شانِ نزول پر مقید نہیں ہوتی۔ اسی طرح کے مضمون کی روایت حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مغفل وغیرہ سے بھی مروی ہے کہ اس آیت کا حکم امام کے پیچھے اقتداء کرنے والوں کو ہے۔ مگر حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے بعد کچھ کہنے کی مطلقاً حاجت باقی نہیں رہتی، کیونکہ قرآنِ کریم کی تفسیر کے متعلق ان کا مقام تمام حضرات صحابہ کرامؓ سے علی الاطلاق بہت اونچا اور بلند ہے اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایتیں سو فی صدی صحیح ہیں جیسا کہ آپ پوری تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ مصنفؒ خیر الکلام سے نہ تو جواب بن سکا ہے اور نہ خاموشی گوارا فرما سکے ہیں کیونکہ "ملا آں باشد کہ چپ نشود"۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض حنفیہ نے آیت کے شانِ نزول میں صحابہ کرامؓ سے صرف دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے۔ دوسرا عبداللہؓ بن عباسؓ کا ہے حالانکہ ابن عباسؓ سے بسند صحیح اور ابن مسعودؓ سے پانچ اسانید کے ساتھ اگرچہ بعض اسانید میں انفرادی طور پر کچھ کلام ہے مگر مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآت خلف الامام کے قائل تھے پس ان دو صحابہؓ سے صرف اس قدر مروی ہونے سے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت نمازی کو قرآت سے روکنے کے لیے ہے۔ (محصلہ خیر الکلام صـ ۳۴۳، صـ ۳۴۴)

الجواب:

روایت تو صرف ایک صحابی کی بھی کافی ہوتی ہے جب کہ سند صحیح ہو آپ کو دو صحابہؓ کی روایت سے کیوں تسلی نہیں ہوتی؟ اور یہ روایتیں صحیح اسانید کے ساتھ ہیں اور رہیں حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے جو فنِ تفسیر میں پہلا درجہ رکھتے ہیں اگر ان کی روایتیں معتبر نہیں تو نہ معلوم آپ کے نزدیک کس کی مروی روایتیں معتبر ہوں گی؟ یقین رکھیے کہ یہ کوئی جواب نہیں ہے ممکن ہے کہ آپ کے حواری ایسے قدرے مطمئن ہو جائیں مگر ایک رتی جان بھی اس میں نہیں ہے باقی حضرت ابن مسعودؓ سے ایک روایت بھی قرآت خلف الامام کے جواز کی ثابت نہیں تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے اور

حضرت ابن عباسؓ کی روایتیں متعارض ہیں۔ صحیح روایت ترک قرأۃ کی ہے جیساکہ ابھی مذکور ہوا اور اپنے مقام پر آگے بھی آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد ہم بعض تابعینؒ کی چند روایات اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر میں قرآن، حدیث اور صحابہؓ کے بعد تابعین کی تفسیر قابلِ حجت ہے اور یہی اکثر ائمہؒ سے منقول ہے۔ خصوصاً مجاہدؒ بن جبرؒ کی تفسیر کیونکہ وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے۔ جب مجاہدؒ کی تفسیر تمہارے پاس پہنچ جائے تو پھر کسی کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اور ان کے بعد سعیدؒ بن جبیرؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ بن ابی رباحؒ، حسن بصریؒ، مسروقؒ، سعیدؒ بن المسیبؒ، ابو العالیہؒ، ربیعؒ بن انسؓ، قتادہؒ اور ضحاکؒ بن مزاحمؒ وغیرہ کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص۱۲)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: وھکذا تفسیر التابعی حجۃ (الجنہ ص۹۶) صحابی کی طرح تابعی کی تفسیر بھی حجت ہے۔

حضرت مجاہدؒ[1] بن جبرؒ: (المتوفی ۱۰۲ھ) سے

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ[2]ؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہہ، عالم، ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ (طبقات ابن سعد ۵ ص۳۴۴) امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۸۰) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ خصیفؒ کا بیان ہے کہ مجاہدؒ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۸۰) حبر الامت حضرۃ ابن عمرؓ ان کے حفظ کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے کہ کاش نافعؒ کا حفظ تمہارے ہی طرح ہوتا (شذرات الذہب جلد ۱ ص۱۲۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ التابعین والمفسرین تھے اور حضرت ابن عباسؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور اپنے زمانہ میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ ص۲۲۴) اور ان کے فقہی کمال کے لیے یہ سند کافی ہے۔ کہ مخزنِ علوم مکہ کی جماعت افتاء کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص۳۶) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: ابن تیمیہؒ گفتہ اعلم الناس بالتفسیر اہل مکہ لانہم اصحاب عبد اللہ بن عباسؓ کمجاھد۔ آگے لکھتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ اور دیگر اہلِ علم نے ان کی تفسیر پر کلی اعتماد کیا ہے (اکسیر ص۱۱)

[2] یہ وہی امام ہیں جن کو الحاکم کہتے ہیں اور جن کی کتاب مستدرک شائع ہو چکی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہم سے حافظ ابو علی حسینؒ بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یعلیٰؒ موصلیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یحیٰیؒ بن سعیدؒ نے بیان کیا۔ وہ سفیانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو ہاشم اسمٰعیلؒ بن کثیر مکیؒ نے بیان کیا۔ وہ مجاہد بن جبرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ اذا قرئ القرآن فاستمعوا له قال فی الصلوٰۃ۔ (کتاب القرأۃ ص ۷۳) و اذا قرئ القرآن .... الاٰیۃ

دوسری روایت:

امام بیہقیؒ سے لے کر محمدؒ بن ابو بکر مقدمی تک وہی سند ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے اشعثؒ بن عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ الکبیر اور امام المحدثین تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۷)

۱؎ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اتقان، ورع، مذاکرۂ ائمہ اور کثرت تصنیف میں گوے سبقت لے گئے تھے (بغدادی جلد ۸ ص ۱) ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور محدث اسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۱۰)۔

۲؎ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقہ اور محدث جزیرہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۶)

۳؎ امام یحیٰی بن سعید القطانؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم رحؒ ان کو صالح الحدیث اور ابن قانعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷۹)

۴؎ امام الجرح والتعدیل ذہبیؒ ان کو الامام العلم اور سید الحفاظ لکھتے ہیں۔ نسائیؒ فرماتے ہیں کہ مالکؒ، شعبہ اور یحیٰیؒ بن سعیدؒ حدیث رسول کے امین تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۴) علامہ ابن سعد رحؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، ثبت، حجت، بلند مرتبہ اور مامون تھے۔ خلیلیؒ کہتے ہیں وہ بلا کسی اختلاف کے مسلم امام تھے (تہذیب ۱۱ ص ۲۱۹)

۵؎ امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۶؎ امام احمدؒ، نسائیؒ، یعقوبؒ بن شیبہ، یعقوبؒ بن سفیانؒ اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صاحب الحدیث کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۶)

۷؎ امام ابن معینؒ اور ابو داؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لا باس بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۶)

شعبہؒ نے بیان کیا وہ حمیدؒ اعرجؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے واذا قرئ القرآن فاستمعوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب القرأۃ ص۷۲) انھوں نے فرمایا کہ واذا قرئ القرآن کا شان نزول نماز ہے۔

تیسری روایت:

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے قاضی عبدالرحمٰنؒ بن حسنؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے آدمؒ بن ابی ایاسؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ورقاءؒ نے بیان کیا۔ وہ ابن ابی نجیحؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے

قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الصلوٰۃ فسمع قرأۃ فتی من الانصار فنزل و اذا قرئ القرآن (الآیۃ)

وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرآت کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک انصاری بھی پڑھتا رہا۔ اس پر اذا قرئ القرآن الآیۃ نازل ہوئی۔

(کتاب القرأۃ ص۷۲)

۱؎ ذہبیؒ ان کو الحجۃ، الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۸۱) سفیان ثوریؒ ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے تھے۔ (کتاب العلل امام ترمذی جلد ۲ ص۲۳۸)

۲؎ امام ابن معینؒ، ابو زرعہؒ، ابو داؤدؒ، ابن خراشؒ، عجلیؒ اور بخاریؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۴۷)

۳؎ امام حاکمؒ نے اس سند سے (مستدرک جلد ۲ ص۴۵، ۴۶، ۲۵۹، ۲۶۰، ۵۲۱، ۳۵۳، ۲۷۶۔ وجلد ۳ ص۳۱۴، جلد ۴ ص۱۷۷ وغیرہ میں) چند حدیثیں نقل کی ہیں اور ہر مقام پر امام حاکمؒ اور ذہبیؒ ان کو صحیح کہتے ہیں اور ایک مقام پر حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں علی شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں۔

۴؎ ورقاءؒ، امام احمدؒ ابن معینؒ اور وکیعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ورقاءؒ کی تفسیر شیبانؒ اور سعیدؒ سے زیادہ معتبر ہے کیونکہ ورقاء ابن ابی نجیحؒ سے اور وہ مجاہدؒ سے تفسیر روایت کرتے ہیں اور وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۱۱۴)

(نمبر ۵ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرآۃ کرنا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں معمول نہ تھا۔ ورنہ صرف ایک ہی انصاری کے پڑھنے کا کیا مطلب ہے اور جب حکم نازل ہوا تو نہ پڑھنے والوں کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ منع کیا تو پڑھنے والے ہی کو منع کیا اور آیت کا شان نزول بھی حضرت مجاہدؒ نے وضاحت سے بیان فرما دیا ہے اور اسی مضمون کی ایک روایت امام زہریؒ سے بھی منقول ہے۔ (کتاب القرأت صہ)

حضرت امام بیہقیؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس اثر کو منقطع کہہ کر گلو خلاصی کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جو بے سود ہے۔ اوّلاً[۱] اس لیے امام ابن مدینیؒ فرماتے ہیں: کہ مجاہدؒ کا مرسل عطاء کے مرسل سے مجھے کہیں زیادہ پسند ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ ۴۲)

امام یحییٰؒ بن سعید القطانؒ کہتے ہیں: مجاہدؒ کا مرسل مجھے طاؤسؒ کے مرسل سے زیادہ پسند ہے۔ (تدریب الراوی صہ ۶۳ و کتاب العلل ترمذی صہ ۳۲۹) جب ائمہ جرح و تعدیل ان کے مرسل پر کامل اعتماد کرتے ہیں۔ تو نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

وثانیاً[۲] علماء احناف کے نزدیک اور جمہور اہل اسلام اور دوسری صدی سے قبل تمام محدثین کرامؒ کے نزدیک تنہا مرسل قابل حجت ہوتا ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ اور جب دوسری روایات سے (گو مرسل ہی کیوں نہ ہوں) وہ معتضد اور قوی ہو جائے تو فریق ثانی کے نزدیک بھی وہ حجت ہے۔ اور مبارک پوری صاحبؒ کو اس کا اقرار ہے (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۱ صہ ۹۱) اور اگر حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ وغیرہ کی صحیح روایات سے بھی[۱] انقطاع کا یہ بہانہ رفع

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ ۵) ابن ابی نجیح رحمہ، امام احمدؒ، ابو زرعہؒ، ابن معینؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام سفیانؒ اور ابو حاتمؒ ان کی تفسیر کی بڑی قدر کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ ۵۴)

[۱] جو پہلے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں جن کا استدلالی رنگ نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے صہ ۳۵ میں) ناکام بہانہ کیا ہے۔ حضرت مجاہدؒ اور ان دونوں حضرات صحابہؓ کے اثر میں شان نزول ہونے کے بارے میں کوئی فرق نہیں ہے اور جمہور حضرات صحابہؓ ان کے ساتھ ہیں جیسا کہ ان کا مرسل حجت ہے اسی طرح ان کی تفسیر بھی حجت ہے اور کسی صحیح روایت سے ان کا قرآۃ خلف الامام کرنا ثابت نہیں ہے۔ جزء القرآۃ صہ ۹ کا حوالہ بالکل بے سند ہے۔ اس لیے اس کو اس صحیح اور مسند روایات کا جواب تصور کرنا بے سود ہے۔

نہ ہو۔ تو کسی دوسرے جہان اور دوسری جون کی انتظار کیجیے۔

وثالثاً امام شافعیؒ، بخاریؒ، ابن تیمیہؒ وغیرہ کلی طور پر مجاہدؒ کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں اور نواب صاحبؒ کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ان کا یہ عذر بارد اور رکیک تاویل قابل سماعت نہیں ہے حضرت مجاہدؒ کی اور بھی متعدد روایات باسانید صحیحہ مروی ہیں مگر ہم صرف ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں: وفیھا کفایۃ لمن لہ ھدایۃ۔

حضرت سعیدؒ[1] بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلی الموصلیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الرحمٰنؒ[2] بن مہدیؒ

---

[1] امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن حبانؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ صفحہ ۲۲۰)۔ حافظ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور اجلہ تابعینؒ میں لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۴۸) ابن حمادؒ لکھتے ہیں کہ ان کی ذات میں حدیث، فقہ، زہد و ورع اور عبادات اور جملہ علمی و عملی کمالات جمع تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ صفحہ ۱۰۳) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ علی الاطلاق وہ سید التابعین تھے اور حضرت ابن عمرؓ ان کو احد المتقین کہتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صفحہ ۹۹)

امام یحییٰؒ بن سعیدؒ فرمایا کرتے تھے۔ ہم قرآن کی تفسیر میں رائے کو دخل نہیں دیتے صرف وہی کہہ سکتے ہیں۔ جس کا ہمیں علم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۹) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کے تمام مراسیل صحیح ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۵۱) امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ تمام مراسیل میں صحیح تر مراسیل ان کے ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث صفحہ ۲۵) امام بیہقیؒ ان کے مراسیل کو اصح المراسیل کہتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۴۲۱) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مراسیل میں سے صحیح ترین مرسل سعیدؒ بن المسیبؒ کا ہے (توجیہ النظر صفحہ ۱۶۶) امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مراسیل صحیح ترین ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم صفحہ ۳۶) امام شافعیؒ باوجودیکہ وہ دیگر تابعینؒ کے مراسیل میں کلام کرتے ہیں مگر حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح وہ سعیدؒ بن المسیبؒ کے مرسل کو حجت اور صحیح مانتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم صفحہ ۳۶)

[2] ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر الامام العلم اور الشہیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۳۰۱) علیؒ بن المدینیؒ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ اگر میں رکن حطیم اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر قسم کھاؤں تب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے ان جیسا یا ان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات صفحہ ۳۵۵ و تہذیب الاسماء جلد ۱ صفحہ ۳۰۵) علامہ سمعانیؒ لکھتے ہیں کہ پختہ کار حافظ صاحب تقویٰ اور جامع حدیث تھے۔ (کتاب الانساب صفحہ ۲۹۶)

نے بیان کیا۔ وہ حمادؒ بن سلمہؒ[1] سے روایت کرتے ہیں اور وہ قتادہؒ[2] سے اور وہ سعیدؒ بن المسیبؒ سے وہ فرماتے ہیں واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب القرأۃ ص ۷۵) کہ آیت واذا قرئ القرآن الآیۃ کا شانِ نزول نماز ہے۔

حضرت حسن بصریؒ[3] (المتوفی سنہ ۱۱۰ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا وہ بیان کرتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ موصلیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، المحدث اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۹) آخر میں ان کے حافظہ میں معمولی فتور آ گیا تھا۔ (تقریب ص ۱۰۱) لیکن اس سے ان کی حدیث اور روایت پر مطلقاً اثر نہیں پڑتا۔ اس کی مزید تحقیق اپنے مقام پر آئے گی، امام احمدؒ فرماتے ہیں جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ حمادؒ بن سلمہؒ کے حق میں کچھ کہتا ہے تو اس کو منافق سمجھنا (فاتہمہ علی الاسلام) (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۰) یہی الفاظ امام ابن معینؒ سے بھی منقول ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۴) نواب صاحب لکھتے ہیں؛ گو یہ حمادؒ بن سلمہؒ امام است تفرد ش مادام کہ در مرویش مانع از اصول نبود مضر نیست۔ (بدور الاہلہ ص ۳۳)

[2] حضرت قتادہؒ کا ترجمہ جلد ۱ ص ۲۲۵ میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

[3] علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ جامع کمالات عالم بلند مرتبت رفیع المنزلت، فقیہ مامون عابد زاہد وسیع العلم فصیح و بلیغ، حسین اور جمیل تھے۔ (طبقات جلد ۷ ص ۱۱۵) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا سمندر، فقیہ النفس کبیر الشان عدیم النظیر اور بلیغ التذکیر تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۲) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی جلالتِ شان پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۶۱) ابو بکر الہذلیؒ کا بیان ہے کہ جب تک وہ ایک سورت کی تفسیر اور شان نزول وغیرہ سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کر لیتے تھے۔ اس وقت تک آگے نہ پڑھتے تھے۔ (شذرات جلد ۱ ص ۱۳۷) فقہ کے بہت بڑے امام تھے اور بصرہ کے مفتی اعظم تھے۔ قتادہؒ کا بیان ہے کہ حسن بصریؒ حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۷ ص ۱۱۸ قسم اوّل) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام الفقیہ المشہور احد التابعین الکبار، الاجلاء، اور علم و عمل اور اخلاص میں یکتا تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۶۸) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں۔ حسن بصریؒ و محمدؒ بن کعب القرظیؒ و ابو العالیہ الریاحیؒ وغیرہ ایں ہمہ قدمائے مفسرین اند و غالب اقوال ایشاں متلقّٰی از صحابہؓ بودہ است۔ (اکسیر ص ۱۱)

کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یوسفؒ[1] بن یعقوبؒ نے بیان کیا وہ شعبہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ منصورؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت حسن بصریؒ سے۔ انھوں نے فرمایا: واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا فی الصلوٰۃ۔ (کتاب القراۃ صہ ۸۵) کہ واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول نماز ہے۔

حضرت ابو العالیہؒ[2] الریاحیؒ (نام رفیعؒ بن مہرانؒ تھا۔ المتوفی ۹۳ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ (موصلیؒ) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الوہابؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ مہاجرؒ[4] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو العالیہ الریاحیؒ سے، انھوں نے فرمایا:

---

[1] امام ابن معینؒ، ابو داؤدؒ، یعقوب بن شیبہؒ اور خلیلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو شیخ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صہ ۴۱۳) باقی جملہ روات کی توثیق پہلے نقل کی جا چکی ہے۔

[2] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعینؒ میں تھے۔ ابو القاسم طبریؒ کا بیان ہے کہ ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ا صہ ۲۵۱) ابو بکرؒ بن ابی داؤدؒ کا بیان ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بعد ابو العالیہؒ سے بڑھ کر عالم قرآن کوئی نہ تھا۔ (تذکرہ جلد ا صہ ۵۸) ابن حمادؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں (شذرات جلد ا صہ ۱۰۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۷ صہ ۸۵) خود امام بیہقیؒ اُن کی قہقہہ فی الصلوٰۃ کی حدیث کے علاوہ باقی تمام احادیث کو صحیح اور مستقیم تسلیم کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ا صہ ۱۴۷) امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کبار تابعینؒ میں تھے۔ امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث ضحک فی الصلوٰۃ کے علاوہ ابو العالیہؒ کی باقی تمام احادیث مستقیم اور صالح ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صہ ۲۸۵) مولیٰ طاش کبری زادہؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعینؒ میں تھے، آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات سے صرف دو سال بعد مسلمان ہوئے تھے اور حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور قرآن کریم حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے پڑھا تھا اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ تین مرتبہ انھوں نے قرآن کریم حضرت عمرؓ پر پیش کیا تھا۔ (مفتاح السعادۃ جلد ا صہ ۳۹۴) اور اسی کے قریب تہذیب التہذیب جلد ۳ صہ ۲۸۴ میں ہے۔

(نمبر ۳ اور نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی قرأ فقرأ اصحابہ فنزلت فاستمعوا لہ الآیۃ فسکت القوم وقرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (کتاب القرأۃ ص۷۷)	کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تو ساتھ ساتھ آپ کے حضرات صحابہؓ بھی قرآت کرتے تھے۔ جب واذا قریٔ القرآن (الآیۃ) نازل ہوئی تو حضرات صحابہ کرامؓ نے خاموشی اختیار کرلی اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرآۃ کیا کرتے تھے۔

امام بیہقیؒ علامہ حازمیؒ (المتوفی ۵۸۴ھ) اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس روایت کے منقطع ہونے کا ناکام بہانہ کیا ہے اور یہی کچھ مؤلف خیر الکلام نے ص۵۵ ۳ میں کہا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اولاً: اس لیے کہ مرسل حجت ہے اور مرسل معتضد بلا اختلاف حجت ہے جیسا کہ بیان ہوچکا ہے۔

وثانیاً: اگر اس کو ابوالعالیہؒ کی تفسیر بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں جس کی تائید کئی محقق مفسرین کرامؒ سے آگے آرہی ہے۔ خود مؤلف خیر الکلام ص۵۱ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مگر معترض کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی آیت کی تفسیر اگر کسی تابعی سے ثابت ہو اور ایک بڑے مفسر نے بھی اس کی تصدیق کی ہو اور کسی صحابی اور تابعی سے اس کی تردید وارد نہ ہوتی ہو تو اس کی صحت میں کیا کلام ہوسکتا ہے؟ اور اسی صفحہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ایک تفسیر کے مقابلہ میں محض اٹکل پچو بات بنانا درست نہیں۔ لہٰذا ان کو اپنے تجویز کردہ نسخہ پر عمل کرنا چاہیے کہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔

حضرت امام زہریؒ[۱]:

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابوعبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

---

[۵۴] ان کا ترجمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی ذیل میں نقل کردیا گیا ہے۔

[۵۵] مہاجر بن مخلد کو امام ابن معینؒ صالح کہتے ہیں۔ محدث ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ اور نیز کہتے ہیں کہ وہ معروف ومشہور تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۳۲۳) باقی رواۃ کا حال اور توثیق آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

[۱] امام زہریؒ اور امام عبداللہ بن مبارکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں عرض کیا جاچکا ہے اور بقیہ رواۃ کا عنقریب گزرچکا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حسنؒ بن سفیانؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حبانؒ بن موسیٰؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبداللہؒ بن مبارکؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یونسؒ نے بیان کیا وہ امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ

قال لا یقرأ من وراء الامام فیما یجھر بہ الامام یکفیھم قرأۃ الامام وان لم یسمعھم صوتہ ولکنھم یقرأون فیما لا یجھر بہ سراً فی انفسھم ولا یصلح لاحد خلفہ ان یقرأ معہ فیما جھر بہ سراً ولا علانیۃ قال اللہ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون (کتاب القرأۃ ص۵)

امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدیوں کو قرآت کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ امام کا پڑھنا ہی مقتدیوں کو کافی ہے۔ چاہے وہ مقتدیوں کو کچھ بھی نہ سناتا ہو ان کو نہ تو جہر سے پڑھنا جائز ہے اور نہ آہستہ۔ ہاں سری نمازوں میں وہ اپنے دل میں قرآت کر سکتے ہیں اور جہری نمازوں میں اس لیے منع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہو تو تم خاموش ہو کر اس کی طرف توجہ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

سری اور جہری نمازوں کا بیان اپنی جگہ پر ہو گا۔ لیکن بہر حال امام زہریؒ بھی آیت مذکورہ کا شان نزول مسئلہ قرأۃ خلف الامام بتاتے ہیں۔ سکتات میں پڑھنے کا کسی صحیح حدیث سے ثبوت نہیں اور یہ استدلالی رنگ نہیں بلکہ شانِ نزول ذکر ہو رہا ہے۔ مرسل زہریؒ اگرچہ تنہا حجت نہیں ہوتا مگر اس سے دیگر مراسیل کی تائید مطلوب ہے اور دوسرے مراسیل کے ساتھ مل کر یہ مرسل مسئلہ زیر بحث پر صراحت سے روشنی ڈالتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا باقی) صرف تین راوی باقی ہیں۔ ان کی توثیق سن لیجئے۔ حسنؒ بن سفیانؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الامام اور شیخ خراسان لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ خراسان کے محدث اور اپنے تمام معاصرین پر تثبت، کثرت روایت فہم، فقہ، ادب اور دیگر علوم میں فائق تھے۔ (تذکرہ ۲ ص۲۴۵) — حبانؒ بن موسیٰؒ، ابراہیمؒ بن الجنیدؒ ان کی لا بأس بہ سے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۱۷۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص۶۸) یونسؒ بن یزیدؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثبت لکھتے ہیں۔ اور احمدؒ بن صالحؒ کا بیان ہے کہ ہم امام زہریؒ کے تلامذہ میں یونسؒ کو ترجیح نہیں دیتے۔ امام احمدؒ فرماتے تھے کہ وہ ثقہ ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۳)

عبیدؒ بن عمیرؒ (المتوفی ۷۴ھ) اور عطاؒ بن ابی رباحؒ (المتوفی ۱۱۴ھ):

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں ہم سے حمیدؒ بن مسعدہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے بشرؒ بن المفضلؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے جریریؒ نے بیان کیا۔ وہ طلحہؒ بن عبیدؒ بن کریزؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں نے عبیدؒ بن عمیرؒ اور عطاؒ بن ابی رباحؒ کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ حالانکہ ایک واعظ وعظ کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ ذکر کیوں نہیں سنتے اور کیوں وعید کے مستوجب ہو رہے ہیں؟ لیکن ان دونوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر کہا۔ انھوں نے پھر میری طرف دیکھا اور باتوں میں مشغول ہو گئے میں نے سہ بارہ ان سے کہا۔ مگر ان دونوں نے کہا:

انما ذالک فی الصلوٰۃ یعنی واذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا (الآیۃ) (تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص۱۶۳ و ابن کثیر ج ۳ ص۲۸۱) یعنی جو آیت واذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا تمہارے پیش نظر ہے۔ اس کا شان نزول نماز ہے نہ کہ وعظ و عام تلاوت۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے باتیں کرنا اور قرأت کرنا ممنوع ہے کیونکہ یہ استماع وانصات کے خلاف ہے اور اس آیت کریمہ کا شان نزول ہی نماز ہے۔ خارج از نماز باتوں کو یہ شامل نہیں ہے۔

---

[۱] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ عالم، واعظ اور کبیر القدر تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۴۸) امام ابن معینؒ اور ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو ثقہ من کبار التابعینؒ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص۷۱)

[۲] ذہبیؒ ان کو مفتی اہل مکہ اور محدث، القدوہ اور العلم لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۹۲) ابن حبانؒ ان کو علم فقہ ورع اور فضیلت میں تابعینؒ کے سردار لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو ثبت، حجۃ، امام اور کبیر الشان لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص۲۰۳) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار اور ثقات و بلند پایہ تابعینؒ میں تھے۔ دو سو۲۰۰ صحابہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ نیز ابن سعدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ثقہ، فقیہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۳۰۶)

[۳] ابوحاتمؒ ان کو صدوق اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۴۹)

[۴] امام ذہبیؒ ان کو الامام، الثقہ، الحافظ اور العابد کہتے ہیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بصرہ میں تثبت ان پر ختم تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۲۴۲)

(باقی نمبر ۵ و ۶ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

حضرت محمدؒ بن کعب القرظیؒ (المتوفی ۱۸۸ھ):

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے ابو نصر عمرؒ بن عبدالعزیزؒ بن عمرؒ بن قتادہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو منصورؒ عباس بن فضل نضروی نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے احمدؒ بن نجدہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے سعیدؒ بن منصورؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو معشرؒ نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن کعب (القرظیؒ) سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرامؓ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ جب آپ قرأت کرتے تھے تو وہ بھی ساتھ ساتھ قرأت

(نمبر ۵ وہ پچھلے صفحہ کے حاشیہ) ؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۱۴۶)

؎ امام احمدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص۲۲)

؎ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ علم و فقہ میں مدینہ کے فاضل ترین علماء میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۴۲۱) امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ وہ بڑے اور ائمہ تابعین میں تھے (تہذیب الاسماء جلد ۱ قسم اوّل ص۹۰) حافظ عجلیؒ ان کو ثقہ، رجل صالح اور عالم قرآن کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ، عالم اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ عونؒ بن عبداللہؒ کا بیان ہے کہ میں نے تفسیر قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ ص۲۰۴ و تہذیب التہذیب، جلد ۹ ص۴۲۱)۔ علامہ ذہبیؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں۔ (دول الاسلام جلد ۱ ص۵۶) حافظ ابن کثیرؒ ان کو عالم تفسیر قرآن، صالح اور عابد لکھتے ہیں۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ ص۲۵۷) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی تھی کہ بنو قریظہ میں ایک شخص پیدا ہوگا جو فن تفسیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا ہوگا۔ ائمہ کا خیال ہے کہ یہ محمدؒ بن کعب قرظیؒ کے حق میں تھی۔ (البدایۃ جلد ۹ ص۲۱۴)۔ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں: مدینہ طیبہ میں محمدؒ بن کعبؒ کے بعد زیدؒ بن اسلمؒ جیسا مفسر قرآن کوئی اور نہ تھا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۱۷)

؎ امام بیہقیؒ کے شیخ ہیں۔ ان کی سند سے ایک حدیث کی امام بیہقیؒ تصحیح کرتے ہیں (دیکھیے سنن الکبریٰ ج۲ ص۱۶۹)

؎ ثقہ اور مشہور تھے (تقریب ص۱۹۱) ؎ امام دارقطنیؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان پر کسی کی جرح منقول نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۵۵) ؎ ابو حاتم ان کو ثقہ من المتثبتین الاثبات کہتے ہیں۔ ابن نمیرؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ خلیلیؒ کہتے ہیں ان کے ثقہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص۸۹-۹۰) ؎ ابو معشرؒ کو بعض محدثینؒ روایت حدیث

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کرتے جاتے۔ اس پر سورۂ اعراف کی یہ آیت نازل ہوئی:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الآیۃ) (کتاب القرأۃ صنے) کہ جب قرآن کریم کی قرأت کی جاتی ہو تو تم توجہ کرو اور خاموش رہو۔

حدیث مرسل:

مرسل حدیث سے احتجاج اور عدم احتجاج کی بحث اسی کتاب میں آگے اپنے مقام پر آ رہی ہے (انشاء اللہ تعالیٰ) یہاں بقدر ضرورت تھوڑی سی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ بات ذرا واضح ہو جائے اور یہ حوالے آگے ذکر نہ کیے جائیں گے تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔ امام سیوطیؒ علامہ قاسمؒ بن قطلوبغاؒ محدث جزائریؒ اور مولانا عثمانیؒ نقل کرتے ہیں:

کمزور سمجھتے تھے۔ مگر امام احمدؒ ان کو صالح محلہ الصدق کہتے تھے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں۔ ان سے حدیثیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو صدوق فی الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کہتے ہیں ان سے بڑے بڑے ثقات نے روایات کی ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص۲۲۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۴۲۰) امام نعیمؒ ان کو کیس اور حافظ کہتے ہیں (تہذیب ص۴۲۰) علامہ ذہبیؒ ان کو علم کا ظرف لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (تذکرہ جلد ۱ ص۲۱۶) حافظ ابن حجرؒ ان کو ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی بتاتے ہیں (تہذیب جلد ۱۰ ص۴۱۹) ان کے متعلق یہ اختلاف صرف روایت حدیث کے بارے میں ہے فن تفسیر میں وہ بلا اختلاف اور بلا مدافعت مسلم امام تھے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن عثمان بن ابی شیبہؒ، امام علی بن المدینیؒ اور عمرو بن علی الفلاسؒ وغیرہ ائمہ کہتے ہیں کہ ابو معشرؒ کی وہ روایات جو تفسیر کے سلسلہ میں ہیں اور خاص طور پر وہ جو محمد بن قیسؒ اور محمد بن کعبؒ سے نقل کرتے ہیں۔ وہ بلا چون و چرا صحیح، معتبر اور قابل حجت ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۴۲۰ و ص۴۲۱ محصلہ) مبارک پوری صاحبؒ نے ان کی جو تضعیف نقل کی ہے وہ ان کے لیے چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ محدثین جب ان کو کمزور کہتے ہیں تو صرف روایت حدیث کے بارے میں اور ہم نے جو روایت نقل کی ہے وہ تفسیر کے بارے میں ہے اور خاص طور پر محمد بن کعب قرظیؒ سے ہے اور ان کی روایت کو اس مد میں بلا قیل و قال محدثین تسلیم کرتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق محدثین کی جرح تو نقل کر دی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۵۹) مگر تفسیر کے بارے میں ان کی روایت کے قابل اعتبار ہونے کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے اور لکھتے ہیں کہ جب حدیث کو محدثینؒ کی شرائط کے مطابق محمد بن کعبؒ سے بیان کریں ان سے چند

وقال ابن جریر اجمع التابعون باسرھم علی قبول المرسل ولم یأت عنھم انکارہ ولا عن احد من الائمۃ بعدھم الی رأس المائتین قال ابن عبد البرؒ کانہ یعنی الشافعیؒ اول من ردہ اھ (تدریب الراوی صنہ۱۲ منیۃ الالمعی ص۲ توجیہ النظر ص۲۲۵ ومقدمہ فتح الملہم ص۳۴)

امام ابن جریرؒ نے فرمایا کہ تابعینؒ سب کے سب اس امر پر متفق تھے کہ مرسل قابل احتجاج ہے تابعین سے لے کر دوسری صدی کے آخر تک ائمہ میں سے کسی نے مرسل کے قبول کرنے کا انکار نہیں کیا۔ امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ گویا امام شافعیؒ ہی پہلے وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مرسل کے ساتھ احتجاج کا انکار کیا ہے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ دوسری صدی کے آخر تک تابعینؒ اور ائمہ دینؒ میں سے کوئی بھی مرسل حدیث سے احتجاج کا منکر نہ تھا۔ تعجب ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک یہ اجماع تو حجت نہیں لیکن دوسری صدی کے بعد کا نظریہ قابل قبول ہے اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اور امت کی اکثریت کا لحاظ قرن اول میں لیا جائے گا ...... الخ ص۵۳۱)

الحمد للہ تعالیٰ کہ قرن اول والے مرسل کو بلا قیل وقال تسلیم کرتے تھے۔ اور اس پر ان کا اجماع ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اور علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں:

حدیثیں صالح پائی گئی ہیں ...... الخ مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محدثین کرامؒ ہی ان کی: محمد بن کعبؒ سے روایتوں کو صالح کہتے ہیں اور یہ بھی انہیں میں سے ہے اور بالکل صالح ہے اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنے کے سلسلے میں ہے قرأت ہو یا کلام ہو جہر ہو یا آہستہ اور اس کا شان نزول ہی یہ بتاتے ہیں۔ قاضی مقبول احمد صاحب کو بلا وجہ غصہ آ گیا ہے کہ اس کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہیں اور مصنف احسن الکلام خود لکھتا ہے کہ جس کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہیں اس سے روایت نہیں لی جا سکتی۔ (محصلہ الاعتصام ، ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء) لیکن محدثینؒ نے ان کی تفسیر کی روایت کو اور اسی طرح تاریخی روایت کو حجت مانا ہے۔ تفسیر کے بارے میں تو حوالہ گزر چکا ہے تاریخ کے متعلق سنیے۔ امام خلیلیؒ فرماتے ہیں:

وتاریخہ احتج بہ الائمۃ وضعفوہ فی الحدیث اھ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۴۲)

اور ان سے تاریخ میں ائمہ نے احتجاج کیا ہے اور حدیث میں اس کو ضعیف سمجھا ہے جیسا کہ محمد بن اسحاقؒ کہ حدیث احکام میں ضعیف ہے مگر مغازی کا امام ہے۔ اس کے احادیث احکام میں ضعیف ہونے سے اس کے تاریخ میں معتبر ہونے پر کیا زد پڑتی ہے؟ فکذا ھذا۔

واما المراسیل فقد کان یحتج بھا العلماء فیما مضیٰ مثل سفیان الثوریؒ ومالکؒ والاوزاعیؒ حتیٰ جاء الشافعیؒ فتکلم فیہ اھ

مراسیل کے ساتھ گذشتہ زمانہ میں علماء احتجاج کیا کرتے تھے، مثلاً امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ جب امام شافعیؒ آئے تو انھوں نے مرسل کی حجیت میں کلام کیا۔

(الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ص۲۴۵ وتوجیہ النظر)

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ

فاذا لم یکن مسند ضد المرسل ولم یوجد مسند فالمرسل یحتج بہ ولیس ھو مثل المتصل فی القوۃ۔

(رسالہ ابوداؤد، ص۵)

جب مرسل کے خلاف کوئی مسند حدیث موجود نہ ہو اور مسند اس باب میں نہ پائی جائے تو مرسل حجت ہوگی مگر متصل کی طرح قوی نہ ہوگی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ مراسیل سے احتجاج اور عدم احتجاج کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

واما المراسیل قد تنازع الناس فی قبولھا وردھا واصح الاقوال ان منھا المقبول والمردود ومنھا الموقوف فمن علم من حالہ انہ لا یرسل الا عن ثقۃ قبل مرسلہ ومن عرف انہ یرسل عن الثقۃ وغیر الثقۃ کان ارسالہ روایۃ عن من لا یعرف حالہ فھذا موقوف وما کان من المراسیل مخالفاً لما رواہ الثقات کان مردوداً واذا کان المرسل من وجھین کل من الراویین اخذ العلم عن شیوخ اخر فھذا یدل علی صدقہ

بہر حال مراسیل کے قبول اور رد کرنے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے اور صحیح تر قول یہ ہے کہ مراسیل میں مقبول و مردود اور موقوف سبھی اقسام ہیں سو جس کے حال سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہے تو اس کا مرسل قبول کیا جائے گا اور جو ثقہ اور غیر ثقہ سب سے ارسال کرتا ہے اور جس سے اس نے حدیث مرسل روایت کی ہے۔ اس کا علم نہیں تو ایسی مرسل حدیث موقوف ہوگی اور جو مراسیل ثقات کی روایت کے خلاف ہوں تو وہ مردود ہوں گے اور جب مرسل دو طریقوں سے مروی ہو ایک مرسل الگ شیوخ سے اور دوسرا الگ سے

فان مثل ذلك لا یتصور فی العادة تماثل الخطأ فیہ وتعمد الکذب اھ (منہاج السنۃ جلد ۴ ص۱۱۷)

تو یہ اس کے صدق پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عادتاً اس میں خطا اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

امام نوویؒ پہلے ان حضرات کا ذکر کرتے ہیں جو مرسل کو قابل استدلال نہیں گردانتے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

ومذهب مالك وابی حنیفة واحمدؒ واکثر الفقهاء انه یحتج به ومذهب الشافعی انه اذا انضم الی المرسل ما یعضده احتج به وذلك بان یروی مسنداً او مرسلاً من جهة اخری او یعمل به بعض الصحابةؓ او اکثر العلماء اھ (مقدمہ نووی برشرح مسلم ص۱۷)

امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ مرسل قابل احتجاج ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر مرسل کے ساتھ کوئی تقویت کی چیز مل جاتے تو وہ حجت ہوگا مثلاً یہ کہ وہ مسنداً بھی مروی ہو یا دوسرے طریق سے وہ مرسل روایت کیا گیا ہو یا بعض حضرات صحابہ کرامؓ یا اکثر علماء نے اس پر عمل کیا ہو

حضرت امام شافعیؒ نے یہ بحث اپنی کتاب الرسالۃ فی اصول الفقہ ص۶۳ طبع بولاق میں کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ مرسل معتضد کے حجت ہونے کے امام موصوفؒ بھی قائل ہیں اور اس کی ان کے نزدیک چند شرطیں ہیں جن کا اختصار کے ساتھ امام نوویؒ نے تذکرہ فرمایا ہے ایک شرط یہ ہے کہ

وزاد فی الاعتضاد ان یوافق قول صحابی او یفتی اکثر العلماء بمقتضاه ..... الخ (تدریب الراوی ص۱۲۱)

امام شافعیؒ نے اعتضاد کے لیے یہ شرط زائد بیان کی ہے کہ وہ کسی صحابی کے قول کے موافق ہو یا اکثر علماء نے اس کے مقتضیٰ پر فتویٰ دیا ہو۔

امام ابن الجوزیؒ اپنی کتاب التحقیق میں اور محدث خطیب بغدادیؒ اپنی تالیف الجامع فی اداب الراوی والسامع میں امام احمدؒ بن حنبلؒ سے نقل کرتے ہیں۔

ربما کان المرسل اقوی من المسند۔ (شرح نقایہ جلد ۱ ص۴۱ طبع ہند)

بسا اوقات حدیث مرسل مسند سے قوی تر ہوتی ہے۔

اور عہد حاضر کے محقق علامہ زاہد الکوثریؒ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ

والاحتجاج بالمرسل کان سنۃ متوارثۃ جرت علیہ الامۃ فی القرون الفاضلۃ حتی قال ابن جریر رد المرسل مطلقاً بدعۃ حدثت فی رأس المأتین اھ کما ذکرہ الباجیؒ فی اصولہ وابن عبد البرؒ فی التمہید وابن رجبؒ فی شرح علل الترمذی اھ

مرسل کے ساتھ احتجاج کرنا ایک ایسا متوارث طریق تھا جس پر قرون فاضلہ میں امت عمل پیرا رہی ہے امام ابن جریرؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مطلقاً مرسل کو رد کر دینا بدعت ہے جو دوسری صدی کے آخر میں ایجاد ہوئی جیسا کہ علامہ باجیؒ نے اپنے اصول میں اور ابن عبد البرؒ نے تمہید میں اور ابن رجبؒ نے شرح علل ترمذی میں ذکر کیا ہے۔

(تانیب الخطیب صہ ۱۵۲ طبع مصر)

تقلید شخصی تو بقول فریق ثانی چوتھی صدی کے بعد کی بدعت ہے مگر مطلقاً مرسل کو رد کرنا دوسری صدی کے بعد کی بدعت نکلی ان تمام اقتباسات سے یہ بات بالکل مبرہن ہو چکی ہے کہ مرسل حدیث کے حجت ہونے نہ ہونے کا جھگڑا تو دوسری صدی کے بعد سے تاہنوز چلا آرہا ہے مگر دوسری صدی تک ساری امت مرسل کو حجت سمجھتی تھی۔ لہٰذا محض مرسل مرسل کہہ کر پیچھا چھڑانا یا گلو خلاصی چاہنا جیسا کہ فریق ثانی کر رہا ہے آسان نہیں ہے حق بات یہ ہے کہ مرسل جبکہ اس کی سند صحیح ہو اور کسی مرفوع متصل روایت کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ بالکل حجت ہے۔

بعض حضرات تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے مراسیل:

علمی اور تحقیقی طور پر بعض حضرات تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ ایسے بھی ہیں جن کے مراسیل کو امت مسلمہ نے بخوشی قبول کیا ہے حتی کہ خود حضرت امام شافعیؒ نے بھی ان کو تسلیم کیا ہے اور وہی اس کے رد کرنے میں پیش پیش ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا مشہور قول یہ بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کے مرسل کو حجت مانتے ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۱۲۰)

اور امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ سعیدؒ بن المسیبؒ کے مراسیل اصح ترین ہیں۔

(تدریب ص ۱۲۳)

امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سعیدؒ المسیبؒ کے مراسیل صحیح تر ہیں اور ابراہیم نخعیؒ کے مراسیل لا بأس بہا ہیں۔ (ایضاً صہ ۱۲۳ و صہ ۱۲۴)

اور امام ابن معینؒ نے فرمایا کہ مراسیل ابراہیم نخعیؒ مجھے شعبیؒ کے مراسیل سے زیادہ محبوب ہیں۔ (ایضاً صـ۱۲۴) اور امام المحدثین علیؒ بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ حسن بصریؒ کے مراسیل جن کو ان سے ثقہ راوی نقل کریں بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ (ایضاً) اور علیؒ بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے مجاہدؒ کے مراسیل، عطاءؒ کے مراسیل سے کئی درجہ زیادہ پسند ہیں (ایضاً صـ۱۲۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مراسیل ایک دوسرے کی نسبت سے صحیح تر ہوتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو فی نفسہٖ صحیح بلکہ اصح ہیں۔ لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا یہ بہانہ کہ ترجیح سے اعتضاد سمجھ لیا حالانکہ ضعیف پر ضعیف کو بھی ترجیح ہوتی ہے۔ الی ان قال یاد رکھنا چاہیے کہ مرسل کو مرسل سے اس وقت قوت ہوتی ہے جب دونوں کبار تابعینؒ سے ہوں ..... الخ (صـ۳۵۳) محض اپنے قلب کی تسکین کا سامان ہے اور ناخواندہ حواریوں کو طفل تسلی دینا ہے اور بس کیونکہ ان مراسیل میں مطلقاً بعض مراسیل فی نفسہا صحیح ہیں اور اعتضاد کے لیے کبار تابعینؒ کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ محض مؤلف مذکور کی اختراع ہے کیونکہ حضرات ائمہ ثلاثہؒ اور دوسری صدی تک کی ساری امت تو ویسے ہی مرسل کو حجت مانتی ہے اور امام شافعیؒ مرسل معتضد کو (جو بعض حضرات صحابہ کرامؓ یا اکثر علماء کے عمل کے موافق ہو) حجت سمجھتے ہیں اور امام کے پیچھے قرأت کا ترک کرنا خصوصاً جہری نمازوں میں نہ صرف یہ کہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ کے عمل سے مؤید ہے بلکہ جمہور صحابہ کرامؓ کا یہی معمول تھا اور بقول حافظ ابن تیمیہؒ جہری نمازوں میں ترک قرأت پر اجماع امت ہے لہٰذا ہر حیثیت سے یہ مراسیل حجت ہیں لا شک فیہا۔

فائدہ۔ اگرچہ بعض محدثینؒ نے مرسل اور منقطع میں اصطلاحی طور پر کچھ فرق کیا ہے لیکن علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں:

وقد اطلق المرسل علی المنقطع من ائمة الحديث ابو زرعةؒ و ابو حاتمؒ والدارقطنیؒ۔ اھ (توجیہ صـ۲۴۳)	حدیث منقطع پر مرسل کا اطلاق ان ائمہ حدیث نے کیا ہے امام ابوزرعہؒ، امام ابوحاتمؒ اور امام دارقطنیؒ

مؤلف خیر الکلام نے حضرت مجاہدؒ کے اثر کے بارے میں امام بیہقیؒ کی کتاب القرأۃ صـ۲ے کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ یہ منقطع ہے اور منقطع ضعیف کی قسم ہوتی ہے (محصلہ صـ۳۵۳) محض طفل تسلی ہے کیونکہ مرسل فی نفسہٖ صحیح قول کی بنا پر حجت ہے اور حکم منقطع و مرسل ایک

وغیر الامام (کتاب القرأۃ ص۶۸ جزء القرأۃ ص۱۰) امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔

جواب:۔ اس کی سند میں زیادؒ بن ابی زیاد جصاص ہے امام ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ اس کو لیس بشیئ کہتے ہیں نسائیؒ اور دار قطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں ابو زرعہؒ اس کو واہی کہتے ہیں علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے (میزان جلد ۱ ص۳۵۶ و تہذیب جلد ۳ ص۳۶۸) مؤلف خیر الکلام نے بھی علامہ ذہبیؒ کا حوالہ نقل کیا ہے (ص۲۲) یہ روایت بھی نہایت کمزور اور ضعیف ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے لا تجوز صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب وآیتین فصاعداً (کتاب القرأۃ ص۱۶) کہ نماز سورۂ فاتحہ اور دو آیتوں اور اس سے کچھ زیادہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں ایک تو خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور دوسرے اس میں وآیتین فصاعداً کی زیادت موجود ہے۔

لطیفہ:۔ حضرت عمرانؓ بن حصینؓ سے مرفوعاً ایک روایت مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا کس نے میرے ساتھ منازعت اور ہاتھا پائی کی ہے؟ غرضیکہ آپؐ نے امام کے پیچھے قرأۃ کرنے سے منع کر دیا (دار قطنی جلد ۱ ص۱۲۴) اس روایت پر فریق ثانی کی طرف سے جن میں امام دار قطنیؒ بھی ہیں یہ اعتراض ہوا ہے کہ سند میں حجاجؒ بن ارطاۃؒ ہے اور وہ ضعیف ہے ہم نے حجاجؒ بن ارطاۃؒ سے کوئی روایت نہیں لی۔ لیکن فریق ثانی کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ حجاجؒ بن ارطاۃ، ابو داؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور مسلمؒ وغیرہ کے روات میں ہیں (ازالہ ستر ص۱۴۱) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الاعلام اور علم کا ظرف لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۷۵) ابو زرعہؒ اور ثوریؒ ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب جلد ۲ ص۱۹۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کان بارعاً فی الحفظ والعلم کہ حفظ اور علم میں وہ بلند پایہ رکھتے تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۵۳) امام ترمذیؒ ان کی ایک حدیث کو حسن کہتے ہوئے تحسین کرتے ہیں (جلد ۱ ص۱۱۴) بلکہ ایک حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں (جلد ۱ ص۱۱۲) افسوس ہے کہ ان کی روایت تو فریق ثانی کے نزدیک حجت نہیں ہے لیکن زیادؒ کی روایت حجت ہے جو لیس بشیئ ہے اور اس کی تضعیف پر اجماع ہے ان کی ایک روایت یوں ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے سبح اسم ربک الاعلیٰ کی سورت آپؐ کے پیچھے پڑھی تھی (مسلم جلد ۱ ص۱۷۲، نسائی جلد ۱ ص۱۰۶، ابو داؤد جلد ۱ ص۱۲۷) چونکہ لغت

توفیقی ہے اس لیے قرأ کو جھر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا اور پڑھنے والا بھی صرف ایک شخص تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے قراۃ ظہر کی نماز میں کی تھی جو سری ہے مگر آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں کیا اور پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور منازعت و مخالجت میں قرأت سورۃ فاتحہ اور دوسری تمام سورتیں یکساں ہیں کیونکہ علت ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ کو منازعت کے لیے متعین کر دینا اور سورۂ فاتحہ کو اس سے خارج تصور کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے جو بہر حال مردود ہے۔

حضرت ہشامؓ بن عامرؓ کا اثر: حمیدؒ بن ہلالؒ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں۔

ان هشامؓ بن عامرؓ قرأ فقيل له اتقرأ خلف الامام قال انا لنفعل (كتاب القرأة ص۷۶ والسنن الكبرىٰ جلد۲ ص۱۷۰)

کہ ہشامؓ بن عامرؓ نے قرأت کی ان سے پوچھا گیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں ہم یوں ہی کرتے ہیں۔

جواب: یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابو بحر بکراویؒ ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کذاب تھا ثانیاً اس بات میں اختلاف ہے کہ حمیدؒ بن ہلالؒ کی ہشامؓ بن عامرؓ سے ملاقات ثابت ہے یا نہیں؟ امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں ملاقات ثابت نہیں ہے اور ان کی روایت مرسل ہے (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد۳ ص۵۲ و جلد۱۱ ص۱۰) وثالثاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے فریق ثانی کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ہے نہ کہ مطلق قرأت کا۔

حضرت معاذؓ بن جبل کا اثر: ایک سائل نے حضرت معاذؓ سے قراۃ خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔

قال اذا قرأ فاقرأ بفاتحة الكتاب وقل هو الله احد واذا لم تسمع فاقرأ في نفسك ولا تؤذ من عن يمينك ولا من عن شمالك (السنن الكبرىٰ جلد۲ ص۱۶۹)

انہوں نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم بھی سورۃ فاتحہ اور قل هو الله احد پڑھا کرو اور جب اس کی قراۃ نہ سنو تو دل میں پڑھا کرو دائیں اور بائیں پہلو والوں کو اذیت نہ دیا کرو۔

جواب: یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہو سکتا اولاً اس لئے کہ اس کی سند میں احمدؒ بن محمودؒ

واقع ہے حافظ ابن حجرؒ ایک سند کے متعلق جس میں احمدؒ بن محمودؒ واقع ہے لکھتے ہیں کہ سند باطل ہے اور اس سند کے راوی ضعیف ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ مجہول ہیں (لسان المیزان جلد ۶ صفحہ ۲۱۴) وثانیاً اس کی سند میں ابوشیبہ مہریؒ ہے علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ بلج مہریؒ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں لا یدری من ذا و لا من شیخہ بلج مہریؒ اور اس کا استاد ابوشیبہ مہریؒ پتہ نہیں یہ دونوں کون تھے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی سند مجہول ہے (میزان جلد ۱ صفحہ ۱۶۴ ولسان جلد ۲ صفحہ ۹۲) وثالثاً اس سند میں علیؒ بن یونسؒ واقع ہے اگر یہ علی بن یونس بلخیؒ ہے تب بھی کمزور ہے (میزان جلد ۲ صفحہ ۲۴۱ ولسان صفحہ ۲۶۸) اور اگر علیؒ بن یونس مدنیؒ ہے تب بھی ضعیف ہے (ایضاً، وایضاً صفحہ ۲۶۹) اگر کوئی اور ہے تو اس کی توثیق درکار ہے ورابعاً اس اثر سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے صرف سری نمازوں میں اجازت دی ہے وخامساً اس میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قل ھو اللہ احد کی قرأت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا اثر:۔ حضرت سالمؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ان ابن عمرؓ کان ینصت للامام فیما جھر فیہ ولا یقرأ معہ (کتاب القرأۃ صفحہ ۱۰۱ وتحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۱۶۱) کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے خاموش رہا کرتے تھے اور قرأت نہیں کرتے تھے، فریق ثانی کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأۃ کیا کرتے تھے۔

جواب:۔ یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں، امام دارقطنیؒ علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ مدلس تھے (تہذیب جلد ۶ صفحہ ۴۰۵، میزان جلد ۲ صفحہ ۱۵۱، ابکار صفحہ ۲۳۷) اور یہاں وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں وثانیاً اس میں زہریؒ ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ان کی مدلس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں وثالثاً یہ اثر عبارۃ النص کے طور پر ہماری دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے رہا سری نمازوں میں اس سے قرأت کا اثبات کرنا تو مفہوم مخالف پر مبنی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالف حجت نہیں ہے (تعلیق الممجد صفحہ ۹۳ واعلاء السنن جلد ۴ صفحہ ۷۷) ورابعاً اگر مفہوم مخالف کو بعض فقہاً

کے قول کے مطابق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہو گا کہ حضرت ابن عمرؓ سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور فریق ثانی کا دعویٰ اس سے خاص ہے کیونکہ ان کا دعویٰ صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کا ہے وغاشیہ موطا امام مالکؒ وغیرہ کے حوالہ سے بسند صحیح ان کا یہ اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے اور ان کا یہ مسلک ایک مسلّم حقیقت ہے اور ان سے ایک روایت یوں ہے انہ کان ینھٰی عن القرأۃ خلف الامام (الجوھر النقی جلد ۲ ص ۱۶۳) کہ حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مولانا سیّد نذیر حسین صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) جو فریق ثانی کے مقتدر اور پیشوا ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی علماء احناف کے نزدیک اجازت نہیں ہے اور ان کا استدلال ان صحابہ کرامؓ کی روایات سے ہے اور یہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابو سعید الخدریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ وغیرہم (منع قرأت خلف الامام۔ بحوالہ ایضاح الادلۃ ص ۲۸۷) اور صحیح اسانید کے ساتھ جلد اوّل میں ان اکابر کے آثار نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ جملہ حضرات امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی بات مولانا نذیر حسین صاحبؒ فرما رہے ہیں حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کا ایک اثر کتاب القرأۃ ص ۱۲۹ و ص ۱۴۷ میں ہے لیکن اس میں مکحولؒ مدلس ہیں اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں علاوہ ازیں امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبد اللہ بن عمرؓ نہیں بلکہ عبد اللہؓ بن عمروؓ بن العاص ہیں (ص ۱۲۹) اور مستزاد براں اس میں خلف الامام کا جملہ بھی مذکور نہیں ہے لہٰذا یہ روایت منفرد کے حق میں ہے۔ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ سے ابو العالیہؒ نے مکہ مکرمہ میں دریافت کیا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ فرمایا میں بیت اللہ کے رب سے حیا کرتا ہوں کہ نماز میں قرأت نہ کروں ولو بام الکتاب اگرچہ ام القرآن ہی ہو (جزء القرأۃ ص ۱۲) لیکن اس میں بھی خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں کتاب القرأۃ ص ۶۵ میں اسی اثر کے آخر میں فاتحۃ الکتاب کے بعد ماتیسر کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس بات کو متعین کر دیتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ اثر مقتدی کے حق میں نہیں ہے کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک

بھی اس کو ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اور کتاب القرأۃ صہ ۶۴ میں ان کی اسی روایت میں بام الکتاب کے بعد فزائداً یا فصاعداً کی زیادت بھی مروی ہے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اثر ان الفاظ سے مروی ہے۔

سئل ابن عمرؓ عن القرأۃ خلف الامام فقال ماکانوا یرون بأسا ان یقرأ بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ (جزء القرأۃ صہ ۱۲)

ان سے سوال کیا گیا کہ کیا امام کے پیچھے قرأۃ کی جاسکتی ہے؟ فرمایا لوگ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ اپنے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

لیکن اس کی سند میں ایک تو ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسٰی بن ماہان ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی اس سند کا یحییٰ البکاءؒ ہے امام احمدؒ، ابو داؤدؒ، ابو زرعہؒ اور ابن عدیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، دار قطنیؒ اس کو ضعیف اور علی بن الجنیدؒ اس کو مختلط کہتے ہیں، ازدیؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صہ ۲۷۹) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاء صغیر صہ ۵۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (تقریب صہ ۳۹۵) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ عیسٰی بن ماہان متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ صدوق ہے اس کا حافظہ اچھا نہیں تقریب صہ ۳۲۴) اور یحییٰ البکاءؒ کو ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ ہے انشاء اللہ جب راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے (محصلہ صہ ۳۲۴) الجواب: ہاں بس ایسے ہی راویوں کی ایسی ہی حسن قسم کی حدیثوں پر آپ کے مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی نمازوں کو باطل اور کالعدم ٹھہرانے والوں کی وکالت فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور آگے لکھتے ہیں کہ تطبیق کی یہی صورت ہے کہ نفی سے مراد جہری نماز میں فاتحہ سے ما زاد کی نفی مراد لی جائے اور فاتحہ کو اس نفی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے انتہیٰ صہ ۳۲۵ الجواب: نہ معلوم یہ حضرات کس روایت کی کس سے تطبیق دے رہے ہیں؟ صحیح اور ضعیف کی تطبیق کا کیا معنیٰ؟ الحاصل حضرت ابن عمرؓ ہوں یا کوئی اور صحابی ہو ان میں کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری اور واجب ہے۔

حضرت عبادۃؓ بن الصامت کا اثر:۔

حضرت محمودؓ بن ربیع فرماتے ہیں کہ:۔

سمعت عبادةؓ بن الصامت یقرأ خلف الامام فقلت له تقرأ خلف الامام فقال عبادةؓ لا صلوٰة الا بقراۃ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۸)

میں نے حضرت عبادہؓ کو امام کے پیچھے قرأت کرتے سنا میں نے دریافت کیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ حضرت عبادہؓ نے فرمایا قرأت کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی۔

امام بیہقیؒ نے اپنی سند کے ساتھ ان کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس میں امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرنے کی اجازت ہے اور پھر لکھا ہے۔

ومذھب عبادةؓ فی ذلک مشھور (ص ۱۶۸ ج ۲)

حضرت عبادہؓ کا مذہب اس میں مشہور و معروف ہے۔

جواب:- سند کے لحاظ سے گو کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے مگر ہم سند کے لحاظ سے اس پر کوئی کلام نہیں کرتے حضرت عبادہؓ بن الصامت نے صحیح سمجھا یا غلط بہر حال یہ بالکل صحیح بات ہے کہ حضرت عبادہؓ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک و مذہب تھا مگر فہم صحابی اور موقوف صحابی حجت نہیں ہے خصوصاً قرآن کریم، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرامؓ کے آثار کے مقابلہ میں لیکن یہ روایت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ مسئلہ ان میں رائج بھی نہ تھا ورنہ محمودؓ بن ربیع جو خود صغار صحابہؓ میں تھے حضرت عبادہؓ بن الصامت کی امام کے پیچھے قرأت سے کبھی تعجب نہ کرتے اور نہ یہ پوچھنے کی نوبت ہی آتی کہ حضرت آپ امام کے پیچھے کیوں قرأت کرتے ہیں؟ یقینی امر ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت نے نماز میں تکبیر، قیام، رکوع، سجود، تشہد، اور سلام وغیرہ جملہ امور ادا کیے ہوں گے مگر ان میں سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ حضرت آپ نے رکوع کیوں کیا ہے؟ سجدہ کیوں کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اگر سوال کیا ہے تو اس چیز کے بارے میں کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کیوں کرتے ہیں؟ یہ بھی مت بھولیے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت نے محمودؓ بن ربیع کو یہ نہیں فرمایا کہ برخوردار تمہاری تمام سابق نمازیں بے کار کالعدم اور باطل ہیں کیونکہ تم نے قرأت نہیں کی اور تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں اور نہ سہی تو یہی نماز جو تم نے ابھی ابھی میرے ساتھ بغیر قرأت کے ادا کی ہے وہی دوبارہ پڑھ لو اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع حضرت عبادہؓ کے داماد تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۶۳) انہوں نے ان کو یہ بھی نہ فرمایا کہ تم امام کے پیچھے ترک قرأت کے مرتکب

ہوئے ہو اور تارکِ قرأت کی نماز باطل اور کالعدم ہے اور من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر لہٰذا میری لختِ جگر کو میرے گھر پہنچا دو اور خود مزے اڑاتے پھرو۔ حضرت عبادہؓ وہی جلیل القدر صحابی ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم نے جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس شرط سے بیعت کی ہے کہ ان لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم (مستدرک وقال صحیح جلد ۳ ص ۳۵۶) اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہ گھبرائیں گے اور ایک معمولی قسم کے مسئلہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے اُلجھ کر ملک شام ترک کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ ہمارا اجتماع ناممکن ہے لیکن حضرت عمرؓ کی زبردست مداخلت سے اپنے ارادہ سے باز آئے (دیکھئے مستدرک جلد ۳ ص ۳۵۵، مسند دارمی ص ۹۳ اور ابن ماجہ ص ۳ وغیرہ) مگر جب قرأت خلف الامام کے مسئلہ کی باری آتی ہے تو اپنے پڑھنے کی وجہ تو بتلاتے ہیں لیکن اس اہم مسئلہ کے اظہار پر کماحقہ وہ جوش و خروش ظاہر نہیں کرتے جو اس کے رکن اور ضروری ہونے پر کرنا چاہیئے تھا۔ اگر حضرت عبادہؓ کے نزدیک قرأت خلف الامام واجب فرض اور رکن ہوتی تو اس کے اظہار میں پوری قوت اور طاقت صرف کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرتے اس بحث کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آسکتی ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع مطلقاً امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ کے قائل نہ تھے اور حضرت عبادہؓ گو قائل تو تھے لیکن محض استحباب کے طور پر اور اگر کسی کو حکم بھی کیا ہے تو صرف استحبابی امر سمجھ کر۔ اگر اس کو رکن اور فرض سمجھتے تو کتمانِ حق سے بچتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی طرح (جنہوں نے قرآن کریم کی دو سورتوں کے تقدم و تأخر فی النزول کے بارے میں اعلان کیا تھا) یہ اعلان فرماتے من شاء باھلتہ جس کا جی چاہے میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں جب حضرت عبادہؓ نے ایسا نہیں کیا تو قطعی بات ہے کہ وہ امام کے پیچھے بلاشک سورۂ فاتحہ پڑھتے تو تھے (اور جہری نمازوں میں پڑھتے بھی صرف تنہا اور اکیلے تھے دوسرے حضرات صحابہؓ کا ان سے اتفاق نہ تھا) مگر صرف مستحب سمجھ کر ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دوسرے صحابہ کرامؓ حضرت عبادہؓ بن الصامت سے جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں اتفاق نہیں رکھتے تھے سینہ زوری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ۔

وانما تعجب من قرأۃ عبادۃؓ بن الصامت خلف الامام فیما یجھر فیہ بالقرأۃ لذھاب	جو لوگ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے انہوں نے حضرت عبادہؓ کی جہری نمازوں میں قرأت

من ذهب الی ترك القرأة خلف الامام فیما یجهر الامام فیه بالقرأة حین قال النبی صلی الله علیه وسلم مالی انازع القرآن ولم یسمع استثناء النبی صلی الله علیه وسلم قرأة فاتحة الکتاب سراً وقوله صلی الله علیه وسلم فانه لاصلوٰة لمن لم یقرأ بها وسمعه عبادةؓ بن الصامت واتقنه واداه واظهره فوجب الرجوع الیه فی ذلك (انتہیٰ بلفظہٖ کتاب القرأة ص۴۷)

پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ میرے ساتھ قرآن میں منازعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اور اس کے بعد آپ نے آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور اسی طرح آپ نے یہ فرمایا کہ جس آدمی نے نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی تو یہ استثناء صرف حضرت عبادہؓ بن الصامت نے سُنی اور دیگر حضرات صحابہؓ نہ سُن سکے اور اس کو حضرت عبادہؓ نے خوب محفوظ رکھا اس کو ادا کیا اور ظاہر کیا سو انکی بات کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھہرا۔

صحابی اور تارک نماز؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں اور واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں سینکڑوں حضرات صحابہؓ شریک ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مالی انازع الخ سے تنبیہ فرما کر سب حضرات صحابہ کرامؓ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔ یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ اور فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (یعنی اے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکموں کو کھول کر بیان کریں جن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے) مگر بایں ہمہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ حکم آہستہ (سراً) بیان کرتے ہیں اور حضرت عبادہؓ کے بغیر اس حکم کو کوئی دوسرا سنتا ہی نہیں؟ پھر حضرت عبادہؓ پر لوگ متعجب کیوں نہ ہوں کہ حضرات صحابہ کرامؓ جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم اور ارشاد کو عزیز از جان سمجھتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے کوئی بات نہیں سمجھ آتی تو پھر استدعا کرتے تھے اور کوئی ضروری امر ہوتا تو آپ تین تین مرتبہ ایک ایک جملہ کو دہراتے تھے لیکن جب امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ کے حکم کے بیان کرنے کا نمبر آتا ہے تو آپ آہستہ بیان کرتے ہیں؟ تین مرتبہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ اور یہ حکم صرف حضرت عبادہؓ سُنتے ہیں کسی دوسرے کے پلّے کچھ نہیں پڑتا؟ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ آپ سے دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ حضرت آپؐ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اگر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا مسئلہ ضروری فرض، واجب اور رکن ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و

سلم ایک بار نہ فرماتے بلکہ کئی بار فرماتے سِرّاً نہ فرماتے بلکہ جہراً فرماتے صرف حضرت عبادہؓ کو نہ سناتے بلکہ تمام حضرات صحابہؓ کو سناتے اور اگر حضرت عبادہؓ بھی اس حکم کو ضروری سمجھتے تو یقیناً بغیر خوف لومۃ لائم کے اس کی خوب نشر و اشاعت کرتے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس بات کا قائل کر لیتے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے۔ یہ حکم تو ضروری نہ تھا اس لیے اس کی پُرزور اشاعت کی ضرورت ہی انہوں نے نہ سمجھی، بخلاف اس کے ترک قرأت کا حکم ضروری تھا اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے پیچھے صرف ایک شخص نے قرأت کی تو آپ نے فرمایا میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ کیوں میرے ساتھ منازعت اور مخالجت ہوتی رہی ہے؟ حتیٰ کہ آپ نے ببانگ دہل یہ ارشاد فرمایا مالی انازع القرآن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ارشاد سب نے سنا اور یہ ارشاد سُن کر تمام حضرات صحابہؓ کرام نے جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔ جیسا کہ مفصل پہلے گذر چکا ہے۔ باقی اگر حضرت عبادہؓ سے بسندِ صحیح یا کسی اور صحابی سے بلا قیل وقال خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح ہوتی تو یقیناً اس کی طرف رجوع کیا جاتا مگر روایات کا حال آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حضرت عبادہؓ کے موقوف قول سے ہی غلطی در غلطی پیدا ہوئی ہے الغرض حضرات صحابہ کرامؓ کے یہ آثار پہلے تو سنداً ہی صحیح نہیں ہیں اور اگر کچھ صحیح بھی ہیں تو ان میں صرف سِرّی نمازوں کا ذکر ہے، کسی میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور اکثر میں ما زاد، ما تیسر اور فصاعداً وغیرہ کی زیادت بھی موجود ہے لہٰذا یہ آثار فریق ثانی کو ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔

آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم

فریق ثانی نے اپنے اس دعوے پر کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ورنہ نماز ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہو گی، حضرات تابعینؒ واتباع تابعینؒ وغیرہم کے آثار اور اقوال سے بھی استدلال کیا ہے حالانکہ ان کے نزدیک در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد پھر آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ سنداً اور روایۃً بھی صحت کے معیار پر پورے نہیں اُترتے اور معنوی اور درایتی پہلو کے پیش نظر بھی وہ ان کو چنداں مفید نہیں ہو سکتے مگر مشہور ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، حضرات تابعینؒ وغیرہم کے وہ آثار جو بحث سکتات

وغیرہ اور دیگر مواقع پر نقل کیے جا چکے ہیں اور جن پر کلام بھی کیا جا چکا ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے اِس موقع پر صرف وہ آثار پیش ہوں گے جو پہلے نقل نہیں ہوئے۔

حضرت مکحول رح کا اثر :۔ ان سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مغرب عشاء اور صبح کی نماز میں ہر رکعت میں آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے اور جہری نمازوں میں جب امام سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت اختیار کرے تو اس وقت آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے اور اگر امام خاموش نہ ہو تو اس کے ساتھ یا اس کے بعد یا اس سے پہلے ہر حالت میں سورۂ فاتحہ پڑھو اور کسی حالت میں نہ چھوڑو (بیہقی رح جلد ۲ ص ۱۷۱)

جواب :۔ یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اگر بالفرض یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی نص قرآنی، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرام رض کے صحیح آثار کے مقابلہ میں اس کو سنتا کون ہے ؟ وثانیاً قرأت سورۂ فاتحہ کے لیے سکتہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ بحث سکتاتِ امام میں اس کی سیر حاصل تحقیق پیش ہو چکی ہے اور جہر امام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا منازعت اور مخالجت کا موجب ہے جو کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے مردود ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر رض کا اثر :۔ ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ

لا تتم صلوٰة لاحد من الناس لا یقرأ فیھا بفاتحة الکتاب فصاعدا مکتوبة ولا سبحة (کتاب القرأة ص ۵۷)	کسی شخص کی کوئی نماز خواہ وہ فرضی ہو یا نفلی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سورۂ فاتحہ اور اس سے کچھ زیادہ کی قرأت نہ کی جائے۔

جواب :۔ یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں محمد بن العباس رح ہے کتب اسماء الرجال سے اس کی تعیین نہیں ہو سکی کہ یہ کون اور کیسا ہے ؟ وثانیاً اس میں احمد رح بن سوید رح ہے جس کا کتب رجال میں کوئی نام ونشان ہی نہیں ملتا، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مگر عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجہول ہو ؟ ص ۲۳۹ الجواب :۔ یہ ٹھیک ہے مگر مؤلف مذکور کا یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس راوی کی نشاندہی کرتے اور کتب رجال سے اس کی توثیق نقل کرتے وثالثاً اس کی سند میں حماد رح بن سلمہ رح ہے ان کے اس اثر کا مقابلہ اس اثر سے نہیں ہو سکتا جو جلد اوّل میں بسند صحیح نقل کیا جا چکا ہے مبارکپوری صاحب رح لکھتے ہیں۔ سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں

علیٰ وجوب الاستماع والانصات لقرأة الامام۔۔۔ الخ (احکام القرآن ج ۳ ص ۴۹)

استماع وانصات کے وجوب پر واضح دلیل ہوتی۔

علامہ[1] سید محمود آلوسیؒ (مفتی بغداد المتوفی ۱۲۷۰ھ)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

لانها تقتضی وجوب الاستماع عند قرأة القرآن فی الصلوٰة وغیرها و قد قام الدلیل فی غیرها علی جواز الاستماع و ترکه فبقی فیها علی حاله فی الانصات للجهر وکذا فی الاخفاء لعلمنا بانه یقرأ ویؤید ذلك اخبار جمة (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳)

آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نماز میں یا خارج از نماز جب بھی قرآن کریم کی قرأت ہوتی ہو تو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن خارج از نماز سماع وعدم سماع دونوں کے جواز پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔ لہٰذا جہری نمازوں میں انصات بہر حال ضروری ہے اور اسی طرح سری نمازوں میں بھی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرأت کرتا ہے اور متعدد حدیثیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

اس کے بعد علامہ موصوفؒ نے متعدد صحیح حدیثیں، عقلی وترجیحی دلائل پیش کر کے بڑے وزنی دلائل سے اپنا دعویٰ ثابت کیا ہے۔

قارئین کرام! آپ حقیقت کی تہ کو پہنچ چکے ہوں گے۔ ابھی بہت سے مفسرین کرامؒ مثلاً علامہ خازنؒ[2] (المتوفی ۷۴۱ھ) اور شیخ احمدؒ[3] جونپوریؒ (المتوفی ۱۱۳۰ھ) وغیرہ وغیرہ کی عبارتیں باقی ہیں، مگر ہمارا مقصد صرف منصف مزاج لوگوں کے لیے معتبر مفسرین کے

---

[1] مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ متاخرین حنفیہ میں بڑے پائے کے مفسر ہیں۔ تفسیر واضح البیان ص ۱۴۱

[2] مشہور تفسیر ہے اور ۷۲۵ھ میں مصنف اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تھے۔ (اکسیر ص ۱) آیت مذکورہ کی تفسیر انھوں نے جلد ۲ ص ۲۷۷ میں کی ہے۔

[3] یہ اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۱۸ھ) کے استاد تھے۔

(اکسیر ص ۳۴)

اور تفسیر احمدی ص ۲۸۰ میں انھوں نے آیت مذکورہ کی سیر حاصل تفسیر کی ہے۔

چند اقوال بطور نمونہ عرض کرنے تھے اگر استقصار کیا جائے تو تقریباً محال ہے اور ہمارا موضوع بھی یہ نہیں۔ اس لیے اب ہم بعض ضروری عبارتیں نقل کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امام بیہقی رحؒ جن کی کتاب القراۃ پر مسئلہ زیر بحث میں فریق ثانی کا مدار ہے۔ رقم طراز ہیں کہ

انا لا ننکر نزول ھٰذہ الاٰیۃ فی الصلوٰۃ او فی الصّلوٰۃ والخطبۃ کما ذھب الیہ من ذکرنا قولہ من سلف ھذہ الامۃ غیر انھم او بعض من روی عنھم اختصر والحدیث فقالوا فی الصلوٰۃ مطلقاً۔

(کتاب القرأۃ ص۶۵)

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں یا نماز اور خطبہ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیساکہ سلفِ امت کے اقوال ہم نے نقل کیے ہیں لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے یا ان میں سے بعض نے حدیث کو مختصر کر دیا ہے اور اس آیت کا شان نزول مطلقاً نماز کو قرار دیا ہے۔ (اور خطبہ وغیرہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔)

امام بیہقیؒ کو اس کا اقرار ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوں ہیں اور جمہور امت کا بھی یہی قول ہے مگر ان کا اعتراض یہ ہے کہ آیت کو فقط نماز پر کیوں قصر کر دیا ہے؟ اس میں خطبہ وغیرہ کا ذکر بھی آنا چاہیے جیساکہ احادیث میں آتا ہے لیکن امام موصوفؒ کا یہ اعتراض محض دفع الوقتی اور تسکین قلب کا سامان ہے۔

اوّلاً: اس لیے کہ جمعہ اور عید کی فرضیت مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے اور آیت مذکورہ مکّی ہے جیسا کہ علامہ بغویؒ کے حوالہ سے عرض کیا جاچکا ہے۔ پھر اس کا شان نزول خطبہ کیسے ہوا؟

وثانیاً: جس حدیث (بلکہ احادیث) کے اختصار کا الزام امام موصوفؒ نے عائد کیا ہے۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ اپنے مقام پر عرض ہوگا۔ پھر ان سے استدلال واحتجاج کیسا؟

وثالثاً: آیت کا حکم خطبہ کو عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے نہ کہ شان نزول کے لحاظ سے۔ جیساکہ آپ پوری وضاحت سے یہ پڑھ چکے ہیں۔ مگر یہ کس قدر حقیقت فراموشی ہے کہ جس نماز کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس میں استماع وانصات تو ضروری نہ ہو اور خطبہ (وغیرہ بالتبع امور) کو اصل بنا کر اصل حقیقت سے گریز اور پہلوتہی کی جائے؟

قاضی شوکانی (محمد بن علی المتوفی ۱۲۵۵ھ)

اس مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

لان عمومات القرآن والسنۃ قد دلت علی وجوب الانصات والاستماع والمتوجہ حال قرأۃ الامام للقرآن غیر منصت ولا مستمع ..... الخ

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۶ ونقلہ النواب فی ھدایۃ السائل ص ۱۹۱)

(امام جب قرأت قرآن کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ ... الآیۃ کی دعاء استفتاح نہیں پڑھنی چاہیے) کیونکہ قرآن کریم اور سنت کے عمومات اور اکثر دلیلیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ امام جب قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر انصات اور استماع واجب ہے۔ حالانکہ اس حالت میں امام کے ساتھ پڑھنے والا استماع اور انصات پر عامل نہیں ہے۔

قاضی صاحب[1] بھی جمہور اہل اسلام کی طرح جہر امام کے وقت مقتدی کی قرأت کو قرآن کریم کے ظاہر سے توجہ مانع قرآن و سنت عمومی دلائل کے خلاف سمجھتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ اس کے خلاف کرنے والا عمومات قرآن اور اور سنت کا مخالف ہے۔ قاضی صاحب نے سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کو احوط کہا ہے، لیکن قرأت مقتدی کے لیے سکتات کا شریعت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر عرض ہو گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

مؤلف خیر الکلام کا مناقشہ نمبر ۳ میں یہ کہنا کہ اس میں فاتحہ کا ذکر نہیں اور قاضی شوکانی ہر حالت میں فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور استماع و انصات آہستہ پڑھنے کے منافی نہیں (محصلہ خیر الکلام ص ۵۴۷ و ۵۴۸) تو یہ محض لفظی ہے۔ ہم نے کب فاتحہ کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے تو یہ حوالہ صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ جہر امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا استماع و انصات کے بالکل منافی ہے اور یہی کچھ قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ حتی کہ باقرار مؤلف خیر الکلام قاضی صاحب مقتدی کے لیے فاتحہ کی قرأت کو سکتات میں احوط کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۵۴۸) کہ قاضی صاحب نے فرمایا کہ

---

[1] قاضی صاحب موصوف اپنے وقت کے متبحر اور وسیع المطالعہ محقق عالم تھے۔ نواب صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ وہ القاضی، العلامہ، الابر، الانور، الزکی، المنور اور عز الاسلام تھے اور لکھتے ہیں کہ وہ کمال عالم انسانی پر حاوی تھے۔ (اکسیر ص ۹)

اگر ممکن ہو تو فاتحہ کو امام کے سکتات میں پڑھنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ (نیل جلد ۲ صفحہ ۲۳۷) اور فرماتے ہیں کہ قرآن وسنت کے عمومی دلائل مقتدی پر استماع وانصات کو واجب قرار دیتے ہیں۔

حافظ ابو عمرؒ ابن عبد البرؒ (یوسف بن عبد اللہ المتوفی ۴۶۳ھ):

لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ (وغیرہ) جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قرأت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

وحجته قوله تعالىٰ واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون ولا خلاف انه نزل في هٰذا المعنىٰ دون غيره ومعلوم انه في صلاة الجهر لان السر لا يسمع فدل علىٰ انه اراد الجهر خاصة۔

(بحوالہ اوجز المسالک جلد ا ص ۲۴۸)

اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جب قرآن کریم کی قرأت ہو رہی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اس آیت کا شان نزول صرف یہی ہے۔ نہ کہ کوئی اور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استماع تو صرف جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے فقط جہری نمازیں مراد ہوں گی نہ کہ سرّی۔

انشاء اللہ العزیز یہ بات تو اپنے مقام پر آئے گی کہ آیت میں صرف استماع کا لفظ ہی نہیں جو بقول ان کے محض جہری نمازوں کو شامل ہے (اور نیز استماع اور سماع میں بھی فرق ہے۔) بلکہ اس میں انصات کا لفظ بھی ہے جو سرّی نمازوں کو بھی شامل ہے لیکن حافظ المغرب قرآن کریم کی مذکورہ آیت کا شان نزول نماز اور خلف الامام کا مسئلہ بتلاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ پوری ذمہ داری اور وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز اور خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، شیخ الاسلام اور حافظ المغرب لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۶) علامہ ابوالولید باجیؒ ان کو احفظ اہل المغرب کہتے ہیں (ایضاً صفحہ ۳۰۷) امام حمیدیؒ کہتے ہیں کہ وہ فقیہ، حافظ کثیر التصنیف قرأت اور علم خلاف کے عالم اور علوم حدیث اور اسماء الرجال کے مسلم امام تھے (ایضاً صفحہ ۳۰۷) غرضیکہ وہ حفظ اتقان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ علامہ ابن حزمؒ کہتے تھے کہ میں نے فقہ الحدیث پر ابن عبد البرؒ کی کتاب التمہید کی مانند کوئی کتاب نہیں دیکھی چہ جائیکہ اس سے بہتر اور اعلیٰ اور کتاب الاستذکار اسی کا ملخص ہے (تذکرہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۸) حافظ ابن القیمؒ ان کو الامام الحافظ اور اپنے زمانہ میں امام اہل السنت لکھتے ہیں۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ صفحہ ۴۶)

نہیں ہے۔ انصاف شرط ہے کہ اس اجماع واتفاق کے بعد اور کون سی تفسیر معتبر اور قابل اعتماد ہو سکتی ہے؟ جو حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر قاضی شوکانی صاحبؒ تک ہر دور، ہر طبقہ اور ہر مسلک کے فقہاءؒ و محدثینؒ، مؤرخینؒ اور مفسرینؒ کے ہاں طے شدہ حقیقت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (جن کے نام اور محاسن سے مقدمہ میں آپ اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں۔) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالنزاع من الطرفين لكن الذين ينهون عن القرأة خلف الامام جمهور السلف والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة والذين اوجبوها على المأموم فحديثهم ضعفه الائمة۔

(تنوع العبادات ص۸۶)

مسئلہ زیر بحث میں نزاع تو طرفین سے ہے لیکن جو لوگ امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے ہیں۔ وہ جمہور سلف وخلفؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأۃ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کی حدیث کو ائمہؒ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مطلب ظاہر ہے کہ منکرین قرأت خلف الامام صرف چند نفوس نہیں، بلکہ جمہور سلف وخلفؒ ہیں اور یہ نظریہ جمہور نے اجتہاد اور قیاس ہی سے قائم نہیں کر لیا۔ بلکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے لیا ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے قرأت تجویز کرتے ہیں۔ ان کا ہاتھ کتاب اللہ سے یکسر خالی ہے اور محض حدیث پر ان کے استدلال کی بنیاد قائم ہے اور حدیث بھی وہ ہے جس کی تضعیف ائمہ حدیث سے منقول ہے۔ (پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

وقول الجمهور هو الصحيح فان الله سبحانه وتعالى قال واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون قال احمد اجمع الناس على انها نزلت في الصلوة۔

(فتاویٰ جلد ۲ ص۴۱۲)

جمہور کا مسلک اور قول ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سب لوگوں کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے۔

شیخ الاسلامؒ کی اس عبارت نے اس امر کی مزید تشریح کر دی ہے کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول ہی نماز ہے اور اس پر تمام اہلِ اسلام اور ائمہ دینؒ کا یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و اتباع تابعینؒ اور جمہور سلف و خلفؒ کا اجماع و اتفاق ہے۔ یہی شیخ الاسلامؒ ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ

وذکر احمدؒ بن حنبلؒ الاجماع علیٰ انھا نزلت فی الصلوٰۃ وذکر الاجماع علیٰ انھا لا تجب القرأۃ علی المأموم حال الجھر (فتاوٰی جلد ۲ ص ۱۴۳)

امام احمدؒ بن حنبلؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نیز اس پر بھی اتفاق نقل کیا ہے کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو تو مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے۔

اور نواب صاحبؒ اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

وایں آیت دلالت نمی کند مگر بر منع قرأت در حال جہر امام بقرأت لقولہ فاستمعوا واستماع نمی باشد مگر از برائے قرأت مجہور بہانہ برائے قرأت مخافتت۔۔۔ الخ

(دلیل الطالب ص ۲۸۶)

قارئین کرام! آپ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے لے کر قاضی شوکانیؒ اور نواب صاحبؒ تک کی عبارات ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اس مذکورہ آیت کا شانِ نزول صرف نماز ہے۔ خطبہ (وغیرہ) عموم الفاظ کے لحاظ سے بالتبع اور ضمنی طور پر اس حکم میں شامل ہے۔ اور حافظ ابن عبدالبرؒ اور شیخ الاسلامؒ سے یہ بھی سُن چکے ہیں کہ اس بات پر تمام اہلِ اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اس کا شانِ نزول فقط نماز ہے۔ اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اجماع کے نقل کرنے والے بھی امام اہل السنت اور مقتدائے ملت حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ ہیں اور آپ یہ بھی سُن چکے ہیں کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کرنا اجماع اور اتفاق کے سراسر خلاف ہے۔ اس تمام بحث کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فریق ثانی بے بنیاد دعاوی کو (جن کا ذکر سخن ہائے گفتنی میں ہو چکا ہے) دیکھیے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کس کے ہاتھ میں ہے اور جمہور سلف و خلفؒ کی معیت کس کو نصیب ہے؟

نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

کوئی دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بیّنہ عادلہ سے اس پر ثبوت نہ پیش کیا جائے۔ دلیل الطالب ص۳۹

الحمد للہ تعالیٰ کہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جمہور سلف و خلفؒ کی معیت بھی ہمیں حاصل ہے جو بفحوائے حدیث کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور نہ ہو گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس آیت کے سلسلہ میں فریق ثانی کی طرف سے قدیماً و حدیثاً جو جو اعتراضات اور معارضات وارد کیے گئے ہیں ان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈال لیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے ان کو ایک خاص ترتیب سے ہم نقل کرتے ہیں اور ہر ایک کا جواب ساتھ ساتھ عرض کرتے جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

پہلا اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ علامہ زیلعیؒ نے "نصب الرایہ ۲ ص۱۴" میں امام بیہقیؒ کے حوالہ سے امام احمد بن حنبلؒ کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول اجماع اور اتفاق سے نماز ہے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے امام بیہقیؒ کی معرفت السنن و الآثار اور کتاب القرأۃ کا مطالعہ کیا ہے لیکن ان میں مجھے یہ قول نہیں مل سکا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص۹۵، تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۵۹ و ابکار المنن ص)

جواب:

مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض چند وجوہ سے باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ علامہ جمال الدینؒ زیلعیؒ (المتوفی ۷۶۲ھ) نقل میں بڑے محتاط اور ثقہ ہیں اور پھر انھوں نے امام بیہقیؒ کی کسی خاص کتاب کا نام بھی نہیں لیا۔ اور امام بیہقی کثیر التصانیف تھے۔ لہٰذا مبارکپوریؒ صاحب کا ان کی صرف دو یا تین کتابیں دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

لہ جو الشیخ الامام، الحافظ اور الحجۃ تھے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ من اعلام العلماء اور فقہ حدیث اور اسماء الرجال کے مسلّم امام تھے۔ فوائد البہیہ ص۱۲۵

وثانیاً — نواب صاحبؒ نے تو جمہور کیساتھ اس امر پر اتفاق کیا ہی تھا کہ عدم علم اور علم بعدم نیست۔ (بدور الاہلہ ص۳۷۹) مگر مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اس کا اقرار ہے کہ عدم نقل عدم وقوع کو مستلزم نہیں (تحقیق الکلام ۲ ص ۱۳) اگر مبارکپوری صاحبؒ کو اس کا علم نہیں ہو سکا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ یہ جملہ اور قول ہی کتابوں سے نکل کر بھاگ گیا ہے ؟

وثالثاً — تنہا علامہ زیلعیؒ ہی اس قول کے ناقل نہیں بلکہ علامہ موفق الدین ابن قدامہؒ (مغنی جلد ۱ ص۶۰۵ میں) اور علامہ شمس الدینؒ[2] بن قدامہؒ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص۱۳ میں) اور حافظ ابن ہمام[3] (فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۱ میں)، اور ملا علی القاریؒ[4] (شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳ میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (اپنے فتاوے میں جیسا کہ گزر چکا ہے) وغیرہ سب اس کو نقل کرتے ہیں۔ مبارک پوری صاحبؒ کو ان کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیے تھی تاکہ علامہ زیلعیؒ کے قول کی صداقت معلوم ہو جاتی۔

ورابعاً — لیجیے ہم مبارکپوری صاحبؒ کے ہم مسلک اور ہم مشرب عالم سے یہ منوا دیتے ہیں مولانا عبد الصمد صاحب پشاوریؒ غیر مقلد نقل کرتے ہیں کہ

والاصح کونها فی الصلوٰة لما روی البیهقیؒ عن الامام احمدؒ قال اجمعوا علی انها فی الصلوٰة۔	صحیح ترین بات یہ ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول ہی نماز ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نماز کے بارے میں نازل ہونے پر اجماع واتفاق ہے۔

(اعلام الاعلام فی قرأة خلف الامام ص۱۹)

---

[1] بعض ائمہ نے حدیث قلتین کی تصحیح کی نسبت امام طحاویؒ کی طرف کی تھی۔ مولانا شوق نیمویؒ نے لکھا کہ مجھے شرح معانی الآثار میں تصحیح نہیں مل سکی۔ اس پر مبارک پوری صاحبؒ یوں گرفت کرتے ہیں کہ تصحیح کی نسبت کرنے والوں نے امام طحاوی کی کسی خاص کتاب کا نام نہیں لیا۔ لہٰذا نیموی صاحبؒ کو ان کی دوسری کتابیں دیکھنی چاہیے تھیں۔ (نہ معلوم یہ مفید مشورہ یہاں کیوں بھول گئے ہیں ؟ — مگر کیا جائے: ع "تمہیں عادت ہے بھول جانے کی"۔

[2] المتوفی ۶۸۲ھ جو الامام الفقیہ الزاہد الخطیب اور قاضی القضاة تھے۔ (مقدمہ مغنی ص ۱۲)

[3] المتوفی ۸۶۱ھ اپنے وقت کے امام محدث اور فقیہ تھے اور ان کا شمار اہل ترجیح میں ہے۔ (فوائد البہیہ ص۱۸۰)

[4] المتوفی ۱۰۱۴ھ علم وتحقیق کے یگانہ اور محدث وفقیہ تھے۔ (تعلیقات ص ۸)

نوٹ: یہ کتاب نواب صاحبؒ کی مشہور کتاب "لقطة العجلان" کے ساتھ منضم ہے۔
اور دونوں یکجا طبع ہوئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہم مبارک پوری صاحبؒ کو اور کیا ثبوت دے سکتے
ہیں؟

دوسرا اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت کا خطاب مومنوں کو نہیں بلکہ کافروں کو
ہے۔ جو تبلیغ کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قرآن نہ سنو جیسا کہ امام
رازیؒ نے اپنی تفسیر (الکبیر جلد ۴ ص ۵۰۲) میں لکھا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی
خطاب مومنوں کو ہوتا تو لَعَلَّكُمْ کے لفظ کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ یہ لفظ ترجی کے لیے
آتا ہے اور مومن بہر حال رحمت خداوندی کا مورد اور مستحق ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵
تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹) اور مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں اور نہ اس کا خطاب مومنوں
سے ہے جس نے اس کا خطاب مومنوں سے سمجھا اس نے سلسلۂ عبارت اور سیاق
مضمون پر غور نہیں کیا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۵۰۲) اور یہی مضمون کم و بیش مولانا عبد الصمد
صاحب پشاوریؒ لکھتے ہیں۔ (اعلام از اعلام ص ۱۹۰) اور یہی عذر لنگ مؤلف خیر الکلام نے
کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۴۳)

جواب

یہ اعتراض بھی بالکل بے جان اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ آپ جناب رسول خدا صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابن مسعودؓ سے لے کر قاضی شوکانیؒ تک اکثر حضرات
مفسرین کا بلکہ تمام امت کا اجماع و اتفاق سن چکے ہیں کہ اس آیت کا خطاب نہ صرف مومنوں
سے ہے بلکہ اس کا شان نزول ہی نماز ہے۔ اس اجماع کے مقابلہ میں ایسے لغو اور پادر ہوا
نظریہ اور رائے کو کون سنتا ہے؟ ہم سہولت کے لیے اس اعتراض کا یوں تجزیہ کر سکتے ہیں
یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے کہ بات سمجھ آ سکے، کہ ان حضرات کے اعتراض کے یا
بزعم خود استدلال کے تین مرکزی نقطے ہیں۔ ہم ان کو الگ الگ بیان کر کے ان کا جائزہ
لیتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہ آیت کافروں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ مومن اس کے مخاطب

نہیں ہیں - دلائل یہ ہیں :

(۱) امام رازیؒ نے یوں کہا ہے -

۲- لَعَلَّکُمْ کا لفظ اس کی تائید کرتا ہے -

۳- سیاق و سباق کا تقاضا یہی ہے -

پہلی جزو کا جواب

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت امام رازیؒ (المتوفی ۶۰۶ھ) منطق و فلسفہ اور عقلیات وغیرہ کے مسلّم امام تھے - لیکن فنِ روایت اور نقلیات میں ان کا پایہ نہایت کمزور تھا - حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں امام رازیؒ عقلیات کے مسلّم امام ہیں، لیکن احادیث و آثار میں ان کا پایہ کمزور ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر میں رطب و یابس سبھی کچھ موجود ہے - (لسان المیزان جلد۴ ص۴۲۶) امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ تفسیر کبیر میں سبھی کچھ ہے مگر اس میں تفسیر نہیں - (درمنثور جلد۳ ص۱۵۵ و اتقان جلد۲ ص ۱۸۹) - نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ مؤلف وے از علم حدیث بے خبر است و در علوم کلام و فنون رسمیہ امام اہل زماں بعضے از اہل معرفت بعلوم کتاب وسنت گفتہ اند - فیہ کل شیء الا التفسیر - (اکسیر ص۱۰۲)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ رازیؒ از علم حدیث خبر ندارد (اکسیر ص۱۱۳) فریقِ ثانی ہی ازراہِ انصاف فرمائے کہ قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت کی تفسیر جو حضرات صحابہ کرام رضؓ و تابعینؒ اور جمہور سلف و خلفؒ سے صحیح اسانید سے نقل کی جا چکی ہے (بلکہ اسی پر اُمّت کا اجماع ہے اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے) وہ قابلِ حجت ہے یا امام رازیؒ کی تفسیر: ؎

من نہ گویم کہ ایں مکن آں کُن !
مصلحت بین و کار آساں کُن !

دوسری جزو کا جواب

امام رازیؒ کا لفظ لَعَلَّ سے یہ استدلال کرنا کئی وجوہ سے غلط ہے :

اوّلاً : لفظ لَعَلَّ اگرچہ ترجی کے معنٰی میں ہے - لیکن حضرات مفسرین کرامؒ اور ائمہ نحو اس

امر کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوب کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، علامہ خازنؒ لکھتے ہیں، لَعَلَّ و عسٰی من اللہ واجب (جلد۲ ص۲۲۳) اور صاحب مدارک علامہ عبداللہؒ بن احمد النسفیؒ (المتوفی ۷۰۱ھ) لکھتے ہیں کہ

ولعل للترجی والاطماع ولکن من کریم فیجری مجری وعدہ المحتوم وفائہ وبہ قال سیبویہؒ۔

تعلّ کا لفظ ترجی اور طمع دلانے کے لیے آتا ہے۔ لیکن ذاتِ باری سے یہ حتمی اور ضروری وعدہ کے طور پر آتا ہے اور سیبویہؒ اسی کا قائل ہے۔

(مدارک جلد۱ ص۵)

علامہ جاراللہ رحؒ لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کا وعدہ کرتے ہیں تو اپنی شانِ استغنا کو ملحوظ رکھ کر لَعَلَّ و عسٰی استعمال کرتے ہیں۔ (کشاف جلد۱ ص۹۲)

اور مولانا تھانویؒ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) لکھتے ہیں، شاہی محاورہ میں لَعَلَّ کے معنی عجب نہیں کے آتے ہیں۔ (بیان القرآن جلد۱ ص۱) لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ بے نیازی کے مطابق لعلّکم کے لفظ کے ساتھ مومنوں سے خطاب کیا ہے تو اس میں خرابی کیا ہے؟

ثانیاً۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مومنوں کے لیے لعلّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ نہ معلوم وہاں یہ منطق کیسے چلے گی؟ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے لعلّکم تتقون۔ (پ۲۔ بقرۃ) تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف اے مومنو سب کے سب لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (پ۱۸۔ نور ع۴) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں خطاب بھی تمام مومنوں کو ہے جب مومن ہیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ قَدْ افلح المومنون۔ (پ۱۸ المؤمنون رکوع۱) تحقیق مومن فلاح پا چکے ہیں۔ اگر لعلّکم کے خطاب سے مومن مراد نہیں ہو سکتے تو قرآنِ کریم کی اِن آیات کا کیا مطلب ہو گا؟

اور ایک مقام پر یہ فرمایا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو تم جلدی پہنچو۔ آگے ارشاد ہوتا ہے لعلّکم تفلحون (پ جمعہ۲۸) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

وثالثاً۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو کیا قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ بعض مومن اپنی ناشائستہ حرکات کی بنا پر خدا تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں رہتے ؟ کیا قاتل، چور، شرابی، زانی، راشی اور سُود خور وغیرہ کے لیے لعنت اور غضب وغیرہ کے الفاظ قرآنِ کریم اور حدیث میں وارد نہیں ہوئے ؟ اور کیا وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے حق دار اور محتاج نہیں ؟ یا ان کے لیے یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی رحمت کے دروازے کھلے اور رحمت واجب ہے ؟ اور کیا رحمت کا مستحق صرف کافر ہی ہو سکتا ہے ؟

ورابعاً۔ تمام علمائے اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآنِ کریم تمام اقوام عالم کے لیے ایک دستور العمل اور ضابطۂ حیات ہے اور قرآن کے کسی حکم اور آیت کو اس کے شان نزول اور خاص سبب پر منحصر کر دینا بالکل بے کار اور بے حقیقت ہے۔ اگرچہ اکثر احکام کے نزول کا کوئی نہ کوئی سبب اپنی جگہ ضرور ہو گا۔ حضرت امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ آیات کے اسباب وشان نزول کچھ ہی ہوں۔ مگر احکام کی دار و مدار الفاظ پر ہے۔ (کتاب الام جلد ۵ ص ۲۴۱)

حافظ ابنِ تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے عمومی احکام کو اسباب نزول پر مقید کر دینا باطل ہے۔ (الصارم المسلول ص ۵۰) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ جمہور علماء اصول و فروع کے نزدیک اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۹) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جن اسباب کی وجہ سے عبادات کی مشروعیت ہوئی ہے۔ ان کا دوام شرط نہیں ہے، جیسا کہ طواف میں رمل اور صفا و مروہ پر سعی کا سبب مشرکین کا اعتراض تھا، لیکن باوجود ان مشرکوں کے ختم ہونے کے اس کا حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ (بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۱۶۱)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا (فتح الباری جلد ۸ ص ۱۴۱)

امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار تعمیم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا (اتقان جلد ا ص ۴۷)

قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ عام کو سبب پر بند کر دینا مرجوح اور کمزور مذہب ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۲۹)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اعتبار عموم لفظ کا ہو گا۔ (دلیل الطالب ص ۴۱۳) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: وعبرت

بعموم لفظ است نہ بخصوص سبب، چنانکہ در اصول مقرر است (بدور الاہلہ ص ۲۰۹)
مولانا عبد الصمد پشاوریؒ لکھتے ہیں کہ والحق ان المقرر اعتبار عموم المبنی و
لو خص سببہٗ (اعلام الاعلام ص ۱۹۰) اور اس قاعدہ کو مبارک پوری صاحبؒ بھی
صاف لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۳) مؤلف خیر الکلام
نے پہلے تو لاجواب ہو کر اِدھر اُدھر کی بے کار باتیں کی ہیں پھر اقرار پر بھی مجبور ہو گئے ہیں۔
چنانچہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت نماز کو بھی شامل ہے خواہ اس طرح شامل ہو کہ اس آیت میں
مقتدیوں کو خطاب ہو یا سب مسلمانوں کو جس میں مقتدی بھی داخل ہیں یا اس طرح شامل ہو کہ
خطاب تو کفار کو ہو مگر نمازی اور سب مسلمان عموم علت کی بنا پر داخل ہوں۔ (الخ ص ۳۴۸)
اگر بالفرض آیت مذکورہ کا شانِ نزول صحیح روایات اور آثار سے نماز نہ بھی ثابت ہوتا۔ بلکہ
یہ آیت کافروں کے حق میں ہی نازل ہوتی۔ تب بھی اس کو کافروں پر منحصر سمجھنا اور مسلمانوں
اور مومنوں کو اس سے خارج کر دینا باطل ہے۔ حالانکہ اس کا شانِ نزول ہی (مومن اور)
نماز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فریقِ ثانی یہ کہتا ہے کہ اس آیت کا جو اوّلین سبب اور
مصداق تھا۔ اس کو یہ آیت شامل نہیں ہے۔ یہ تو صرف کافروں کو شامل ہے۔ حیرت
اور تعجب ہے اس غلط نظریہ پر۔
وخامسًا۔ اگر فریق ثانی کی یہی منطق صحیح تسلیم کر لی جائے تو نہ معلوم ان کا قرآنِ کریم
کے ان عمومی احکام کے بارے میں کیا ارشاد ہو گا جو بظاہر ایک کافر اور مشرک قوم کے
بارے میں نازل ہوئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے نبیؐ آپ
ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں، جو تمہارے رب نے تم
پر حرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ قتلِ اولاد کا ارتکاب نہ کرو۔
فواحشات کے قریب نہ جاؤ۔ خون ناحق نہ کرو۔ یتیم کا مال نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ (پارہ ۸،
سورۃ انعام) کیا یہ کہنا بجا اور صحیح ہو گا کہ یہ احکام تو کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل
ہوئے ہیں۔ لہٰذا مومن کے لیے شرک کرنا، قتل کرنا اور یتیم کا مال ہڑپ کر لینا بالکل جائز
ہے؟ فریق ثانی نے یہ عجیب قاعدہ نکالا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ فرما دیں کہ ہم تو گروہ بندی کا

شکار ہو کر قاعدہ سے بے نیاز ہیں ۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ　　　　اے اسیرانِ قفص میں نوگرفتاروں میں ہیں

تیسری جزو کا جواب

ہو سکتا ہے کہ رہبر صاحبؒ کا سیاق و سباق کے بارے میں قاعدہ ہی کوئی نرالا اور ماوراء الادراک ہو اور ہم اس کو نہ سمجھ سکیں۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ اس آیت کا سیاق اور سباق ہم بیان کر سکتے ہیں اور رہبر صاحب کو فکر و غور کی دعوت دیتے ہیں اور مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ارشاد فرمائیں کہ غور کس نے نہیں کیا؟

اہلِ ایمان کے تین درجے ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ جو لوگ توحید و معرفت کے تمام زینوں کو طے کر کے اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں کہ کارخانۂ زمین و آسماں کی علوی اور سفلی چیزیں مشاہدہ کے طور پر ان کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ عین الیقین تک پہنچ جاتے ہیں تو ایسے لوگ اصحاب بصیرت کہلاتے ہیں اور جو لوگ نظر و استدلال سے کسی حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ علم الیقین کے درجہ تک پہنچ کر خود ان کا قدم ہدایت سے ایک انچ نہیں ہٹتا اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں تو وہ ہادی اور مہدی کہلاتے ہیں اور جن کو نہ پہلا درجہ حاصل ہوتا ہے اور نہ دوسرا، صرف یہی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے وہ گروہ عامۃ المومنین کا ہے، جن کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق رحمت کے امیدوار ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ.

(پ ۹، اعراف ۲۴)

یہ سمجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو مومن ہیں اور جس وقت قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کو علی الترتیب **هٰذا بصائر من ربکم و هدی و رحمۃ** کے ارشاد سے بیان فرما کر لقوم یؤمنون کہہ کر سب کو مومن کا خطاب

اور لقب عطا فرمایا ہے اور آگے قرآن کریم کی طرف توجہ کرنے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے زیادہ صحیح اور مضبوط ربط اور کیا ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت لقوم یومنون۔ پر ختم ہوتی ہے اور دوسری واذا قرئ القرآن الآیۃ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کا ذکر ہوتا ہے اور دوسری آیت میں بصیرت، ہدایت اور رحمت کے سرچشمے قرآن کریم کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ کی رحمت کا ذکر ہے اور دوسری میں لعلکم ترحمون سے مستحقین رحمت کا تذکرہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس مضمون کا اپنے سیاق و سباق سے اور کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور تمام اہل اسلام اور جملہ معتبر مفسرین کرامؒ اس کا یہی ربط اور تعلق سمجھے ہیں۔ خوفِ طوالت سے صرف دو شہادتیں ہی نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

علامہ خازنؒ لکھتے ہیں کہ

واذا قرئ علیکم ایھا المؤمنون القرآن فاستمعوا لہ یعنی اصغوا الیہ باسماعکم لتفھموا معانیہ وتتدبروا مواعظہ وانصتوا یعنی عند قرأتہ۔

(تفسیر خازن جلد ۲ ص ۲۷۲)

اے مومنو! جب تم پر قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو یعنی بگوش ہوش اس کی طرف مائل ہو جاؤ تاکہ تم اس کے معانی سمجھو اور اس کی نصائح سے تدبر اور غور کر کے فائدہ حاصل کرو اور اس کی قرأت کے وقت خاموش رہو۔

اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ کافر لوگ قرأتِ قرآن کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے۔

وقد امر اللہ عبادہ المؤمنون خلاف ذلک فقال واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۸۹)

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جاتا ہو تو تم اس کو سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کے سردار سیّد الانبیاء وامام المرسلین وخاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے کہ آپ اپنے رب کو دل میں عاجزی اور زاری کرتے ہوئے صبح و شام یاد کرتے رہیں گو خطاب آپ کو ہے لیکن گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کے قاعدہ کے مطابق حکم سب کو دیا گیا ہے۔

بہر حال اس آیت سے قبل بھی مومنوں کا ذکر ہے اور بعد بھی اکمل ترین مومن سے خطاب

ہے۔ میر صاحب کو اس سے بہتر سیاق وسباق کہاں سے ملیگا مگر ہاں یہ بات الگ ہے کہ دو نسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بفضلہ تعالیٰ ہم نے تو حقِ وفا ادا کر دیا ہے شاید آپ فرماویں ؎

بلک کر کہ رہا ہے جانے کیا کیا تیرے گوشے میں
عجب انداز ہے اس کا یہ کوئی دل جلا ہوگا۔

تیسرا اعتراض؛

مبارک پوری صاحبؒ (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے (کتاب القرأۃ ص ۵۷ میں) لکھا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے قرأت خلف الامام کے عدم جواز پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص۱۴۵)

جواب

یہ اعتراض بھی بے حقیقت اور بے کار ہے؛ اوّلاً: اس لیے کہ دلائل اور براہین سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ہی نماز ہے خطبہ وغیرہ اس کے عمومی اور ضمنی حکم میں شامل ہے۔

وثانیاً۔ خطبہ سے اگر جمعہ کا خطبہ مراد ہو تو امام بغویؒ کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جمعہ کی فرضیت مدینہ میں ہوتی ہے اور آیت مکّی ہے۔ اور امام ابن جریرؒ لکھتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت سلہ ھ میں ہوئی ہے حالانکہ آیت مذکورہ بالاتفاق مکّی ہے اور مولانا عبد الصمدؒ لکھتے ہیں کہ جو لوگ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ بتلاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں کیونکہ یہ آیت مکّی ہے اور خطبہ کا حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ (اعلام الاعلام ص۱۸۹) اور اگر خطبہ سے مراد عید کا خطبہ ہے تو وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ عید کی نماز کا حکم بھی مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ (طبری ص ۱۲۸۱)

وثالثاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس آیت کا شانِ نزول جمعہ یا عید کا خطبہ ہے۔ تو اس سے نماز کو بالیقین خارج کرنا کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے؟ جب کہ امت کا ایک معتد بہ طبقہ اس کا قائل ہے کہ اسبابِ نزول میں تعدد بھی جائز ہے جیسا کہ شیخ عبد الرحمٰن بن حسنؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (فتح المجید شرح کتاب التوحید ص۱۵)

اور صحیح[1] احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اس کا شانِ نزول خطبہ بھی ہو اور نماز بھی ہو تو اس میں کیا قباحت ہے ؟ اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا۔ الحاصل یہ اعتراض نقلاً و عقلاً ہر لحاظ سے مردود ہے اور ایک بھی صحیح روایت اس کی تائید نہیں کرتی کہ آیت مذکورہ کا شان نزول خطبہ ہے۔ روایات پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ رہی یہ بات کہ یہ نظریہ امام بیہقیؒ ایسے مشہور امام کا ہے تو یہ کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اگرچہ ایک مشہور محدث ہیں۔ مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲، ص ۳۲)

---

[1] مثلاً بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ و ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ و نسائی جلد ۱ ص ۱۱۶ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں آیت لا تجهر بصلوٰتك ولا تخافت بها ... الآية کا شانِ نزول نماز بیان کیا گیا ہے۔ اور بخاری جلد ۲ ص ۶۸۷ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ اور ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ میں اسی آیت کا شان نزول دعا بتلائی گئی ہے اور محققین کی تصریح ہے کہ یہ تعدد اسباب نزول کا واضح ثبوت ہے۔

فائدہ : یہ تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ آیت مذکورہ کا صحیح اور حقیقی شان نزول نماز اور صرف نماز ہے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا شان نزول خطبہ ہے تو وہ صرف اس مفہوم کے اعتبار سے کہ اس آیت کا مضمون عموم الفاظ کے لحاظ سے خُطبہ کو بھی شامل ہے۔ گویا یہ بھی اس کا شان نزول ہے۔ چنانچہ امام سیوطیؒ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۱ میں) اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ (الفوز الکبیر ص ۲۲ میں) اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "وقسمے آنست کہ معنی آیت خود تام است بغیر احتیاج دانستن حادثہ کہ سبب نزول شدہ است و حکم عموم لفظ راست نہ خصوصِ سبب را قدمائے مفسرین بقصد احاطۂ آثار مناسبہ بآں آیت یا بقصد بیان ماصدق آں عموم آں قصہ را ذکر کردہ اند ایں قسم را ذکر کردن ضرور نیست۔ وصحابہؓ و تابعینؒ بسیار بود کہ نزلت فی کذا و کذا می گفتند و غرض ایشاں تصویر ما صدق آں آیت بود و ذکر بعض حوادث کہ آیت آں را بہ عموم خود شامل شدہ است خواہ ایں قصہ متقدم باشد یا متاخر و خواہ اسرائیلی باشد .... یا جاہلی یا اسلامی تمام قیود آیت را در گرفتہ باشد یا بعض آں را و ازیں جا دانستہ شد کہ اجتہاد را دریں قسم دخلی ہست و قصص متعددہ را آں جا گنجائش پس ہر کہ ایں نکتہ مستحضر دارد حل مختلفات سبب نزول بادنیٰ عنایت میتواں نمود۔ (اکسیر ص ۱۹) بہر حال شان نزول اس واقعہ میں گو نماز ہے لیکن خطبہ بھی ماصدق آں آیت کا مصداق ہے۔

چوتھا اعتراض

مُبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قری القرآن .... الآیۃ قرآن کریم کی دوسری آیت فاقرؤا ماتیسر من القرآن .... الآیۃ سے منسوخ ہے۔ لہٰذا اس سے مسئلہ خلف الامام کیسے ثابت ہوگا اور اس دعویٰ کے دلائل یہ ہیں:

۱- امام ابونصر مروزیؒ (المتوفی ۲۹۴ھ) لکھتے ہیں کہ آیت فاقرؤا .... الآیۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں جہاد اور قتال کا حکم ہے اور جہاد کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔ (قیام اللیل صـ)

۲- امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ باقی تمام سورۃ مزمّل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر فاقرؤا ما تیسّر ... الآیۃ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۱۳)

۳- حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ روزے بالاتفاق مدینہ فرض ہوئے ہیں اور حضرت قیسؓ رضؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل ہمیں صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم تھا۔ جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو نہ ہمیں فطرانہ ادا کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا اور اور نہ اس سے منع کیا گیا۔ (فتح الباری جلد ۴ ص ۱۱) اور اس آیت فاقرؤا ماتیسّر ...... الآیۃ میں زکوٰۃ کا حکم بھی ہے۔ اور زکوٰۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی اور صدقہ فطر صوم رمضان کا تتمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت فاقرؤا ماتیسّر ... الآیۃ مدنی ہے۔ لہٰذا یہ ناسخ اور آیت واذا قری القرآن ... الآیۃ منسوخ ٹھہری اور منسوخ آیت سے استدلال اور احتجاج باطل ہے۔

(او کما قال تحقیق الکلام ۲ صـ۳۶)

جواب: یہ دعویٰ بھی قطعاً باطل اور بے بنیاد ہے۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی شق کا جواب: حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابونصرؒ کا یہ دعوےٰ غلط ہے۔ اس لیے کہ تمام اہل اسلام اس پر متفق ہیں کہ سورۃ مزمّل کی آخری آیت بھی مکی ہے۔ امام ابونصرؒ کو قتال اور جہاد کے حکم سے جو شبہ ہوا ہے۔ وہ مردود ہے۔ کیونکہ اس میں ارشاد یوں ہوتا ہے۔

لہ ان کی یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۶۹، ابن ماجہ ص ۱۳۲، طیالسی صـ۱۶۸ اور مستدرک جلد ۱ صـ۴۱۰ وغیرہ میں مروی ہے۔

عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ ... الآیۃ

اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ عنقریب تم میں بعض آدمی بیمار ہوں گے اور بعض دیگر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکلیں گے۔

اور بیماری وسفر میں پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز ادا نہیں ہو سکے گی۔ اس کی تاکید اللہ تعالیٰ نے ساقط کر دی ہے اور اس آیت میں سَیَکُوْنَ (حرف سین جو استقبال کے لیے آتا ہے) سے خوشخبری سنا کر وجودِ[1] مشقت سے پہلے ہی تہجد کی نماز کی فرضیت ساقط کر دی گئی ہے۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ جہاد اور قتال کا حکم اس وقت نازل ہو چکا تھا؟ بہر حال آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور اس میں زمانہ مستقبل میں جہاد اور قتال کے حکم کی خوشخبری سنائی گئی ہے اگر امام ابو نصرؒ سیکون میں حرف سین پر ہی نگاہ ڈال لیتے جو استقبال کے لیے آتا ہے تو ایسی فاحش غلطی کا ارتکاب نہ کرتے اور نہ اس آیت کو مدنی کہنے پر مجبور ہوتے۔ (فتح الباری جلد۸ ص ۳۹۳)

دوسری شق کا جواب: امام سیوطیؒ نے یہ قول نقل کیا ہے لیکن پورے زور کے ساتھ اس کی تردید بھی کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورۂ مزمل کی آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ[2] رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سورۂ مزمل کا آخری حصہ پہلے حصہ کے نزول کے پورے ایک سال بعد نازل ہوا ہے۔ (تفسیر اتقان جلد۱ ص ۳۸) اور سورۂ مزمل قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے چنانچہ مبارک پوری صاحب لکھتے سب سے پہلے سورۂ قلم نازل ہوئی اور اس کے بعد سورۂ مزمل۔ (تحقیق الکلام جلد۲ ص ۲۸)

---

[1] اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وجودِ مشقت سے قبل تنسیخ صحیح نہیں یا اس میں تردد ہو تو اس کو معراج کی وہ طویل حدیث پڑھنی چاہیے جس میں پچاس نمازوں کی فرضیت کے بعد وجود مشقت سے قبل ہی باقی سب نمازیں معاف کر کے صرف پانچ ہی باقی رکھی گئیں ہیں۔

[2] ان کی یہ روایت مسلم جلد۱ ص ۲۵۶، نسائی جلد۱ ص ۱۸۲، ابو عوانہ جلد۲ ص ۳۲۲ اور مستدرک جلد۲ ص ۵۰۴ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے اور اسی مضمون کی روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ مستدرک جلد۲ ص ۵۰۵ وسنن الکبریٰ جلد۲ ص ۵۰۰۔ الغرض یہ صحیح روایتیں ابن عرسؒ کی اس روایت سے جس میں یونسؒ بن حبیبؒ وغیرہ راوی موجود ہیں جن کا اتا پتا کتب رجال سے نہیں ملتا۔ بدرجہا زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔

جب صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا کہ سورۂ مزمّل من وعن سب مکّی ہے تو اس کو مدنی کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

تیسری شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی صحیح نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ نفس زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرّمہ میں نازل ہو چکا تھا۔ کیونکہ سورۂ مومنون، سورۂ حم سجدہ اور سورۂ لقمان وغیرہ تمام مکّی سورتوں میں زکوٰۃ کا حکم موجود ہے پھر یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض نہیں ہوئی تھی۔ باقی یؤتون الزکوٰۃ کو تزکیۂ نفس پر محمول کرنا تاویل بعید اور توجیہ رکیک کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور حضرت جعفر طیار رضؓ نے دربار نجاشیؒ میں جو تقریر کی تھی اس میں زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے حالانکہ مہاجرین حبشہ ۵ نبوت میں ہجرت کر گئے تھے۔ (طبری ص ۱۱۱۸، زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۱)

امام الائمہ ابن خزیمہؒ المتوفی ۳۱۱ھ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (فتح الباری ج۳ ص۲۱۱)

امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۲۳۵) سید آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ اکثر علما کی تحقیق یہ ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (روح المعانی جلد ۱۹ ص ۱۴۱) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ سورۂ مزمّل کی آخری آیت ان لوگوں کی تائید کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نفس زکوٰۃ تو مکہ میں فرض ہو چکی تھی لیکن اس کے نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۴۳۹)

حضرت ابن عمر رضؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اور تعیین نصاب سے پہلے اپنی ضرورت سے زائد سب مال صرف کر دینے کا حکم تھا۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۱۶) اس تحقیق کو پیش نظر رکھنے کے بعد حضرت قیس رضؓ بن سعد کی روایت کا مطلب یہ ہو گا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کی تعیین سے قبل صدقہ فطر کی اس لیے تاکید کی جاتی تھی تاکہ فقراء اور مساکین کی امداد اور اعانت

۱؎ یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ صـ۱۹۲ میں مختصراً اور مسند احمد جلد ۵ ص ۲۹۱ اور مستدرک جلد ۲ ص ۳۱۰ وغیرہ میں مفصلاً موجود ہے۔ قال الحاکمؒ والذہبیؒ علی شرطھما۔

۲؎ یہ بات بھی نہ بھولیے کہ صحابہ کرام رضؓ کی مکی زندگی اور مدینہ طیبہ کا ابتدائی دور غربت اور افلاس کا دور تھا اس میں زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا صدقہ فطر کے تاکیدی حکم سے اس کی تلافی کر دی گئی تھی۔

بخوبی ہو سکے اور جب ۸ھ کے لگ بھگ زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار مقرر ہوئی تو صدقہ فطر کا وہ تاکیدی اور فرضی حکم باقی نہ رہا۔ گو روزہ و صدقہ فطر کا حکم اور زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی اور صدقہ فطر بعض ائمہؒ کی تحقیق میں اب بھی واجب ہے مگر فرض نہیں۔

اس بحث کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے مبارک پوری صاحبؒ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ کس بے باکی سے یہ لکھتے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر... الآیۃ مدنی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶) فوا اسفا آپ دلائل واضحہ کے ساتھ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی عقلی اور نقلی شہادتوں سے فاقرؤا ما تیسّر.... الآیۃ کا مکی ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

پانچواں اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ فاقرؤا ما تیسّر... الآیۃ سے واذا قرئ القرآن... الآیۃ منسوخ نہیں۔ لیکن اس میں نسخ کا احتمال تو موجود ہے۔ جب اس میں یہ احتمال موجود ہے تو اس سے استدلال کیسے؟ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ نسخ کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ وہ محض بے بنیاد احتمالات سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اثبات کے لیے قطعی، محکم اور اٹل دلائل کی ضرورت ہے اور صرف ظن اور تخمین سے قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔

وثانیاً۔ یہ احتمال صرف مبارکپوری صاحبؒ کے خیالِ مبارک میں ہی آیا ہے یا امام احمدؒ بن حنبلؒ، حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ بلکہ جمہور سلف و خلفؒ کو بھی یہ نکتہ ہاتھ آیا ہے؟ اگر یہ احتمال کسی دلیل و برہان پر مبنی ہوتا تو جمہور اہل اسلام کا اس آیت سے استدلال کیسے صحیح ہوتا؟ اور باوجود ان حضرات کے علم کی گہرائی کے اس احتمال کی طرف ان کا ذہن کیوں نہ گیا؟

وثالثاً۔ خود مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت فاقرؤا ما تیسّر سے قرأت کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۷) تو اس آیت سے ہر ہر مقتدی کی قرأت کے وجوب پر استدلال کیونکر درست ہوا؟ اور آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ اس سے منسوخ کیسے ٹھہری؟ کیونکہ اس میں استماع اور انصات کا حکم سب مقتدیوں پر بہر حال واجب اور

لازم ہے اور فاقرؤا سے فرضیت ہی ثابت نہیں ہے۔
ورابعًا۔ مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سورۂ مزمل پہلے نازل ہوئی ہے۔ (جس میں فاقرؤا ما تیسّر کی آیت ہے) اور سورۂ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے (جس میں واذا قرئ القرآن ... الآیۃ ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۹) اور پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ مزمل کا آخری حصہ بھی مکی ہے اور اوّل و آخر میں صرف ایک سال کا وقفہ ہے۔ پھر محض خیال سے متاخر سورت کو متقدم سے منسوخ کرنے کا کیا مطلب ؟
وخامسًا۔ نواب صاحبؒ سورہ اعراف کے متعلق لکھتے ہیں کہ دروے یک آیت یا دو آیت منسوخ است باقی ہمہ محکم۔ اوّل۔ خذ العفو و أمر بالعرف۔ دوم۔ واعرض عن الجٰھلین (افادۃ الشیوخ ص ۶۵) تو محکم آیات کے منسوخ ہونے کا کیا معنٰی ؟
چھٹا اعتراض: مولانا میر صاحب سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں میں احناف کے نزدیک تعارض ہے۔ جیسا کہ ملّا جیونؒ اور صاحب تلویحؒ نے لکھا ہے۔ لہٰذا اس تعارض کے ہوتے ہوئے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۲۳۸) مبارک پوری صاحبؒ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۸، ابکار المنن ص ۱۴۸ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۸)

جواب :

بلاشک ملّا جیون حنفی تھے لیکن مدار صرف دلائل پر ہے۔ شخصیتوں پر نہیں ہے اور تلویح کے مصنف علامہ سعد الدین تفتازانیؒ (المتوفی ۷۹۱ھ) حسب تصریح علامہ حسن چلپیؒ (المتوفی ۸۸۶ھ) و علامہ سیوطی رحؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) و علامہ محمود الکفوی رح (المتوفی ۹۹۰ھ) و علامہ کاتب چلپی رح (المتوفی ۱۰۶۷ھ صاحب کشف الظنون) شافعی المسلک تھے۔ احناف میں ان کا شمار غلط ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تعارض کے لیے شرائط کیا ہیں ؟ حافظ ابن حجر رح (شرح نخبۃ الفکر ص ۴۷ میں) بیان کرتے ہیں کہ تعارض کی شرطیں یہ ہیں:

۱۔ دونوں حکموں کا محل ایک ہو۔
۲۔ تقدم اور تاخر معلوم نہ ہو سکے۔

۳- ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے۔

۴- دونوں میں تطبیق نہ ہوسکے۔ مگر ان دونوں آیتوں میں تعارض کی ایک شرط بھی موجود نہیں ہے۔

دونوں کا محل جُدا جُدا ہے: ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول فرضی نماز ہے اور آیت فاقرؤا ما تیسّر کا محل نماز تہجد ہے جیسا کہ ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۹۲ اور عون المعبود جلد ۱ ص ۵۰۳ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے اور امام بیہقی رحمہ لکھتے ہیں: وھذا معروف مشھور فیما بین اھل العلم۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۵۳) اور یہ امر اہل علم میں مشہور و معروف ہے اور حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ یہ آیت صلاۃ تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۳۷۸) خطیب شربینیؒ جو بڑے پایہ کے مفسر تھے لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول تہجد کی نماز ہے۔ (السراج المنیر جلد ۴ ص ۲۴۸) علامہ ابوالسعودؒ لکھتے ہیں کہ یہ صلاۃ تہجد کے بارے میں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود بر کبیر جلد ۸ ص ۴۸۵) مبارک پوری صاحبؒ بھی صاحبِ روح المعانی سے یہ مضمون نقل کرتے ہیں (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۷)۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ نزلت فی قیام اللیل فلیست مما نحن فیہ (نیل جلد ۲ ص ۲۱۸) یعنی یہ آیت نماز تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ہمارے اس مسئلہ سے (کہ سورۃ فاتحہ رکن ہے یا جہاں سے بھی پڑھ لیا جائے صحیح ہے) اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سورہ مزمّل کا یہ رکوع نماز تہجد میں تخفیف کے لیے اترا ہے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۴۴۳) جب ایک آیت کا محل فرضی نماز ہے اور دوسری کا تہجد کی نماز ہے تو پھر تعارض کیسے؟ کیونکہ تعارض کے لیے وحدت محل شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔

دونوں کا تقدّم اور تأخّر: پہلے پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ ان کے تقدم اور تأخّر کا علم ہے اور تو اور خود مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اقرار ہے کہ سورۃ مزمّل پہلے اور سورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے۔ سو تعارض کی یہ شرط بھی نہ پائی گئی۔

وجہ ترجیح:

اگر بالفرض دونوں کا محل بھی ایک ہوتا اور تقدّم و تاخر بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی واذاقرئ القرآن ... الآیۃ کے حکم کو ترجیح ہوتی۔ کیونکہ صحیح روایات اور آثار اور جمہور سلف و خلف کی اکثریت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مقتدی کو قرآت خلف الامام سے منع کیا گیا ہے ترجیح کے لیے یہ دلیل کیا کم وزنی ہے؟

جمع و تطبیق: علاوہ بریں ان دونوں آیتوں میں جمع و تطبیق بھی چنداں دشوار اور مشکل نہیں ہے کیونکہ واذاقرئ ... الآیۃ مقتدی کے حق میں ہے جو با جماعت فرض نماز پڑھتا ہو اور فاقرؤا ما تیسّر تہجّد کی نماز کے بارے میں ہے جو انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی آیت صرف سورۃ فاتحہ کو شامل ہو کیونکہ قرآن العظیم کا اطلاق اسی پر ہوا ہے اور فاقرؤا ما تیسّر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہو۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: کہ حضرت ابن عباس رضؓ سے بسند صحیح یہ روایت مروی ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۶، ص ۱۵۳، ۱۵۴) اور امام دارقطنیؒ حضرت ابن عباسؓ سے باسناد حسن اسی مضمون کی روایت نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لیے حجت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فاقرؤا ما تیسّر ما زاد علی الفاتحہ پر محمول ہے۔ (دارقطنی جلد ا ص ۱۲۹) اور میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ الغرض آیت فاقرؤا ما تیسّر میں اگر قرآت سے مراد قرأت القرآن فی الصلوٰۃ مراد لی جائے تو اس سے مراد فاتحہ کے بعد کی قرآت ہے۔ (واضح البیان ص ۴۴۵)

اور چونکہ فریقِ ثانی کے نزدیک بھی ما زاد علی الفاتحہ کی قرآۃ مقتدی کے لیے ممنوع ہے۔ لہٰذا اس سے مراد صرف منفرد ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر کا حکم امام کے لیے ہو۔ اور واذا قرئ القرآن صرف مقتدی کے لیے۔ اندریں حالات جب جمع و تطبیق کی صحیح صورتیں بھی سامنے موجود ہیں تو تعارض کا دعوےٰ بالکل باطل ہو گیا۔

ساتواں اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن..... الآیۃ پہلا

جواب خود حنفی دیوبندی کے قلم سے کہ جو شخص اس آیت سے خلف الامام کے منسوخ ہونے پر استدلال کرتا ہے اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ آیت افتراض صلوٰتِ خمسہ کے بعد نازل ہوتی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۵)

جواب

کیا قرأت خلف الامام کی ممانعت اور افتراض صلوٰت خمسہ میں کوئی علت اور معلول کا تلازم یا عرفی اور عادی تعلق ہے؟ کیا قرآنِ کریم کی تعظیم کے پیش نظر قرأت خلف الامام کی ممانعت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پانچ نمازیں ہی فرض ہوں۔ پانچ سے کم نمازوں میں یہ ممکن نہیں ہے؟ پہلے عرض ہو چکا ہے کہ دارو مدار دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ شخصیتوں پر۔ شخصیتیں قابل صد احترام ہیں مگر صحت و سقم کا مبنیٰ دلائل ہیں۔

آٹھواں اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القراٰن مکی ہے اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ لہٰذا متقدم حکم سے متاخر حکم کے خلاف استدلال درست نہیں ہو سکتا۔ اور مدینہ میں قرأت خلف الامام کے جواز پر یہ دلیلیں موجود ہیں:

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کا قول ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوتی (موطا امام مالک ص ۲۹)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضؓ کو نماز پڑھائی اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔ میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ اس حدیث کے آخر میں فرمایا: امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔ (کتاب القرأت ص ۵۱)

اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس پر اتفاق واجماع ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تلخیص الحبیر ص ۱۱۴)

لہ یہ مضمون انھوں نے اپنی مشہور کتاب الفرقان ص ۸۹ میں لکھا ہے اور اس کے مولف مولانا ناظر حسن صاحبؒ دیوبندی تلمیذ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہما ہیں۔

۲- حضرت عبادہؓ بن الصامت مدنی[لہ] ہیں اور انھوں نے قرأت خلف الامام کا ذکر کیا ہے۔
(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

میر صاحب سیالکوٹی رحؒ لکھتے ہیں کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ احادیث مثبتہ قرأۃ خلف الامام آیت واذا قرئ القرآن کے بعد فرمائی گئی تھیں۔ کیونکہ عبادہ رضؓ مدنی ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۲۴۵)

جواب ۔ یہ اعتراض بھی محض بے کار ہے: اوّلاً۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی کسی آیت اور حکم کو منسوخ ٹھہرانے کے لیے کسی محکم قطعی اور اٹل حکم کی ضرورت ہے۔ حضرت عبادہ رضؓ اور

لہ مبارک پوری صاحب رحؒ نے بزعم خود بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور لکھتے ہیں: اوّلاً۔ کہ اگرچہ حضرت عبادہؓ بن الصامت بیعت عقبہ اولیٰ (جو ۱۲ سنہ نبوت میں ہوئی تھی) اور بیعت عقبہ ثانیہ میں (جو ۱۳ سنہ نبوت میں ہوئی تھی) حاضر ہوگئے تھے۔ لیکن ان کی حاضری سے (یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لانے کیلئے حاضر ہونے سے) سورۂ اعراف پہلے نازل ہو چکی تھی کیونکہ مجمع البحار جلد ۲ ص ۵۲۰ میں لکھا ہے کہ ۱۰ سنہ نبوت میں پہلے سورۂ جن نازل ہوئی اور پھر سورۂ اعراف۔۔

وثانیاً۔ یہ کہ عقبہ اولیٰ سے قبل نماز باجماعت مشروع ہی نہ تھی۔ اس لیے بہرحال حضرت عبادہؓ کی حدیث کا یہ حکم آیت کے بعد ہی ہو گا۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸ ملخصاً) مگر یہ تمام مقدمات مخدوش ہیں۔ اوّلاً۔ اس لیے حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی مرفوع روایت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مکی ہوں یا مدنی فرق کیا ہو گا؟

وثانیاً۔ حافظ ابن کثیر رحؒ لکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ رجب ۱۲ سنہ نبوت میں اور بیعت عقبہ ثانیہ ۱۳ سنہ نبوت میں ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۳۵۹)

وثالثاً۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز ابتدائے نبوت سے مشروع تھی۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۸۲) حافظ ابن حجر رحؒ لکھتے ہیں کہ نماز باجماعت ابتدائے اسلام سے مشروع تھا۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۶۰) مسلم جلد ۲ ص ۲۹۶ اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۹۲ میں روایت ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ مسلمان ہو کر جب اپنی قوم کے پاس گئے تو حضرت ایماءؓ بن رحضہ ان کو جماعت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ حالانکہ حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے قبل مردوں میں حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت بلال رضؓ (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی اخبار احاد سے قرآن کریم کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے۔

وثانیاً۔ حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہو گا۔ پھر ایسی بے حقیقت، ضعیف کمزور اور معلول روایتوں نص قطعی کیونکر منسوخ ہو گئی؟ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے موطا امام مالک ص ۲۹ میں کوئی روایت ایسی نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ اگر مقتدی فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے رہی اُن کی مرفوع روایت خداج والی تو وہ موجود ہے اور ان کا قول اقرأ بھا فی نفسك یا فارسی بھی موجود ہے مگر اس کا مطلب بطلان صلوٰۃ نہیں ہے جس کی بحث جلد ثانی میں آرہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

وثالثاً۔ حافظ ابن حجر رحؒ لکھتے ہیں کہ کسی متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے متقدم الاسلام صحابی کی روایت کو بلا دلیل محض تقدم و تاخر کی وجہ سے منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۴۷) نہ معلوم متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے نص قرآنی کیسے منسوخ ٹھہرائی جاسکتی ہے؟

ورابعاً۔ کیا صرف حضرت عبادہ رضؓ اور حضرت ابوہریرۃ رضؓ ہی مدنی تھے یا حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت ابوالدرداء رضؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ بن بُحینہ رضؓ اور حضرت ابوبکرہ رضؓ وغیرہ بلکہ خود حضرت ابوہریرہؓ بھی جن سے قرأت خلف الامام کی ممانعت کی روایتیں مروی ہیں مدنی تھے؟

(بقیہ پچھلا صفحہ) اور بیبیوں میں صرف حضرت خدیجہ رضؓ مسلمان ہوئی تھیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۱ و اکمال ص ۵۹۴) مگر اس ابتدائی دور میں بھی جماعت ہوتی تھی۔

لہ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ناسخ مثل منسوخ باشد در قوت بلکہ اقوی ازاں چہ در صورت ضعف مزیل قوی نہ تواند شد و ایں حکم عقل است و اجماع برآں دلالت کردہ چہ صحابہ رضؓ نص قرآن را بہ خبر واحد منسوخ نہ کردہ اند۔ (افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ ص ۵)

حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ علماء حنفیہ کا ضابطہ یہ بیان کرتے ہیں۔ ان تخصیص العام القطعی بخبر الاحاد غیر جائز..... الخ (غیث الغمام ص ۲۲۵) کہ عام قطعی کی تخصیص خبر واحد سے جائز نہیں ہے۔

وخامسًا۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کے موقوف اور غیر صریح قول سے نص قرآنی کس طرح منسوخ ہوسکتی ہے۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ مرفوع حدیث کے مقابلے میں امت میں سے کسی کا قول قابل قبول نہیں ہوسکتا چنانچہ امام شافعی رحؒ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلے میں ماوشما کے قول کی کیا وقعت ہے؟ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۵۳)

امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں کسی کی بات حجت نہیں ہوسکتی۔ یحییٰ بن آدمؒ فرماتے تھے کہ مرفوع حدیث صحیح کے مقابلہ میں کسی کا قول معتبر نہیں ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص۸۴) امام بخاری رحؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب حدیث ثابت ہو جائے تو پھر کسی امتی کا قول قابل اعتماد نہیں ہے (جزء القراۃ ص۱۱) امام بیہقی رحؒ لکھتے ہیں کہ حضورؐ کی حدیث کے مقابلہ میں کسی امتی کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۷۳) محدث ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کی موجودگی میں کسی کی بات قابل قبول نہیں ہے (محلی جلد ۱۰ ص ۱۷۰) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو پھر کسی کی بات حجت نہیں ہے۔ (رفع الملام عن ائمۃ الاعلام ص ۶۴) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: زیراکہ حجت در روایت صحابی است نہ در رائے وفعل وے (بدور الاہلہ ص۸۷) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ علامہ شوکانی رحؒ در مؤلفات خود ہزار باری نویسد کہ در موقوفاتِ صحابہ حجت نیست (دلیل الطالب ص۶۱)

عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو فریق ثانی کے نزدیک موقوفات صحابہؓ حجت نہیں ہیں اور دوسری طرف ان سے واذا قرئ القرآن کی آیتِ قرآنی منسوخ قرار دی جاتی ہے۔ فوا اسفاہ: "میں وہ جواں ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں"

وسادسًا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو روایت امام بیہقیؒ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ کمزور اور ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی داہر بن نوح ہے۔ امام دار قطنی رحؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں۔ ابن حبان رحؒ کہتے ہیں۔ اس کی روایتوں میں خطا ہوتی ہے۔ ابن قطانؒ کہتے ہیں کہ وہ مجہول ہے۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص۴۱۳)

دوسرا راوی اس سند میں ربیع بن بدر ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن قتیبہؒ اسکو ضعیف

کہتے تھے (ضعفاء صغیر صہ ۱۲) امام نسائی رح اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی صہ ۴۲) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ متروک تھا۔ (تقریب صہ ۱۲۱) امام ابن معین رح، ابوداؤد رح اور ابن عدیؒ وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳۲۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۸) یعقوبؒ بن سفیانؒ اور ابن خراشؒ اسے متروک کہتے ہیں۔ جوزقانی رح اس کو واھی الحدیث اور ابوحاتمؒ اس کو ذاھب الحدیث اور ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ عجلیؒ محمدؒ بن عثمانؒ اور عثمانؒ ابن ابی شیبہ رح سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام حاکم رح کا بیان ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگوں سے موضوع اور جعلی روایتیں بیان کرتا تھا۔ ابن حبانؒ، دار قطنی رح اور ازدیؒ سب اسے متروک کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۳۹)

حضرات! آپ مبارک پوری صاحبؒ کی کرامت ملاحظہ کیجئے کہ اس روایت سے وہ واذا قرئ القرآن ..... الآیۃ کو منسوخ قرار دینے پر ادھار کھاتے بیٹھے ہیں۔ تعجب اور حیرت ہے ایسے علم پر۔

وسابعًا۔ کیا جمہور کی طرف سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے حضرت عبادہ رض وغیرہ نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ کے موقع پر قرأت خلف الامام کا حکم سنا ہو اور حضرت ابوہریرہ رض کی صحیح اور مرفوع حدیث واذا قرأ فانصتوا اور مالی انازع القرآن الحدیث سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہو۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہ رض متاخر الاسلام ہیں اور ۷ھ کو مسلمان ہوتے تھے۔ حدیث، حدیث کے مقابل میں آگئی اور نص قرآنی محفوظ رہ گئی۔

وثامنًا۔ اگر محض احتمال کا نام ہی استدلال ہے تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت عبادہؓ نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ میں یہ حکم سنا ہو اور آیت واذا قرئ القرآن مدینہ میں نازل ہوئی ہو۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رح تفسیر جلد ۲ ص ۲۵۴ میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اپنی تفسیر فتح البیان جلد ۳ ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ سورہ اعراف مدنی ہے۔ کیونکہ اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت یہود کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ یہود کا مرکز مدینہ طیبہ تھا نہ کہ مکہ مکرمہ، لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ ساری سورت ہی مدنی ہے —— ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

نواں اعتراض

امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذاقرئ القرآن کا شان نزول یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ اقتدا کی حالت میں بلند آواز سے نماز میں تکلم کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے:

۱۔ محمد بن دینار کہتے ہیں۔ ہم سے ابراہیم ہجری نے بیان کیا۔ وہ ابو عیاض سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ نماز میں تکلم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ واذاقرئ القرآن .... الآیۃ نازل ہوئی۔

۲۔ موئل بن اسمٰعیل، حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے یہی مضمون نقل کرتے ہیں۔

۳۔ عبداللہ بن عامر حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ بلند آواز سے نماز میں گفتگو اور تکلم کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

۴۔ عاصم بن عمر، حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ نماز میں تکلم کیا کرتے تھے، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ممانعت قرأت سے نہیں بلکہ تکلم اور رفع اصوات سے ہے اور تکلم فی الصلوٰۃ و رفع اصوات اور چیز ہے اور قرأت فی الصلوٰۃ الگ امر ہے۔ (کتاب القرأۃ ص۱۰۷)

جواب: امام موصوفؒ کا یہ بیان باطل ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ صحیح اسانید سے پہلے یہ امر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شان نزول قرأت خلف الامام کا منفی پہلو ہے۔ عام تکلم اور رفع اصوات اس کا شان نزول نہیں ہے۔

وثانیاً۔ امام موصوف رحؒ نے جتنی روایتوں سے احتجاج کیا ہے۔ وہ سب ضعیف کمزور اور معلول ہیں۔ پہلی روایت میں ایک راوی محمد بن دینار ہے۔ امام ابن معینؒ، دارقطنیؒ اور نسائی رحؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ عقیلی رحؒ کا بیان ہے کہ اس کی حدیث میں وہم ہوتا ہے۔ ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ ان کا حافظہ آخر میں متغیر ہو چکا تھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۵۵)

دوسرا راوی اس کڑی کا ابراہیم ہجری ہے۔ امام ابن معینؒ، نسائی رحؒ ابو زرعہؒ، ترمذیؒ، احمدؒ، سعدؒ، حربیؒ اور ابو حاتم رحؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور ابو حاتمؒ اس کو منکر

الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ علیؒ بن الحسینؒ بن الجنیدؒ کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ (میزان جلد ا ص ۱۳۱، تہذیب التہذیب جلد ا ص ۱۶۵)

دوسری روایت میں مؤمل بن اسمٰعیل ہے۔ امام بخاریؒ[1] فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے۔ ابو حاتم رح اس کو کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان کی روایات میں کثرت سے خطا ہوتی ہے۔ یعقوبؒ بن سفیانؒ فرماتے ہیں کہ اہل علم کو ان کی روایات سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ وہ منکر روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ساجیؒ اس کو کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ دار قطنیؒ اور ابن سعدؒ اس کو کثیر الخطاء اور کثیر الغلط کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ اس کو یخطئ سے تعبیر کرتے ہیں۔ محمدؒ بن نصرؒ مروزی اس کو سیئ الحفظ اور کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ امام ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الخطاء ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۲۱، تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۸۰)

تیسری سند میں عبداللہ بن عامر ہے۔ امام احمدؒ، ابو زرعہؒ، ابو عاصمؒ، نسائیؒ، ابو داؤدؒ، دار قطنیؒ محدث سعدیؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ ان کو لیس بشیئ اور ابو احمد الحاکم رح لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابن مدینیؒ اس کی ڈبل تضعیف کرتے ہیں (ضعیف ضعیف) ابو حاتمؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ان کے حافظہ کی شکایت کرتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۵۱ ولسان جلد ۳ ص ۳۰۳، تہذیب جلد ۵ ص ۲۷۵)

چوتھی روایت میں عاصم بن عمر ہے۔ امام احمدؒ، ابن معینؒ اور جوزقانیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔

---

[1] علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جس راوی سے متعلق امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہیں۔ اس سے حدیث روایت کرنا جائز نہیں۔ (میزان جلد ا ص ۵) اور اسی طرح طبقات سبکیؒ جلد ۲ ص ۹ اور تدریب الراوی ص ۲۳۵ میں ہے کہ امام بخاریؒ جس کو منکر الحدیث فرمائیں لا تحل الروایۃ عنہ۔ ایسے راوی سے روایت بیان کرنا جائز اور حلال نہیں ہے۔

لطیفہ: فریق ثانی صحیح ابن خزیمہؒ کے حوالہ سے فوق الصدر کی جو روایت پیش کیا کرتا ہے اس کی سند میں بھی یہی مؤمل بن اسمٰعیل واقع ہے (دیکھئے اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۹ اور بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۹۱) کیا بعید ہے کہ اصل روایت تحت السرہ ہو اور مؤمل بن اسماعیل کی کثرت خطاء کا نشانہ بن کر روایت فوق الصدر ہو گئی ہو۔

نہ تم صدمے ہمیں دیتے نہ ہم فریادیوں کرتے،
نہ کھلتے راز سربستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث اور ترمذیؒ متروک کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۴، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۵۱) یہ ہیں وہ روایات اور آثار جن پر امام بیہقی رحؒ اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

وثالثاً۔ امام بیہقی رحؒ کی یہ غلطی ہے کہ وہ تکلّم فی الصّلوٰۃ سے صرف عام انسانی تکلّم اور گفتگو مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ تکلّم کا مفہوم عام ہے جس میں قرآتِ قرآن، تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر، نماز، خطبہ اور جملہ ادعیہ آجاتی ہیں۔ لہٰذا نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ میں سورہ فاتحہ کی نہی بھی آجائے گی۔ کیونکہ عام کی نفی سے خاص کی نفی عین عقلی اور منطقی قاعدہ ہے۔ تکلّم کا مادہ کلام اور کلمہ ہے۔ اور قرآن کریم میں متعدد مقامات اور مختلف مواضع میں کلام اللہ، کلماتُ ربّی اور کلمات ربك وغیرہ کا قرآن کریم اور اس کی آیتوں پر اطلاق ہوا ہے۔ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جمعہ کے وقت امام کے منبر پر تشریف لانے سے قبل جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ ثم ینصت اذا تکلم الامام (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۱) پھر جب امام آجائے اور تکلم کرے تو اس وقت وہ نمازی خاموش ہوجائے۔ اس حدیث میں جمعہ کے خطبہ پر تکلم الامام کا اطلاق ہوا ہے۔ خطبہ کیا ہے؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وانما الخطبۃ ھی قرأۃ القراٰن (الحدیث مسند طیالسی ص ۹۵) خطبہ تو قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی قرآت ہے۔ حضرت ام ہشام رضؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سورۃ ق والقراٰن المجید جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُن کر یاد کی ہے۔ آپ اسے ہر جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۲۳ و مسلم جلد ۱ ص ۲۸۶) آخری تشہد میں درود شریف کے بعد کوئی متعین دعا شریعت نے نہیں بتائی۔ لیکن ادعیہ ماثورہ میں ربّنا اٰمنا..... الآیۃ رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ..... الآیۃ۔ ربّنا لا تزغ قلوبنا..... الآیہ ربّنا ظلمنا انفسنا...... الآیہ وغیرہ وغیرہ بھی ادعیہ ثابت ہیں اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آخری تشہد سے فارغ ہونے کے بعد ثم لیتخیر بعد من الکلام ما شاء (بخاری ۲ ص ۹۲۱) جو کلام بھی دل چاہے نمازی انتخاب کر لے۔ ایک شخص نے رکوع کی حالت میں الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ پڑھا تھا اور آپ نے فرمایا: من المتکلم (بخاری جلد ۱ ص ۱۱۰ و مسند احمد جلد ۳ ص ۱۰۳) متکلّم کون تھا؟ ایک شخص نے یہ دعا کی تھی: اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ وَ مُحَمَّدًا وَلَا تَرْحَمْ

مَعنًا اَحَدًا۔ امام نسائیؒ اس پر ایک باب قائم کرتے ہیں۔ باب الکلام فی الصلوٰۃ (جلد ا ص ۱۱۰) امام بخاری رحہ ایک باب بایں عنوان قائم کرتے ہیں:

اذا قال واللہ لا اتکلم الیوم فصلے اوقرأ اوسبح اوکبر اوحمد او ھلل فھو علی نیتہ۔ (بخاری ۲ ص ۹۸۸)

اگر کسی شخص نے قسم اٹھائی کہ میں کلام نہیں کروں گا تو اگر اس نے نماز پڑھی یا قرآن کی تلاوت کی یا سبحان اللہ یا اللہ اکبر یا الحمد للہ یا لا الہ الا اللہ پڑھا تو یہ اس کی نیت پر موقوف ہے۔

یعنی اگر وہ تکلّم سے قرأت قرآن وغیرہ مراد لے اور اس کی نیت کرے تو تکلّم کا اطلاق اس پر صحیح ہے اور وہ حانث ہو جائے گا۔ قاضی شوکانی رحہ لکھتے ہیں:

فلا یجوز من الکلام الا ما خصہ دلیل کصلوٰۃ التحیۃ۔ نیل الاوطار جلد ۳ ص ۱۵۲)

جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس وقت کلام صحیح نہیں ہے۔ مگر جس کو شرعی دلیل نے خاص کر دیا ہو جیسے صلوٰۃ تحیہ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب موصوفؒ صلوٰۃ تحیہ پر کلام کا اطلاق صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نہی عن التکلم قرأتِ قرآن وغیرہ پر مشتمل ہے تو امام بیہقی رحہ کا یہ استدلال کہ نہی تو تکلم سے ہے۔ تلاوت اور قرأت قرآن سے نہیں بالکل بے بنیاد ہے اور جیسے جہر کے ساتھ پڑھنے سے منازعت اور مخالجت ہوتی ہے۔ اسی طرح آہستہ پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ جس کی تحقیق آگے آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ورابعًا۔ امام بیہقی رحہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ ان ضعیف اور کمزور روایتوں سے ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ[1] کی ممانعت

---

[1] محدثینؒ و مورخینؒ کا اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی یا مدینہ طیبہ میں؟ حافظ ابن قیمؒ رحہ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۹۱ میں) حافظ ابن کثیر رحہ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۹۲ میں) اور قاضی ابو الطیب الطبریؒ (المتوفی ۴۵۰ھ دیکھیے بذل المجہود جلد ۲ ص ۹۵) اس کے مدعی ہیں۔ کہ یہ ممانعت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی۔ اور دلیل باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

آیت قوموا للہ قانتین سے ہوئی ہے جیسا کہ بخاری جلد ا صفحہ ۱۶۰ و مسلم جلد ا ص ۲۰۴ میں حضرت زید بن ارقمؓ سے مروی ہے اور اس کی پوری تحقیق پہلے گزر چکی ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول ہی خاص قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہے۔

دسواں اعتراض

حضرت امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ آیت فاذا قرئ القرآن ... الآیہ میں استماع اور انصات کا حکم ہے اور استماع کا تحقق صرف ان نمازوں میں ہو سکتا ہے جن میں قرأت سنی جا سکتی ہو اور سرّی نمازوں میں چونکہ قرأت سُنی نہیں جا سکتی۔ اس لیے ان میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی جائز ہو گی۔ لہٰذا آیت اپنے عموم پر باقی نہ رہی اور منکرینِ قرأت خلف الامام کا علی الاطلاق استدلال اس آیت سے صحیح نہ ہوا (اوکما قال جزء القرأۃ ص ۹ اور یہی سوال امام بیہقی رح نے کتاب القرأۃ ص ۶۷ میں اور نواب صاحبؒ نے دلیل الطالب ص ۲۸۰ میں اور مبارک پوری صاحبؒ نے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۵ اور ابکار المنن ص ۱۴۸ میں کیا ہے)

جواب۔ ان اکابر کے سوال یا استدلال کے مرکزی نقطے اصولی طور پر صرف دو ہیں۔ ان کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ استماع کا معنی سننا ہے۔

۲۔ سرّی نمازوں میں آہستہ آہستہ امام کے پیچھے قرأت کرنا استماع اور انصات کے منافی نہیں ہے علی الترتیب دونوں شقوں کا جواب ملاحظہ کریں:

استماع کا معنی۔ استماع کا معنی سننا نہیں بلکہ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، قرأۃ سُنی جا سکتی ہو یا نہ۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں حضرت ابن مسعودؓ کی وہ صحیح روایت پیش کرتے ہیں جو صحاح ستّہ میں موجود ہے کہ حبشہ سے لوٹنے کے بعد انھوں نے بحالتِ نماز آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سلام کہا۔ مگر جواب نہ ملا۔ کیونکہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ نازل ہو چکی تھی۔ مگر حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ یہ آیت چونکہ بالاتفاق مدنی ہے اس سے معلوم ہوا کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ کی نہی مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہے (فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۵۹) اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ بعض مہاجرین حبشہ مکہ مکرمہ بھی واپس آئے اور بعض مدینہ منورہ میں اور حضرت ابن مسعودؓ کا یہ رجوع مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔

۱- آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بسلسلۂ جہاد کسی قصبہ یا شہر پر حملہ کرنا چاہتے تھے تو

وکان یستمع الاذان فان سمع..... پہلے توجہ کرتے۔ اگر اذان کی آواز سن لیتے تو حملہ سے

...... اذانا امسک والا اغار بازرہتے۔ ورنہ حملہ بول دیتے تھے۔

(مسلم ص۱۹۶، ابوعوانہ جلد ۱ ص۳۳۵، دارمی ص۳۲۳، طیالسی ص۲۷۱)

قطبی پڑھنے والا طالب علم بھی بخوبی اس امر سے واقف ہو گا کہ تقسیم الشئ الیٰ نفسہ والیٰ غیرہ محال ہے۔ اگر استماع اور سماع کا ایک ہی معنی ہو تو اس حدیث کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ اذان سنتے تھے۔ سو اگر آپ سُن لیتے تو حملہ نہ کرتے ورنہ حملہ کر دیتے تھے۔ جب پہلے اذان سُن لی ہوتی تھی تو پھر اگر اذان سُن لیتے کا کیا مطلب؟ استماع کا معنیٰ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ پہلے کان دھرتے اور توجہ کرتے۔ توجہ کے بعد اگر اذان سن لیتے تو فبہا ورنہ حملہ کر دیتے تھے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ استماع سے مُراد ارادۂ استماع ہے.... اھ ص ۳۸۱۔ ایک بے کار بہانہ ہے۔ اس لیے کہ مجازی معنی کے لیے قرینہ درکار ہے اور اس جگہ قرینہ مفقود ہے۔ فان سمع.... الخ کے واضح الفاظ اس کا ابا کرتے ہیں کیونکہ حرف فا سے سماع کا ترتب امر باطنی یعنی ارادہ پر چسپاں نہیں ہوتا بخلاف کان دھرنے کے جو ظاہری امر ہے۔

۲- صراح ص۳۱۳ میں لکھا ہے۔ استماع گوش داشتن۔ کان دھرنا اور توجہ کرنا۔

۳- لغت کے امام ثعلبؒ سے روایت ہے واذا قرئ القراٰن.... الآیہ کا یہ مطلب نقل کیا گیا ہے کہ قال ثعلبؒ معناہ اذا قرء الامام فاستمعوا الی قرآنہ ولا تتکلموا (تاج العروس ج۱ ص۵۹۱) ثعلبؒ کہتے ہیں کہ استماع کا معنیٰ یہ ہے کہ جب امام قرأۃ کرے تو اس کی قرآت کی طرف توجہ کرو اور بولو مت۔

۴- اور امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ والاستماع الاصغاء۔ استماع کا مطلب کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ (مفردات ص ۲۴۲)

۵- اور مختار الصحاح میں ہے: واستمع لہ ای اصغیٰ۔ کہ استمع لہ کا یہ معنیٰ ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔

۶- منجد اور قاموس میں ہے: استمع لہ والیہ اصغیٰ۔ استمع لہ اور الیہ کا ایک ہی مطلب

ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔ (منجد صفحہ ۳۴۲، قاموس جلد ۳ صفحہ ۴۱)

۷۔ امام نووی لکھتے ہیں:

الاستماع الاصغاء۔ (شرح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۸۴) کہ استماع کا معنی توجہ کرنا اور کان دھرنا ہے۔

۸۔ امام رازی لکھتے ہیں:

لان السماع غیر والاستماع غیر۔ سماع اور چیز ہے اور استماع اور ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۰۴)

۹۔ قاضی شوکانی صاحب قرأت خلف الامام کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یدل علی النھی عن القرأۃ عند مجرد الجھر من الامام ولیس فیہ ولا فی غیرہ ما یشعر باعتبار السماع۔

(نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۱۱۴)

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس حالت میں قرأت کرنا منع ہے۔ یہ حدیث اور کوئی دیگر حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ مقتدی کو قرأت سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ قرأت سن رہا ہے۔

اس عبارت میں قاضی صاحب واشگاف الفاظ میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ترک قرأۃ خلف الامام کی علت سماع نہیں ہے۔ موصوف جہرِ امام کو اس کی علت ٹھہراتے ہیں اور جمہور اہلِ اسلام بڑے وسیع النظرف ہیں۔ وہ صرف قرأتِ امام کو ترک القرأت خلف الامام کی علت سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

ومعتبر استماع است نہ سماع پس ہر کہ بانتہاء وقوف واقف شدو نمی شنود یا اصم است یا صوتِ خطیب خفی است وے ہمچو سامع است۔ (بدور الاہلہ ص ۷۳)

ان تمام پیش کردہ اقتباسات سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ استماع اور سماع دو الگ الگ چیزیں ہیں اور استماع کا معنیٰ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ اس میں سننے کا معنیٰ ملحوظ نہیں ہے۔ لہٰذا اس آیت کو صرف جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص کر دینا

باطل ہے بلکہ یہ آیت سرّی اور جہری ہر قسم کی نمازوں کو شامل ہے اور سماعِ قرآت، ترکِ قرآت کی علّت نہیں۔ جیسا کہ قاضی شوکانی صاحبؒ کو بھی مسلّم ہے۔

انصات کا معنیٰ

انصات کا معنیٰ ہے خاموش بودن (صراح ص۶۹) قاموس جلد ا ص۹۲ میں ہے۔ انصت، سکت یعنی انصات کا معنیٰ خاموش ہونا ہے اور یہی معنیٰ مغرب ۲ ص۲۱۲ اور منجد ص۸۸۳ وغیرہ کتب لغت میں آئے ہیں۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں: الانصات السکوت کہ انصات کا معنیٰ سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے۔ (شرح مسلم جلد ا ص۲۸۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: اذ لا فرق بین السکوت والانصات عند العرب (کتاب القرأت ص۸۴) اہلِ عرب کے نزدیک سکوت اور انصات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور مختار الصحاح میں ہے کہ الانصات السکوت والاستماع انصتہ وانصت لہ (ص ۵۸)۔ انصات کا معنیٰ خاموش رہنا اور کان دھرنا ہے لام کے ساتھ ہو یا بدون لام دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے۔

اور منجد میں ہے کہ انصت وانتصت لہ سکت مستمعا لحدیثہ (ص۸۸۳) انصت اور انتصت لہٗ کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کی بات کے لیے توجہ کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

اور تاج العروس میں ہے کہ

وانصتہ وانصت لہ اذا سکت لہٗ مثل نصحہ ونصح لہ وانصتہٗ و انصت لہ مثل نصحتہٗ ونصحت لہٗ والانصات ھو السکوت والاستماع للحدیث یقال انصتہٗ وانصت لہ۔

انصتہٗ اور انصت لہٗ کا معنیٰ ایک ہی ہے کہ اس کے لیے خاموش ہو گیا جیسے نصحہٗ اور نصح لہٗ کا ایک ہی مطلب ہے اور انصات کا معنیٰ سکوت اور بات کی طرف توجہ کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے انصتہٗ وانصت لہٗ۔

(جلد ا ص ۵۹۱)

امام ابوبکر الرازی رحؒ لکھتے ہیں کہ

قد بینا دلالۃ الآیۃ علی وجوب الانصات

ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت وجوب انصات

عند قرأة الامام فی حال جهر الامام والاخفاء وقال اهل اللغۃ الانصات الامساک عن الکلام والسکوت لاستماع القرأۃ ولا یکون القاری منصتاً ولا ساکتا بحال وذلک لان السکوت ضد الکلام وھو تسکین الالۃ عن التحریک بالکلام۔ ۔ اھ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۳۹)

پر دلالت کرتی ہے جب کہ امام قرآت کر رہا ہو جہر سے قرآت کرے یا آہستہ اور اہلِ لغت کہتے ہیں کہ انصات کا معنیٰ کلام سے رک جانا اور قرآت کی توجہ کے لیے خاموش رہنا ہے اور پڑھنے والا کسی صورت میں منصت اور ساکت نہیں ہوسکتا کیونکہ سکوت کلام کی ضد ہے اور سکوت کا یہ معنیٰ ہے کہ زبان کو کلام کے لیے حرکت نہ دی جائے۔

سکوت کا معنیٰ

امام اللغت والادب ابو عبداللہ الحسینؒ بن احمد المعروف بابن خالویہؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں: نزف الرجل اذا انقطعت حجتہ عند المناظرۃ وسکت وا سکت مثلہ۔ (اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن ص ۲۶)

یعنی مناظرہ کرتے وقت جب کوئی آدمی بالکل لاجواب ہوکر خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو اس پر نزف کا لفظ اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے تو اس پر سکت اور اسکت بولا جاتا ہے۔

منجد ص ۳۵۲ اور قاموس جلد ا ص ۹۲ میں لکھا ہے: اسکت انقطع کلامہ فلم یتکلم کہ سکوت کا معنیٰ یہ ہے کلام بالکل ترک کر دیا اور کوئی بات نہ کی۔ مجمع البحار جلد ۲ ص ۱۲۵ میں اس کی تصریح یوں کی ہے۔ جری الوادی ثلاثا ثم سکت ای انقطع یعنی تین دن تک سیلاب چلتا رہا پھر بالکل رک گیا۔

امام راغب اصفہانیؒ (المتوفی ۵۰۲ھ) لکھتے ہیں: السکوت مختص بترک الکلام۔ (مفردات ص ۲۲۵) سکوت ترک کلام کے ساتھ مختص ہے۔

امام رازیؒ تحریر فرماتے ہیں:

لان السکوت عدمی معناہ انہ

سکوت عدمی ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اس

لم يقل شيئًا ولم ينقل امرًا ولم يتصرف فى قولٍ ولا فعل ولا شك ان هٰذا المعنى عدمى محض۔ (مناظرات امام رازیؒ ص ۳۵)

نے کچھ بھی نہیں کہا نہ کوئی بات نقل کی ہے اور نہ کسی قول اور فعل میں تصرف کیا ہے اور اس کے عدمی محض ہونے میں کیا شک اور شبہ ہو سکتا ہے ؟

ان منقولہ حوالوں سے یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ بغیر مکمل خاموشی کے انصات اور سکوت اور اسکات کا مفہوم کسی طرح بھی محقق نہیں ہو سکتا اور جو لوگ جہری یا سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرآت تجویز کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح انصات پر عامل نہیں تصور کیے جا سکتے اور یہ بھی وضاحت کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے کہ استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، سننا اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے سرّی اور جہری کا سوال اٹھانا محض بے جا اور دور از کار بحث ہے۔

آہستہ پڑھنا بھی انصات اور استماع کے سراسر منافی ہے :

جو حضرات بحالتِ اقتدار امام کے پیچھے آہستہ قرآت تجویز کرتے ہیں اور اس کو انصات اور استماع کے منافی نہیں سمجھتے وہ غلطی پر ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قرآنِ کریم پڑھاتے تو آپ بھی آہستہ آہستہ ساتھ پڑھتے جاتے کہ مبادا حضرت جبرائیل علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد میں بھول نہ جاؤں اور کان یحرک شفتیہ آپ آہستہ آہستہ ہونٹ مبارک ہلاتے جاتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند نہ آیا کہ آپ قرآتِ قرآن کے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دیں اور یہ حکم نازل ہوا۔ لاتحرک بہ لسانک کہ آپ اپنی زبان تک کو حرکت نہ دیں۔

فاستمع له وانصت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۳، مسلم جلد ۱ ص ۱۸۲، طیالسی ص ۳۴۲)

سو آپ کان دھریں اور پوری طرح توجہ کریں اور مکمل خاموشی اختیار کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ پڑھنا، زبان کو حرکت دینا اور ہونٹ ہلانا استماع اور انصات کے بالکل منافی ہے۔ اسی لیے تو آپ کو تحریک لسان اور تحریک شفتین سے بھی منع کیا گیا۔

حالانکہ آپ آہستہ ہی پڑھتے تھے۔ بعض علمائے نے واذکر ربک فی نفسک ..... الآیۃ سے آہستہ قرأت کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وھذا بعید مناف للانصات المأمور به۔ (تفسیر ابن کثیر مع المعالم ج۳ ص۲۸۳ وبغیرہ جلد ۲ ص ۲۸۱)

یہ معنی حق اور انصاف سے بعید اور انصات مامور بہ کے قطعاً اور سراسر منافی اور مخالف ہے۔

حضرات! آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقتدی کے لیے سرّی اور جہری کسی بھی نماز میں قرأت کرنا استماع، انصات اور سکوت کے منافی ہے۔

گیارھواں اعتراض: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان جو اسکات اور خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کیا پڑھا کرتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ دعاء پڑھا کرتا ہوں۔ اللھم باعد بینی وبین خطایای۔ (الحدیث۔ بخاری جلد ۱ ص۱۰۳)

امام بیہقیؒ اس روایت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ پڑھنے پر اسکات کا اطلاق صحیح ہے، لہٰذا جو شخص امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرتا ہے تو وہ آیت استماع وانصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔ (کتاب القرأت ص ۷۵) یہی بات مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے بھی نقل کی ہے۔ (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱)

جواب۔ یہ اعتراض یا استدلال بھی مخدوش ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ ہمارا استدلال نص قرآنی سے ہے جس میں لفظ استماع اور انصات آیا ہے۔ اسکات اور سکوت کا لفظ صراحت کے ساتھ اس آیت میں مذکور نہیں ہے۔ استماع اور اسکات وسکوت کے درمیان فرق نمایاں ہے۔ امام بیہقی رحمہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ان میں فرق نہیں ہے صحیح نہیں ہے۔ اور اسی سے قاضی مقبول احمد صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ (دیکھیے الاعتصام) اس میں اہلِ علم کے لیے اشکال کی کوئی وجہ نہیں اور انصات اور سکوت میں جو فرق ہے وہ مبارکپوری صاحبؒ کو بھی مُسلّم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انصات اور سکوت کا معنی ایک نہیں ہیں بلکہ انصات کا معنی سکوت مع الاستماع ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱ و

تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۵۸) لہٰذا حدیث اِسْکَاتَہ سے استماع اور انصات کی تفسیر کرنا اور اس پر استدلال کی بنیاد رکھنا باطل ہے۔

وثانیاً۔ حافظ ابن حجرؒ حضرت زیدؓ بن ارقم کی امرنا بالسکوت کی روایت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں نماز میں مطلقاً سکوت کا حکم دیا گیا کہ نہ تو تم ثناء و آمین پڑھو اور نہ تسمیع، تحمید، تشہد اور درود وغیرہ پڑھو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حکم سابق سے سکوت کا حکم دیا گیا کہ سلام و کلام وغیرہ سے سکوت اختیار کرو تو اس روایت میں سکوت عن الکلام المتقدم مراد ہے۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۶۰ محصلہ) گویا جس چیز سے سکوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے حقیقتاً سکوت ہی مراد ہے۔ اس بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) حدیث اِسْکَاتَہ کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں اسکات عن التکبیر مراد ہے یعنی تکبیر تحریمہ سے اسکات اور سکوت کرنا (فصل الخطاب ص ۶۵) خلاصہ یہ ہوا کہ اسکات کا معنی آہستہ پڑھنا نہیں جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ کو دھوکا ہوا ہے بلکہ اسکات کے حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔ وہ یہ کہ جس چیز سے خاموش رہنے کا حکم تھا اس کو حقیقتاً ترک کر دینا اور اس سے خاموش ہونا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو یہ ایک مجازی معنی ہے اور آیت زیر بحث میں جمہور سلف و خلفؒ نص صحیح احادیث اور لغت کی روشنی میں حقیقی معنی مراد لیتے ہیں۔ لہٰذا مجازی معنی کو حقیقی معنی کے ترک کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا چنانچہ امام ابوبکر الرازیؒ اسی حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: انما سمّیناہ ساکتا مجازا لان من لم یسمعہ یظنہ ساکتا اھ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۹) یعنی اس کو ہم نے مجازی طور پر ساکت کہا ہے کیونکہ جو شخص اس کی قرآت کو نہیں سن رہا وہ اس کو ساکت ہی خیال کرتا ہے۔ مجازی معنی خود قرینہ کا محتاج ہوتا ہے اور فریق ثانی اس سے حقیقت کو ترک کرنے پر تلا ہوا ہے۔

بارھواں اعتراض۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صاحب مجمع البحار نے (جلد   میں) حدیث قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما امر وسکت فیما امر کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ قرأ کے معنی جہر کے ہیں اور سَکَتَ کے معنی اَسَرَّ کے ہیں یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے بھی قرآت کی اور آہستہ بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرأ کے معنی جَہَر بھی آتے ہیں۔ اس

معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت واذا قرئ القرآن کا مطلب یہ ہوگا کہ جب قرآن جہر سے پڑھا جائے تو تم خاموش رہو۔ لہٰذا یہ آیت صرف جہری نمازوں کو شامل ہوگی۔ نہ کہ سرّی نمازوں کو۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ صفحہ ۱۵ محصلہ)

جواب۔ مبارک پوری صاحبؒ کا یہ بیان بھی قابل التفات نہیں ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ آیت کا شان نزول صحیح روایات سے ترکِ قرأت ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے

وثانیاً۔ اہل عرب کے نزدیک قرأ اور جہر میں نمایاں فرق ہے اور حقیقت کو بلا کسی قوی اور صارف قرینہ کے ترک کرنا کئی وجوہ سے باطل ہے۔

وثالثاً۔ اگر اس حدیث کا معنی ہی بیان کرنا مقصود ہے تو اس کی صحیح صورتیں بھی عرض کی جا سکتی ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امامت کی حالت میں قرأت کرتے تھے۔ (قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما اُمِرَ) اور اقتداء[1] کی حالت میں آپ نے سکوت اور خاموشی اختیار کی (وسکت فیما اُمِرَ) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد قرأت کی اور کوئی نہ کوئی سورت یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھا (قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما اُمِرَ) اور پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی سورت نہ پڑھی۔ اور حقیقتاً سکوت اختیار کیا (وسکت فیما اُمِر) اور صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں

---

[1] بیت اللہ کے پاس دو مرتبہ آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اقتداء میں نماز پڑھی ہے۔ (ابو داؤد جلد ۱ صفحہ ۵۶ ترمذی جلد ۱ صفحہ ۲۱) سفر تبوک سے واپسی پر آپ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کی اقتداء کی ہے۔ (مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۴، ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۲۰) اہل قبا کے درمیان مصالحت کرنے کے بعد واپسی پر آپ نے عصر کی نماز میں حضرت ابوبکرؓ کی اقتداء کی ہے۔ (بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۶) اور نزل جبرائیل فامنی۔ الحدیث بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۵ و مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۲۱ اور مؤطا امام مالک صفحہ ۲ وغیرہ میں موجود ہے۔ جس سے حضرت جبرائیل کی اقتداء میں آپ کا نماز پڑھنا ثابت ہے اور آخری نماز میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتداء کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ آپ کی نفس اقتداء کے ثبوت کے لیے یہ دلائل کافی ہیں۔

آپ صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ جب سکت کے اور قرأ کے معنی کے لیے صحیح احادیث سے اور احتمالات کا بھی ثبوت مل سکتا ہے جن سے حقیقی معنی درست ہو سکتے ہیں تو پھر مجاز مراد لینے کی کون سی مجبوری ہے، جس کے لیے ایسی رکیک اور بارد تاویل اختیار کی جائے؟ اور ہمارا بیان کردہ مطلب ہی سابق اور آئندہ دلائل کا ساتھ دیتا ہے، جس کو صحیح ہونے کے ساتھ جمہور کی تائید کا شرف بھی حاصل ہے۔

ورابعاً۔ کیا مبارک پوری صاحبؒ فَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ اور اُمِرْنَا بالسُّكُوتِ اور سئل النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم عن اللّوح فسکت (بخاری جلد ا ص ۲۴) وغیرہ کا یہ معنی کریں گے۔ کہ موسٰی علیہ السلام کا غصہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ہمیں نماز میں آہستہ آہستہ سلام وکلام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ سائلین کے سوال کے بعد آپ آہستہ بولتے رہے؟ اور کیا یہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کے خلاف نہ ہو گا؟ اور دل میں آہستہ آہستہ بولنے سے سائلین کو کیا فائدہ تھا؟ لہٰذا اس استدلال میں بھی کوئی جان نہیں ہے۔

تیرھواں اعتراض۔

حافظ ابن ہمامؒ نے آیت واذا قرئ القرآن کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ فاستمعوا میں اللہ تعالٰی نے جہری نمازوں میں قرأت سے مقتدیوں کو منع کیا ہے اور انصات میں سرّی نمازوں میں ان کو قرأت سے روکا ہے۔ مبارکپوری صاحب ان پر گرفت کرتے لکھتے ہیں کہ ابن ہمامؒ کے کلام میں تین فساد ہیں:

۱۔ ابن ہمامؒ انصات کا معنی سکوت سمجھے ہیں۔ حالانکہ انصات کا معنیٰ مطلق سکوت کے نہیں ہیں بلکہ سکوت مع الاستماع کے ہیں۔

۲۔ ابن ہمامؒ کی تفسیر بالرائے ہے۔ (جس کا حرام ہونا مبرہن ہے)

۳۔ سرّی نمازوں میں سماعِ قرأت کے بغیر تدبّر کیسے متصوّر ہو سکتا ہے؟ (تحقیق الکلام ج۲ صد ۴۶)

جواب ۔ مبارک پوری صاحبؒ کی تینوں شقیں مردود ہیں:

پہلی اس لیے کہ مُبارک پُوری صاحبؒ خود غلطی کا شکار ہیں۔ وہ سماع اور استماع کو ایک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سماع اور استماع میں زمین آسمان کا فرق ہے اور متعدد حوالوں سے پہلے یہ امر ثابت

کیا جا چکا ہے۔ اگر واقعی استماع کا معنی سننا ہوتا تو حافظ ابن ہمامؒ پر اعتراض کی گنجائش تھی۔ اور دوسری[۲] شق اس لیے مخدوش ہے کہ حافظ ابن ہمامؒ کی تفسیر بعینہٖ قرآنِ کریم، صحیح احادیث لغت اور جمہور مفسرین کی تفسیر ہے۔ لہٰذا اس کو تفسیر بالرائے سے تعبیر کرنا ان دلائل سے غفلت اور بے خبری پر مبنی ہے۔ اور بلا تحقیق یہ الزام لگانا کھلی جسارت ہے۔ اور تیسری[۳] شق اس لیے باطل ہے کہ اگر مبارکپوری صاحب اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ استماع کا مطلب سماع ہے (اور جبھی تو وہ سماع قرأت کی آڑ لیتے ہیں) تو اس کی پوری تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ سماع اور استماع میں فرق ہے۔ اور اگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انصات کا سماع کے بغیر تحقق نہیں ہو سکتا تو یہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ انصات کے مفہوم میں من وجہ استماع اور توجہ تو شامل ہے لیکن اس میں سماع ہرگز شامل نہیں ہے۔ ایک حدیث بایں الفاظ آتی ہے۔

وان نأی وجلس حیث لا یسمع فانصت ولم یلغ کان له کفل من الاجر (الحدیث) (ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۵۱)

اگر کوئی شخص جمعہ کے خطبہ کے وقت امام سے دور بیٹھ گیا جہاں سے امام کی آواز وہ نہیں سن سکتا اور خاموش رہا تو اس کو ایک درجہ ثواب حاصل ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انصات کے لیے سماع شرط نہیں ہے۔ انصات وہاں بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے جہاں خطبہ وغیرہ کچھ بھی نہ سنا جا سکتا ہو۔ اگر انصات کے تحقق کے لیے سماع شرط ہوتا تو بغیر سماع کے انصات نہ پایا جا سکتا۔ اور یہ بھی مت بھولیے کہ انصات میں گو فی الجملہ استماع ملحوظ ہے لیکن من کل الوجوہ استماع بھی اس میں ضروری نہیں ہے۔ انصات کا معنی خاموش ہونا ہے اور یہ معنی بغیر استماع اور توجہ کے بھی متحقق ہو سکتا ہے اور استماع کے ساتھ بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

فالانصات هو السکوت وهو یحصل ممن یستمع وممن لا یستمع کان یکون مفکرا فی امر آخر۔ (فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۰۶ بحوالہ فتح الملہم)

انصات کا معنی سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے اور انصات ایسے شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ کرے اور انصات اس شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ نہیں کرتا، بلکہ کسی اور امر کی فکر میں ڈوب کر خاموش ہے۔

بہر حال مبارکپوری صاحبؒ کی پیش کردہ تینوں شقیں باطل ہیں اور اس کے مصداق ہیں
کہ ...... ع : میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مؤلف خیر الکلام نے (اور انھیں کی پیروی میں قاضی مقبول احمد صاحب نے ملاحظہ ہو الاعتصام ۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء) اس سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا ہے وہ بھی بڑا ہی عجیب ہے۔ انھوں نے ص ۳۶۰ سے ص ۳۹۹ تک کئی صفحات اس پر سیاہ کر ڈالے ہیں مگر بعض باتوں کو شاید وہ خود بھی نہ سمجھے ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں صرف کچھ کہنے اور لکھنے کا نام جواب نہیں ہوتا۔ ذیل کے امور کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ ہم نے کتب لغت سے باحوالہ یہ ثابت کیا ہے کہ انصات کے معنی بالکل خاموشی اور استماع کے معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، مؤلف مذکور کا یہ فریضہ تھا کہ وہ باحوالۂ کتبِ لغت یہ ثابت کرتے کہ انصات مطلق خاموشی نہیں بلکہ اس میں کلام کرنا درست ہے اور استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا نہیں بلکہ اس کا معنی سننا اور آہستہ آہستہ بولنا ہے لیکن جب وہ اس سے بالکل لاجواب رہے تو یہ کہکر جان چھڑالی ہے کہ پھر ہم کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سکوت اور انصات لغت کے لحاظ سے آہستہ پڑھنے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ ہمارے لیے اس قدر کافی ہے کہ ہم ثابت کردیں کہ قرآن مجید کی آیت زیر بحث میں جو استماع اور انصات آیا اس سے بالکل خاموشی مراد نہیں۔۔ اھ (ص ۳۷۱) مگر یقین جانیے کہ اس سے بالکل خاموشی مراد ہے۔ حضرات ائمہ لغتؒ اور جمہور مفسرینؒ کی روشن عبارتیں اس کا بیّن ثبوت ہے۔ جن کے حوالے گذر چکے ہیں چونکہ لغت سے ہی ایک ایسا فن ہے جو بلا کسی فریق کے لحاظ کے صحیح بات بتاتا ہے۔ اِس لیے مؤلف خیر الکلام لغت سے اپنی تائید پیش کرنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔

۲۔ جن روایات سے انھوں نے استدلال کیا ہے کہ سکوت قرأۃ کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے ان میں ایک روایت بخاری کی اور ایک مستدرک وغیرہ کی ہے کہ اسکاتك ما بين التكبير والقرأة ما تقول ... الخ ويسكت بعد القرأة هنية يسأل الله من فضله۔ تو ہم نے احسن الکلام میں اس کی تصریح کردی ہے کہ نصِ قرآنی میں انصات و استماع

کالفظ ہے اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ انصات اور سکوت میں فرق ہے اس لیے یہ جملہ حوالے ہمارے خلاف نہیں ہیں کیونکہ ہمارا استدلال تو انصات واستماع کے لفظ سے ہے اور اور انصات وسکوت میں فرق ہے۔

۳۔ فتح الباری جلد ۱ ص ۴۰۳ کے حوالہ سے ابن جریجؒ سے جو روایت نقل کی گئی ہے کہ لوگ مؤذن کی اذان کے لیے خاموش رہتے تھے بایں ہمہ وہ اذان کے کلمات دہراتے تے جس سے مؤلف خیر الکلام نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ انصات میں تکلّم درست ہے۔ (محصّلہ خیر الکلام ص ۲۷۲) تو یہ اثر بالکل ضعیف ہے کیونکہ اس میں حُدِّثتُ ہے اور یہ معلوم نہیں کہ بیان کرنے والا کون ہے؟ اور ہے بھی موقوف اس میں مرفوع روایات کے مقابلہ میں کیا حجت ہے؟ علاوہ ازیں اذان پر قیاس باطل ہے کیونکہ اذان میں ہر کلمہ کے بعد وقفہ ہوتا ہے جس میں اجابتِ مؤذّن ہو سکتی ہے۔ بخلاف امام کے پیچھے قرأت کے کہ سکتات کا تو صحیح احادیث سے ثبوت نہیں اور مقتدی کو پڑھنا منع ہے۔

۴۔ مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۱۴۳ سے جو روایت نقل کی ہے کہ من صام رمضان فی انصات وسکون .... الخ اس کی سند درکار ہے کہ آیا صحیح بھی ہے یا نہیں؟ ضعیف قسم کی روایتوں سے قرآن واحادیث صحاح اور اجماع امت اور لغت کو کس طرح رد کیا جا سکتا ہے؟ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں الولید بن الولید ہے۔ امام ابو حاتمؒ اس کی توثیق کرتے ہیں۔ وضعفہ جماعۃ اور دیگر حضرات محدثین کرامؒ اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (مجمع الزوائد، جلد ۳ ص ۱۴۳) علاوہ ازیں اس سے جھوٹ، گالی گلوچ اور غیبت وغیرہ سے صحیح معنی میں انصات مراد ہے جیسا کہ مقتدی کے لیے انصات عن القرأۃ مراد ہے۔ کیونکہ باقی باتوں کا تو نماز میں احتمال ہے ہی نہیں اور جن حضرات سے اس کے علاوہ کچھ اور منقول ہے تو وہ لاعلمی پر مبنی ہے۔

۵۔ جو آیات مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۶۶ پر پیش کی ہیں کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کے وقت کچھ کلمات کہہ سکتے ہیں تو انھوں نے یقولون اور قالوا کے الفاظ پر غور نہیں کیا کیونکہ یہ زبان کے ساتھ پڑھنے پر نص نہیں ہیں دل میں کہنے پر بھی قال اور یقول کا اطلاق صحیح ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خاص موقع پر اپنے بھائیوں سے کہا : قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ...... الآیۃ۔ حافظ ابن کثیرؒ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ قال ھٰذا فی نفسہ (ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۸۶) یہ قول انھوں نے دل میں کہا تھا، مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ نزاع قرأ اور یقرأ کے الفاظ میں ہے قال اور یقول میں نہیں ہے اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے انصات اور استماع کے وقت قرأت ثابت ہوتی ہے۔

۶۔ مؤلف خیر الکلام نے جو قرائن پیش کیے ہیں کہ انصات وسکوت وغیرہ کے ساتھ قرأت ہو سکتی ہے تو اگر ان کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی مجاز ہے اور انصات واستماع کا جو معنی ہم نے کیا ہے وہ حقیقت ہے جو صحیح احادیث کے علاوہ اجماعِ اُمّت اور لغت سے قوی طور پر مؤید ہے اس لیے اس کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ ہم کو اس امر کی ضرورت ہے کہ معلوم کریں کہ آیت میں استماع اور انصات کا کیا درجہ ہے خواہ وہ اطلاق حقیقی ہو یا مجازی۔ جب یہ ثابت ہو جائے تو مدعٰی حاصل ہو جاتا ہے باقی بحث زائد ہے (ص ۳۷۱) آپ پر کیا مصیبت وارد ہوئی ہے کہ آپ اطلاقِ مجازی کے پیچھے کمر بستہ ہو کر نصوص صحیحہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو کچھ ائمہ لغت اور جمہور امت نے کہا ہے اسے تسلیم کرلیں۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جن حضرات سے انصات و استماع اور سکوت وغیرہ کے حوالے مؤلف خیر الکلام نے نقل کیے ہیں چونکہ وہ اس مسئلہ میں فریق کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تفسیر میں ان کا اپنا ذہن بھی کارفرما ہے اور ان کی تفسیر خود محل نزاع ہے اس لیے صحیح احادیث اور کتب لُغت ہی سے ان کے معانی حل ہو سکتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام ص ۳۸۹ میں لکھتے ہیں کہ پس ضروری ہے کہ جو آیت میں بالکل خاموشی کا معنی لیتا ہے وہ دو باتیں ثابت کرے۔ ایکؔ یہ کہ انصات لُغت میں بالکل خاموشی کے معنیٰ میں آتا ہے۔ دُوؔم یہ کہ اس کے خلاف جو قرائن پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ..... اھ

بحمد اللہ تعالیٰ ہم کتب لُغت سے ثابت کر چکے ہیں کہ انصات کے معنی لغت میں بالکل خاموشی کے آتے ہیں اور جو قرائن اس کے خلاف پیش کیے گئے ہیں وہ سب مجازی ہیں۔ اس لیے حقیقت کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ شاذ اور خلافِ اجماع قول کو لے کر جمہور کا مسلک رد

کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۰۷ میں جو یہ لکھا ہے کہ اگر انصت بدون لام کے ذکر ہو تو سکوت کے معنی میں ہے اور جب اس کے ساتھ لام ہو تو اس میں استماع بھی ہے۔ اور قاموس جلد ۱ ص ۱۵۹ کا حوالہ انصتہٗ ولہ سکت لہ واستمع لحدیث نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ اس کا عطف فاستمعوا لہ پر ہے لہٰذا یہاں بھی لام ہے یا مقدر مانی جائیگی۔ (محصلہ) تو یہ محض لفظوں کا کرتب ہے محض لفظوں کی شعبدہ بازی سے کیا بنتا ہے۔ قاموس میں انصتہٗ ولہٗ لام کے ساتھ ساتھ ہو یا بدون لام کے دونوں کے معنی سکت کیا ہے اور قرآنِ کریم میں انصات اور استماع دو الگ الگ حکم ہیں۔ ایک کی لام دوسرے کو دے کر کام نکالنا اور اس طرح کی خانہ پری سے کچھ نہیں بنتا۔

۸۔ ہم نے قاموس کا حوالہ دیا ہے۔ اس پر مؤلف خیر الکلام ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ قاموس میں اس سے آگے لکھا ہے کہ وَرَجُلٌ سِكِّتٌ قَلِيلُ الكَلَامِ فاذا تكلم احسن (قاموس جلد ۱ ص ۹۳) یہ آدمی سکت ہے یعنی کم باتیں کرتا ہے جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے .... اھ مگر اس حوالہ سے مؤلف کو کیا فائدہ؟ رجل سکت کا معنیٰ تو یہ ہے کہ خاموش طبع کم گو ہے مگر جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ وہ خاموشی اور انصات کے وقت کلام کرتا ہے جو مؤلف مذکور کا مدعیٰ ہے۔ انصات اور خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ دونوں کا وقت ایک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف مذکور کو سمجھ عطا فرمائے ان کو ثابت تو یہ کرنا ہے کہ انصات کے وقت کلام ہو رہا ہے۔ اور اس حوالہ میں اس کا ذکر کوئی نہیں۔ خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ اور اس بات کو ایک عام آدمی بھی بخوبی سمجھتا اور سمجھ سکتا ہے۔ مگر ع: اک دل ہے جو ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

چودھواں اعتراض

حضرت امام بخاری رح[1]، امام ترمذی رح[2]، امام بیہقی رح[3]، مولانا شمس الحق رح[4]، مولانا ابو عبدالرحمٰن

---

[1] جزء القراۃ ص ۹ و ۵۸

[2] ترمذی جلد ۱ ص ۴۲

[3] کتاب القراۃ ص ۱۷ و ۲۹

[4] التعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۴۵

محمد عبد اللہ[۱]، مولانا عبد الصمد[۲] اور مبارک پوری[۳] صاحبؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ آیتِ استماع اور انصات کا مطلب یہی ہے کہ مقتدی کو بحالت قرآتِ امام توجہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے اور جب امام قرآت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی کو کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے لیکن مقتدی کو سکتاتِ امام میں قرآت کرنی چاہیے اور سکتات میں قرآت کرنا آیت مذکورہ کے منافی نہیں ہے اور سکتات کا ثبوت یہ ہے۔

۱- حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ امام جس وقت سکتہ کرے تو اس وقت مقتدی کو قرآت کرنی چاہیے کیونکہ جس شخص نے قرآت نہ کی۔ اس کی نماز میں خلل اور نقصان واقع ہوگا۔ (کنز العمال جلد ۴ ص ۹۶)

۲- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے ساتھ فرض نماز میں شریک ہو۔ اس کو امام کے سکتات میں سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ (کتاب القرآۃ ص ۵۴، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸)

۳- عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ سے روایت ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انصات اور سکتہ کرتے تھے تو اس وقت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ کے پیچھے قرآت کر لیا کرتے تھے۔ (کتاب القرآۃ ص ۶۹، ۸۶)

۴- ھشامؒ بن عروہؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اے فرزند جب امام سکتہ کرے تو تم اس وقت قرآت کر لیا کرو۔ اور جب امام قرآت کرے تو اس وقت تم خاموش ہو جاؤ۔ کیونکہ فرض نماز ہو یا نفل۔ اگر اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی۔ (جزء القرآۃ ص ۵۸، کتاب القرآۃ ص ۸۷)

۵- حضرت ابو سلمہؒ یا حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ امام کے لیے دو سکتے ہوتے ہیں۔ ان کو سورۂ فاتحہ کی قرآت کے لیے غنیمت سمجھو۔ (جزء القرآۃ ص ۵۸ و کتاب القرآۃ ص ۷۰)

---

[۱] عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۳ [۳] تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱ وابکار المنن ص ۱۴۸

[۲] اعلام الاعلام ص ۱۹۰ (ہم نے ان تمام حضرات کے دلائل کا قدر مشترک نقل کیا ہے۔)

۶- حضرت سعیدؒ بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ سلف کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کو کوئی نماز پڑھاتا اور امامت کا فریضہ بجا لاتا تو نماز میں ضرور سکتہ کیا کرتا تھا تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

(جزء القرأۃ ص ۵۷)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ سکتات امام کا وجود اور ثبوت بھی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں قرآنِ کریم اور حدیث دونوں پر عمل ہو جائے گا۔

جواب - ان حضرات کا یہ استدلال نہایت ضعیف اور کمزور ہے۔ کیونکہ یہ اکثر و بیشتر روایات حضرات صحابہؓ و تابعینؒ پر موقوف ہیں اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ فریقِ ثانی کے نزدیک "در موقوفات صحابہؓ حجت نیست"۔ جب حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ حال رہا تو تابعینؒ اور اتباعِ تابعینؒ وغیرہم کی کیا پوزیشن باقی رہ جاتی ہے۔ اور یہ جتنے آثار و روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ کریں:

اثر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اولاً۔ یہ اثر موقوف ہونے کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ سے نہیں۔ بلکہ حضرت عبد اللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے مروی ہے۔ ابن عمرؓ کا نام لینا راویوں میں سے کسی کی غفلت اور غلطی کا نتیجہ ہے۔ (دیکھیے کتاب القرأۃ ص ۴۵)

وثانیاً۔ اس میں سورۃ فاتحہ کی تصریح موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اثر مجمل ہے۔

وثالثاً۔ اس کی سند میں مثنیٰ بن صباح راوی کمزور ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ اس کے دماغ میں فتور آ گیا تھا۔ (ضعفاء صغیر ص ۱۷۰) امام نسائیؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۳۴۶) امام یحییٰ القطانؒ اور ابن مہدیؒ اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ وہ محض ہیچ ہے۔ ابن معینؒ اس کو لیس بذاك اور ابن عدیؒ ضعیف کہتے ہیں (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۷) امام ترمذیؒ، ابن سعدؒ، علیؒ بن الجنیدؒ، دار قطنیؒ، ابن حبانؒ، ساجیؒ، ابو احمد الحاکمؒ، سحنونؒ اور امام عقیلیؒ وغیرہ سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۶)

حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس روایت کی سند میں محمدؒ بن عبد اللہؒ بن

عُمیرؒ موجود ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف تھا (ضعفاء ص ۲۸) امام مسلمؒ لکھتے ہیں کہ امام یحییٰ القطانؒ اس کی تضعیف کرتے تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۲۰) امام نسائیؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر ص ۲۵) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ (کتاب القرآۃ ص ۵۴) امام دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱) امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں (ترمذی جلد ۲ ص ۱) امام یحییٰؒ بن معینؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۷۷ ولسان المیزان جلد ۵ ص ۲۱۶) علاوہ ازیں اس روایت میں صلوٰۃ مکتوبہ کی قید ہے۔ حالانکہ فریق ثانی کے نزدیک صلوٰۃ تراویح ..... صلوٰۃ عید اور صلوٰۃ وتر وغیرہ میں بھی امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ضروری ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک موقوف اثر بھی مروی ہے۔ کہ سکتۂ امام میں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز مکمل نہیں ہو سکتی (کتاب القرآۃ ص ۶۶) لیکن اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ نہایت ضعیف اور کمزور راوی موجود ہے۔ جس کی پوری بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز

روایت عمرو بن شعیبؒ عن ابیہ ..... الخ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے روایتی سلسلہ میں محدثین کا کلام معروف ومشہور ہے۔ امام یحییٰ القطانؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند ہمارے نزدیک ضعیف اور کمزور ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۳، ۱ ص ۸۲) امام ابوداؤدؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ وہ آدھی حجت بھی نہیں۔ امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ محدثین اس لیے ان پر کڑی جرح کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ سے چند روایتیں سنیں ہیں اور وہ باپ دادا کی تمام غیر مسموع روایات کو بلاتحاشا[1] بیان کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ صفحہ ۲۸۹) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ انھوں نے عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ کتاب سے نقل کر کے محض تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات المدلسین ص ۱۱) امام طحاویؒ بھی ان کی سند کو منقطع سمجھتے ہوئے اس کو ضعیف کہتے ہیں (طحاوی جلد ۱ ص ۴۵)

---

[1] حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ ہے۔ اگر استاد اپنی کتاب اور بیاض سے روایت کرنے کی شاگرد کو اجازت نہ دے۔ تو وہ اس کتاب اور بیاض سے روایات بیان کرنے کا مجاز نہیں اور اس کی ایسی روایتیں قابل حجت نہیں ہو سکتیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۱۰۰)

امام حاکم رح کہتے ہیں کہ ان کی روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف سمجھی جاتی ہے۔ (مستدرک جلد ا ص ۱۰۷) محدث ابن حزم رح لکھتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کتاب سے روایت نقل کرتے ہیں جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اما حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ فصحیفۃ لا تصح - (محلی ابن حزم جلد ا ص ۲۳۲)

امام علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ عمرو بن شعیب جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت نقل کرے تو وہ کتاب سے (جو انھوں نے پائی تھی) نقل کرتا ہے فھو ضعیف لہٰذا وہ ضعیف ہے - ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے مگر عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مرسل ہے ابن حبان فرماتے ہیں کہ جب وہ طاؤس اور سعید بن المسیب وغیرہ ثقات سے روایت نقل کرے تو حجت ہے - اور جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کرے تو اگر جدہ سے عبد اللہ مراد ہیں تو حدیث منقطع ہو گی اور اگر محمد مراد ہوں تو مرسل ہو گی (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۵۳) اور محدث ساجی فرماتے ہیں کہ

قال ابن معین ھو ثقۃ فی نفسہ و ما روی عن ابیہ عن جدہ لا حجۃ فیہ ولیس بمتصل وھو ضعیف ... الخ	امام ابن معین نے فرمایا کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے لیکن جب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کرے تو حجت نہیں اور اس کی سند متصل نہیں بلکہ ضعیف ہے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۸)

امام میمونی فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے سنا:

یقول لہ اشیاء مناکیر وانما یکتب حدیثہ یعتبر بہ فاما ان یکون حجۃ فلا (ایضاً ص ۴۹)	انھوں نے فرمایا کہ اس سے بہت سی منکر اشیا بھی ہیں اس کی حدیث اعتبار کے لیے تو لکھی جا سکتی ہے لیکن حجت کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔

اور امام اثرم فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ میں اس کی حدیثیں لکھ لیتا ہوں کبھی تو اس سے احتجاج کر لیتا ہوں۔

وربما وجس فی القلب منہ شیٔ (ایضاً ص ۴۹)	اور کبھی اس سے دل میں کھٹکا گذرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مؤلف خیر الکلام نے (۱۹۳ و ۱۹۴) میں بحوالہ تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۶۷

امام احمدؒ اور امام علیؒ بن المدینیؒ کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ عمرؒو بن شعیبؒ کی روایت کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے اور علامہ ذہبیؒ نے عمرو بن شعیبؒ کی روایت کو جو حسن کہا ہے تو اس سے اس کی دوسرے طرق سے روایت مراد ہے نہ کہ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کیونکہ اس پر امام الجرح والتعدیل امام یحییٰؒ بن سعیدن القطانؒ اور یحییٰؒ بن معینؒ وغیرہ کی مفصل جرح موجود ہے۔

امام ابن حبانؒ اپنا فیصلہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فی روایتہ عن ابیہ عن جدہ مناکیر کثیرۃ لا یجوز عندی الاحتجاج بشیء منھا۔ (اسعاف المبطأ برجال المؤطأ ص ۲۱) عمرؒو بن شعیبؒ کی عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے میرے نزدیک کوئی روایت قابل احتجاج نہیں ہے کیونکہ ان میں کثرت سے نکارت ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: بعض محدثینؒ ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں اور جمہور ان کی توثیق کرتے ہیں اور بعض دیگر ان کی بعض روایتوں کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں اور اپنا فیصلہ یوں ارقام فرماتے ہیں:

ومن ضعفہ مطلقا فمحمول علی روایتہ عن ابیہ عن جدہ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۵۱)

جو حضرات ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں۔ سو ان کی یہ تضعیف صرف عن ابیہ عن جدہ کے طریق پر محمول ہوگی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ (المتوفی ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ اور یہ بیچارے اس لیے ضعیف سمجھے جاتے تھے کہ ان کو کتاب مل گئی تھی جس سے حدیثیں نقل کرتے وقت وہ تدلیس سے کام لیتے تھے۔ (خطبات مدراس ص ۵۳) عمرؒو بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک اور روایت بھی مروی ہے کہ جس نے سکتات امام میں سورۃ فاتحہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز کامل ادا نہ ہوگی۔ (کتاب القرآۃ ص ۵۵-۵۴)

لیکن اس کی سند میں علاوہ عمرؒو بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کے محمدؒ بن عبد اللہؒ بن علبیدؒ بن عمیرؒ واقع ہے جس کا حال ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں۔

ہشامؒ بن عروہ رح کی روایت: ان کی روایت موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف بھی

ہے اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود ایک راوی ہے۔ امام احمدؒ اس میں کلام کرتے ہیں۔ ترمذیؒ ان کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اس سے احتجاج درست نہیں ہے۔ بندارؒ اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۸۱) ابوحاتم رحؒ کہتے ہیں کہ مؤمل بن اسماعیل اور ابوحذیفہ (موسیٰ) دونوں کی کتابوں میں بہت غلطیاں ہیں۔ عمروؒ بن علی الفلاسؒ کہتے ہیں کہ کوئی صاحبِ بصیرت محدث اس سے احتجاج نہیں کر سکتا۔ ابواحمد حاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ قوی نہ تھا۔ ابن قانعؒ کہتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔ امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم اور سیئ الحفظ تھا۔ ساجیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ اس کو کثیر الوہم بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۷۱)

علاوہ ازیں اس روایت میں فصاعداً کی زیادت بھی موجود ہے۔ کیا فریق ثانی سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا مقتدی کے لیے جواز سمجھتا ہے؟

اثر ابوسلمہؒ یا ابوہریرہؓ۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف ہے۔ اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود واقع ہے جس کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے۔ مزید برآں رواۃ کو اس کا پورا یقین بھی نہیں کہ یہ روایت حضرت ابوسلمہؒ (تابعی) سے ہے یا حضرت ابوہریرہؓ سے مؤلف خیر الکلام کا اس کو مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے حدیث حسن کہنا (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۲۳۷) غلط ہے۔ کیونکہ یہ راوی نرا مختلف فیہ ہی نہیں بلکہ جمہور محدثین کرامؒ کی اس پر کڑی جرح منقول ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

اثر سعیدؒ بن جبیر رحؒ۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اس کی سند کا ایک راوی عبداللہ بن رجاء مکی ہے۔ امام احمدؒ اور ازدی رحؒ کہتے ہیں کہ اس کی روایت میں نکارت ہوتی ہے۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۷) ساجیؒ کا بیان ہے عندہ مناکیر (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۱۱) کہ وہ صاحبِ مناکیر ہے۔ اس سند کی کڑی کا دوسرا ضعیف راوی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے اسکے بارے حضرات محدثین کرامؒ کے متضاد اقوال منقول ہیں۔ امام ابن معینؒ اسکو ثقہ حجۃ کہتے ہوئے بھی یہ فرماتے ہیں احادیثہ لیست بالقویۃ۔ امام ابوحاتمؒ ما بہ بأس صالح الحدیث کہنے کے باوجود فرماتے ہیں وکان یخطئ (اور نیز فرمایا لا یحتج بہ۔ میزان الاعتدال ج ۲ ص ۵۶) امام نسائیؒ نے ایک مرتبہ ثقہ اور ایک مرتبہ لیس بالقوی کہا اور امام علی بن المدینیؒ اسکو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۱۵)

امام دارقطنی رحہ کا بیان ہے۔ ضعیف لیثؒ وہ ضعیف ہے اور محدثین اس کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں۔ (نصب الرآیہ جلد ۱ ص ۳۵۳) مبارکپوری صاحبؒ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ مولانا عبدالحئیؒ کے رسالہ امام الکلام ص ۱۷۳ کی آڑ لیتے ہوئے اس ضعیف اور کمزور اور واہی اثر کو صحیح کہتے ہیں۔ (دیکھیے ابکار المنن ص ۱۶۷) فوا اسفا۔

سعید بن جبیرؒ کا بعینہٖ اس مضمون کا اثر کتاب القرآۃ ص ۶۹، ۸۷ میں بھی مذکور ہے، لیکن سند میں وہی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے۔

یہ ہیں وہ روایات و آثار جن سے یہ حضرات سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت سورۃ فاتحہ تجویز کرتے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ سکتاتِ امام کا روایتی پہلو تھا۔ اب آپ درایتی پہلو بھی سُن لیجئے۔ جہاں تک سکتاتِ امام کا ثبوت مل سکتا ہے وہ صرف دو سکتے ہیں، پہلا سکتہ تجبیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ ہے اور فریق ثانی کو اس امر میں اتفاق ہوگا کہ نہ تو اس میں قرأت سورۃ فاتحہ کا ثبوت ہے اور نہ گنجائش اور دوسرا سکتہ سُورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہونے کے بعد امام اس لیے کرتا ہے تاکہ امام قرأت سے فارغ ہونے کے صرف سانس لے سکے۔

حتٰی یترادالیہ نفسہ۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۰۳)

ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۳، ترمذی جلد ۱ ص ۳۴، دارمی ص ۱۴۶)

اور صرف اس سکتہ میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کیسے ممکن ہے؟ اور پھر ایک سکتہ کے سکتات کیسے بن گئے؟ خود مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں:

بل السکتۃ الثانیۃ کانت لان یتراد الیہ نفسہ کما صرح بہ قتادۃؒ۔

بلکہ دوسرا سکتہ تو صرف اس لیے ہوتا تھا کہ امام قرأت سے فراغت کے بعد سانس لے سکے۔ جیسا کہ حضرۃ قتادۃؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۹)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور جمہور اہل اسلام اس کے ہرگز قائل نہ تھے کہ سُورۃ فاتحہ کے بعد امام اس لیے سکتہ کرے تاکہ مقتدی اس میں سُورۃ فاتحہ پڑھ لیں اور نہ یہ حضرات سکتہ کے وجوب کے قائل تھے اور نہ استحباب کے۔

(تنوّع العبادات ص ۸۵)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولم نعلم نزاعا بين العلماء انه لا يجب على الامام ان يسكت ليقرأ المأموم بالفاتحة ولا غيرها الى ان قال - ولا يستحب للامام السكوت ليقرأ المأموم عند جماهير العلماء وهذا مذهب مالكؒ وابي حنيفةؒ و احمدؒ بن حنبلؒ وغيرهم۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۶)

یعنی جہاں تک ہمیں معلوم ہے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لیں۔ امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ بن حنبلؒ وغیرہ جمہور اہلِ اسلام اس پر بھی متفق ہیں۔ کہ امام کے لیے یہ بات مستحب بھی نہیں ہے کہ وہ سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرآت کر سکیں۔

قاضی محمد بن عبد اللہ ابو بکرؒ ابن العربیؒ[1] المالکی الاندلسی (المتوفی ۵۴۳ھ) مجوز سکتات سے یوں خطاب کرتے ہیں کہ

عجبا لك كيف يقدر المأموم فى الجهرية على القراءة اينازع القرآن الامام ام يعرض عن استماعه ام يقرأ اذا سكت قيل له فان لم يسكت وقد اجمعت الامة على ان سكوت الامام غير واجب، فمتى يقرأ؟

تعجب ہے تم پر مقتدی کو جہری نمازوں میں قرآت پر کیسے قادر تصور کیا جائے؟ کیا وہ قرائتِ قرآن پر امام سے منازعت کرتا رہے؟ یا استماع سے اعراض کرے؟ یا جب امام سکتہ اختیار کرے تو اس وقت وہ قرآت کرے؟ اگر امام سکتہ نہ کرے تو مقتدی کب پڑھے؟ کیونکہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے۔

(عارضۃ الاحوذی جلد ص بحوالہ اوجز المسالک جلد ۱ ص ۲۴۸)

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی صحیح حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آپ نے محض اس لیے سکتہ اختیار کیا ہو تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔ (بحوالہ غیث الغمام ص ۱۷۵)

---

[1] موصوف بہت بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے متبحر علمی ذہانت اور خصائل و عادات میں بے نظیر تھے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العلامہ اور القاضی لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۴ ص ۸۶)

محمد بن اسمٰعیل بن الصلاح امیر یمانی (المتوفی ۱۱۸۲ھ)[1] لکھتے ہیں کہ

ثم اختلف القائلون بوجوب القرأة فقیل فی محل سکتات الامام وقیل فی سکوتہ بعد تمام القرأة ولا دلیل لھذین المقولین فی الحدیث۔ (سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد ۱ ص ۱۰۶)

امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت تجویز کرنے والے آپس میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے۔ کہ امام کے سکتات میں قرأت کرنی چاہیے۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات آفتاب نیمروز کی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ سکتات امام کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں ملتا۔ اور امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نہ تو امام پر سکتہ واجب ہے اور نہ مستحب اور یہ بات بعید از قیاس اور انصاف ہے کہ شریعت حقہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ کا مکلف تو بنائے لیکن اس کو قرأت کا موقع اور محل نہ بتلائے، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کسی نے کہا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ ایسی خرافات ہے، جس سے شریعت حقہ کا دامنِ انصاف بالکل مبرا اور پاک ہے امام ابوبکر الجصاص رحؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی کا کام تو یہ ہے کہ وہ امام کی پیروی کرے اور جائز نہیں کہ امام مقتدی کا تابع ہو۔ تو اس قائل کا قول کہ امام سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کر لے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کے خلاف ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے اور پھر باوجود اس کے یہ معاملہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے مخالف ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ اور جب امام قرأت کرے

[1] نواب صاحب رحؒ لکھتے ہیں کہ امام صنعاء و علامۂ یمن و شاعر مجید و مجتہد مفید و محدث کامل و عارف واصل است، عامل بود بکتاب و سنت بحسب اجتہاد نفس خود تقیّد بہ تقلید احدے از اہلِ علم نداشت۔

(تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۸۰)

تو تم خاموش رہو اس حدیث میں آپ نے مقتدی کو امام کی قرأت کے لیے خاموشی کا حکم دیا ہے اور سکتات کا قائل امام کو مقتدی کے لیے انصات کا حکم دے رہا ہے۔ اور امام کو مقتدی کا تابع بنا رہا ہے اور یہ قول بالکل اُلٹ ہے۔

اور اس پر بحث کرتے ہوئے مزید ارقام فرماتے ہیں:

وقولہ انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا قرأ فانصتوا اخبار منہ من ان من الائتمام بالامام الانصات لقرأتہ وھذا یدل علی انہ غیر جائز ان ینصت الامام لقرأۃ الماموم لانہ لو کان ماموراً بالانصات لہ لکان ماموراً بالائتمام بہ فیصیر الامام ماموماً والماموم اماماً فی حالۃ واحدۃ وھذا فاسد ..... الخ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے پس جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو اس میں آپ نے خبر دی ہے کہ امام کی اقتدا میں یہ امر شامل ہے کہ اس کی قرأت کے لیے خاموشی اختیار کی جائے اور یہ ارشاد صاف بتاتا ہے کہ جائز نہیں کہ امام مقتدی کی قرأت کے لیے انصات کرے کیونکہ اگر وہ اس کا مامور ہوتا تو وہ اقتدا کا مامور ہوتا تو ایک ہی حالت میں امام مقتدی ہو جاتا اور مقتدی امام اور یہ بالکل فاسد ہے۔

پندرھواں اعتراض ۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ[۱] اور مبارک پوری صاحبؒ[۲] وغیرہ فرماتے ہیں کہ خطبہ جمعہ کے وقت اتنی توجہ اور خاموشی کا حکم اور تاکید آئی ہے کہ اگر کوئی شخص شور و غل مچاتا ہو تو اس کو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ خاموش ہو جاؤ جیسا کہ صحیح حدیث[۳] میں آتا ہے۔

اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ انصت فقد لغوت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۸، مسلم ۱ ص ۲۸۱)

یعنی جب تم کسی کو جمعہ کے خطبہ کے وقت یہ کہو کہ خاموش ہو جاؤ تو تم نے ایک بیجا اور بے ہودہ حرکت کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ خطبۂ جمعہ کے وقت ایسی توجہ اور خاموشی مطلوب ہے کہ امر بالمعروف اور

---

[۱] جزء القرأۃ ص ۳۵ [۲] کتاب القرأۃ ص ۸۴

[۲] تحقیق الکلام جلد ص وغیرہ [۳] یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۰۷، ابوداؤد جلد ص ۱۵۸، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

نہی عن المنکر بھی اس وقت ساقط ہے لیکن مع ہذا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد[1]
فرمایا ہے کہ اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین ولیتجوز فیہما
(مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷) ——— جب تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں آئے کہ امام جمعہ کا خطبہ
پڑھ رہا ہو تو اس آنے والے کو مختصر طریق سے دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز ہے، جس میں بہر حال تلاوت
قرآن کریم کی جاتی ہے اور یہ انصات کے منافی نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص امام کے پیچھے بجائے
اقتداء قرأت کرتا ہے تو وہ بھی آیت استماع اور انصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔

جواب۔ جمہور اہلِ اسلام خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ امام نوویؒ لکھتے
ہیں کہ امام مالکؒ، امام لیثؒ بن سعدؒ، امام ابو حنیفہؒ اور جمہور حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور
سلفؒ کا مسلک یہ ہے کہ خطبہ کے وقت نماز صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور
حضرت علیؓ کا بھی مسلک ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷)

علامہ عراقیؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عروہؒ بن زبیرؓ، مجاہدؒ، عطاءؒ بن ابی
رباحؒ، سعیدؒ بن المسیبؒ، محمدؒ بن سیرینؒ، امام زہریؒ، قتادہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور قاضی شریحؒ کا
کا بھی یہی مذہب ہے۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۱۵)

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ کوفے کے فقہاء اور محدثین کا یہی مسلک تھا۔ (جلد ۱ ص ۶۷) جب
جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں۔ تو اس پر مقتدی کی قرأت خلف
الامام کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا اور جس طرح خطبہ کے وقت نماز استماع اور انصات کے منافی ہے
اسی طرح قرأت خلف الامام بھی منافی ہے، جمہور کا کہنا ہے کہ گو آیت واذا قرئ القرآن ..... الآیۃ
کا شان نزول صرف نماز ہے لیکن یہ آیت اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔
اس لیے خطبہ کی حالت میں بھی ہر ایسے قول و فعل سے اجتناب ضروری ہے جو استماع و انصات
کے منافی ہو اور ظاہر ہے کہ نماز قولاً و فعلاً استماع و انصات کے منافی ہے۔ لہٰذا نماز بھی صحیح

---

[1] یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۵۹، نسائی جلد ۱ ص ۱۵۷، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی
جلد ۱ ص ۱۷۹ وغیرہ میں بھی موجود ہے بعض میں مختصر اور بعض میں قدرے تفصیل سے۔

نہ ہو گی اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

یصلی ما کتب لہ ثم ینصت اذا تکلم الامام	امام کے آنے سے پہلے جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے
(بخاری جلد ا ص ۱۲۱، مسلم جلد ا ص ۲۸۳،	اور پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو اس وقت نماز
طیالسی ص ۶۵)	ترک کر کے خاموش ہو جائے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کے خطبہ پڑھنے سے قبل نماز پڑھنا جائز ہے لیکن خطبہ شروع ہونے کے بعد گنجائش نہیں نکلتی اور بغیر خاموشی اور انصات کے کوئی چارہ نہیں اور طیالسی کے یہ الفاظ بھی مدنظر رکھیے فاذا تکلم الامام استمع وانصت۔ جب امام خطبہ پڑھے تو مقتدی اس وقت توجہ کرے اور خاموش رہے اور حضرت نبیشۃ الہذلیؓ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

فان لم یجد الامام خرج صلی ما بدا لہ	اگر امام ابھی خطبہ کے لیے نہ آیا ہو تو جتنی نماز پڑھی
وان وجد الامام قد خرج جلس فاستمع	جا سکتی ہے پڑھنی چاہیے اور جب امام خطبہ کے لیے
وانصت الحدیث (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۷۱)	آچکا ہو تو اس وقت ہر شخص کو بیٹھ کر توجہ اور خاموشی
وقال رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح خلا	اختیار کرنی چاہیے۔ علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں کہ اس روایت
شیخ احمد وھو ثقۃ... (انتہٰی)	کے سب راوی بخاری کے راوی ہیں۔ ہاں مگر امام احمدؒ کے
	استاذ لیکن ہیں وہ بھی ثقہ۔

لہ ان کا نام علیؒ بن اسحاقؒ ہے۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۱۵) ابن معینؒ ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ نسائیؒ اور محدث محمدؒ بن حمدویہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۶۹) حافظ ابن حجرؒ مقدمہ فتح الباری ص ۴ میں لکھتے ہیں کہ ہم فتح الباری میں جو حدیث بغیر گرفت کے نقل کریں گے۔ وہ صحیح یا حسن ہو گی۔ اور یہ روایت حافظ موصوف نے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۹۷ میں نقل کی ہے اور اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ مؤلف خیر الکلام نے (ص ۵۶۳، ۵۶۴ میں) یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں عطاء خراسانیؒ ہے اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ارسال تدلیس اور کثرتِ وہم کا شکار تھے۔ اور بخاری نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ (تقریب ۱۷۹) اور مقدمہ فتح الباری ص ۴۳۶ میں لکھتے ہیں کہ وہ بخاری کی شرط پر نہیں ہے۔ یہ علامہ ہیثمیؒ کا وہم ہے۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ نماز کی گنجائش صرف اس وقت ہے۔ جب امام خطبہ کے لیے ابھی نہ آیا ہو۔ لیکن جب امام خطبہ کے لیے آچکا ہو تو پھر نماز کی گنجائش ہے اور نہ سلام و کلام کی اور خطبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی حدیث کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے۔ بعض رواۃ نے نقل بالمعنیٰ کے پیشِ نظر اس کو تعمیم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیک غطفانی رضؓ فقر و فاقہ کا شکار تھے۔ ان کی خستہ حالی اور پریشانی کو دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے لیے چندہ کرنے کا قصد فرمایا اور اس کا حکم دیا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھ لیں تاکہ لوگ ان کی پراگندہ صورت اور بے لبسی کو دیکھ لیں اور دل کھول کر اس کی اعانت اور امداد کریں۔ چنانچہ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

جاء رجل یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب بھیئاۃ بذۃٍ فقال لہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصلیت قال لا قال صل رکعتین وحث الناس علی الصدقۃ الحدیث۔

(نسائی جلد ۱ صـ۱۵۸)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نہایت خستہ حالی میں آیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے نماز پڑھی ہے؟ کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھو۔ اور لوگوں کو آپ نے صدقہ اور خیرات کی تلقین فرمائی تاکہ اس کی امداد و اعانت ہو سکے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) کہ اس کو صحیح کی شرط پر مانتے ہیں۔ (محصلہ) مگر یہ حافظ ابن حجر رحؒ کا وہم ہے کیونکہ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۳۲ اور ص ۷۹۶ میں عطاءؒ کی روایت موجود ہے۔ محدث ابو مسعود الدمشقیؒ اور ان کے پیرو کار اور علامہ قسطلانیؒ وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ یہ عطا خراسانیؒ ہے۔ لہٰذا یہ علامہ ہیثمی رحؒ کا وہم نہیں بلکہ حافظ ابن حجر رحؒ کا وہم ہے اور جس بنا پر مؤلف مذکور انکار کرتے ہیں کہ چونکہ یہ کمزور ہے لہٰذا بخاری کی شرط پر نہیں اُتر سکتا۔ نہایت کمزور ہے۔ کیونکہ اس سے ضعیف تر راوی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ عرض کر سکتے ہیں۔ اور حافظ ابن حجر رحؒ نے تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۱۲ میں نشان دہی کی ہے کہ یہ مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ صحیح مسلم کا راوی ہے اور یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اور اصولِ حدیث کی رُو سے اس کے حسن ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

اور مسند احمد کی روایت کے الفاظ یوں ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ان ھذا الرجل دخل المسجد فی ھیئۃ بذۃ فامرتہ ان یصلی رکعتین وانا ارجوان یفطن لہ رجل فیتصدق علیہ۔ (فتح الباری ۲ ص ۳۲۶)

یہ شخص مسجد میں داخل ہوا اور یہ بہت شکستہ حال تھا۔ میں نے اس کو اس امید سے دو رکعتیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تاکہ کوئی صاحب دل اس کو دیکھ لے اور اس پر صدقہ کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص واقعہ تھا۔ اور رواۃ میں سے بعض نے اس کو عمومی رنگ میں پیش کر دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے جو محض بطور تائید پیش کی جاتی ہے، جس کی مزید تائید معتمر کا مرسل کرتا ہے۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۹)

وامسك عن الخطبۃ حتی فرغ من صلوتہ۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۲۰۳)

کہ جب تک وہ شخص نماز سے فارغ نہ ہو گیا۔ آپ نے خطبہ بند کر دیا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں جو محض تائیداً پیش کی جا رہی ہے نہ کہ استدلالاً

ارکع رکعتین ولا تعد لمثل ھذا۔

اب دو رکعتیں پڑھ لے لیکن پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔

(دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ و زیلعی جلد ۱ ص ۱۶۹)

حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں:

واما قصۃ سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فقد ذکر الترمذی انھا اصح شیئ روی فی ھذا الباب واقوی۔

امام ترمذی رح کا ارشاد ہے کہ اس باب میں سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ سب سے زیادہ صحیح اور قوی تر ہے۔

(فتح الباری جلد ۲ ص ۲۲۵)

چونکہ یہ شخص نہایت ہی غریب تھا اس لیے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے لیے دلسوزی سے چندہ کیا اور جب دوسرے اور تیسرے جمعہ آیا تو پھر بیٹھ گیا آپ نے فرمایا اٹھ اور نماز پڑھ۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۴۹۹) اور ہمارے خیال میں یہ بھی اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے کے لیے تھا تاکہ لوگ اس مفلوک الحال کو دل کھول کر

چندہ دیں بلکہ امام بخاریؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ دوسرے جمعہ پر آیا تو اس وقت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ان یصدقوا علیہ وان یصلی رکعتین۔ (جزء القراۃ ص ۳۷) کہ اس پر صدقہ کریں۔ اور اس کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا اور بقول مؤلف خیر الکلام حافظ ابن حجرؒ نے اس کے لیے چندہ مانگنے کو جزوِ علت کہا ہے۔ (خیر الکلام ص ۵۶۵) مگر یہ جزوِ علت نہیں پوری علت ہے کیونکہ آپ نے دو تین جمعے متواتر صرف اسی خستہ حال شخص کو نماز کا حکم دیا ہے رہا امام نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ کا مسلم کی روایت کے پیش نظر یہ کہنا کہ یہ نص ہے اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۵۶۵ والاعتصام ص ۷۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء) درست نہیں۔

اولاً۔ اس لیے کہ روایت بالمعنیٰ کا یہ جواب نہیں ہے۔

وثانیاً۔ اگر الفاظ یہی ہوتے تو کم از کم حضرات خلفاء ثلاثہ رضؓ کبھی اس کے خلاف نہ کرتے ان کا عمل ہی اس کے غیر نص ہونے کی دلیل ہے اور جمہور اہلِ اسلام کی تائید اس پر مستزاد ہے۔ امام نسائیؒ سنن الکبریٰ میں اس حدیث کا یہ باب قائم کرتے ہیں: باب الصلوٰۃ قبل الخطبۃ" (زیلعی جلد ۲ ص ۲۰۴) گویا امام نسائی رحؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ (نماز پڑھنے کا) خطبہ شروع ہونے سے پہلے پیش آیا تھا اور امام نسائیؒ کا ایسا سمجھنا محض بے وجہ نہیں ہے کیونکہ یخطب مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال و مستقبل دونوں کا اس میں احتمال موجود ہے۔ اور زمانہ استقبال[1] مراد

---

[1] اسی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض محققین نے یخطب کا معنیٰ یرید الخطبۃ کیا ہے۔ دیکھیے فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۱۷، فیض الباری جلد ۲ ص ۳۳۴۔ امام نووی رحؒ اذا امّن الامام فامّنوا کی شرح میں لکھتے ہیں۔ قالوا معناہ اذا اراد التامین۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴) علماء کا بیان ہے کہ جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو۔ جب امّن ماضی میں ارادالتامین کی گنجائش نکل سکتی ہے تو یخطب میں یرید الخطبۃ کا احتمال کیوں بعید ہے؟ علاوہ بریں بخاری جلد ۱ ص ۱۵۶ میں (وقال الحافظ فی الفتح جلد ۲ ص ۳۲۸ متفق علیہ) اصل الفاظ میں تردد ہے۔ والامام یخطب اوقد خرج کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو یا خطبہ کے لیے آ رہا ہو اوقد خرج جلد ہوتے ہوئے فریق ثانی کا دعویٰ اور کمزور ہو جاتا ہے۔ دیکھیے مزید تحقیق کے لیے عارضۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۳۰۲۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

لینے کی صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے۔ جب تم میں کوئی شخص آئے۔ درآں حالیکہ امام خطبہ پڑھنا چاہتا ہو اور اس کا ارادہ کرتا ہو (جو قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے) تو خطبہ سے قبل ہی تم نماز پڑھ لیا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں صرف دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ امام کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے ہی فارغ ہو کر استماع اور انصات پر صحیح طور پر عامل ہو سکے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مؤلف خیر الکلام نے دو باتیں ایسی کہی ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے پہلی بات یہ کہ واذا مام یخطب او قد خرج میں تردد صرف سعیدؒ کے بعض شاگردوں کو ہے۔ رُوحؒ بن قاسمؒ اور سفیانؒ بن عیینہؒ کی روایت میں تردد نہیں اسی طرح شعبہؒ کے بعض شاگرد نضرؒ بن شمیلؒ ابو زید ہرویؒ وہبؒ بن جریرؒ بغیر تردد کے بیان کرتے ہیں۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۸) اور او یہاں تنویع کے لیے ہے (محصلہ ص ۵۶۷)۔ مگر ہم نے بخاری شریف جلد ۱ ص ۱۵۶ کا حوالہ دیا ہے جس کی سند یوں ہے: حدثنا آدم اخبرنا شعبۃ قال حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت جابر بن عبد اللہ .... الخ نہ تو اس سند میں سعیدؒ ہے اور نہ اس کے وہ مذکور شاگرد ہیں جن کا ذکر مؤلف مذکور نے کیا ہے۔ اس لیے حرف او کے ساتھ ہی اصل روایت ہے جو برائے شک ہے اور اگر حرف او تنویع کے لیے ہوتا اور خطبہ اور غیر خطبہ کی حالت اجازت نماز کے لیے برابر ہوتی تو جمہور اور خصوصاً حضرات خلفاء ثلاثہ رضؓ اس کے خلاف نہ کرتے بلکہ وہ دونوں حالتوں کو برابر سمجھتے رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جمہوریت حدیث کے معاملہ میں کوئی حجت نہیں (۵۶۳) تو یہ شکست فاش کی واضح علامت ہے۔ حق جماعت کے ساتھ ہوتا ہے اور امت کی اکثریت کبھی غلط بات پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور یہاں جمہور کے پاس صحیح روایات ہیں محض جمہوریت ہی نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام اپنے ناخواندہ حواریوں کو سمجھا رہے ہیں۔ دوسری بات مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ پھر یہ کہنا کہ یخطب مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال و مستقبل دونوں کا اس میں احتمال ہے۔ قواعد نحویہ سے بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہونا چاہیے / پس خطبہ کا زمانہ وہی ہونا چاہیے جو آنے کا ہے ... اھ (ص ۵۶۶) بے شک یہ قواعد نحو سے بے خبری پر مبنی ہے اور ساری عمر پڑھا پڑھا کر بھی مؤلف خیر الکلام کو نحو کے بالکل ابتدائی گرامر بھی معلوم نہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس حال اور عامل حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے وہ ایسا حال ہے جو ترکیب میں حال واقع ہو اور یہاں یخطب مضارع کا صیغہ ہے جو خود عامل ہے اور اس میں حال و استقبال کا معنی پایا جاتا ہے یہ راکباً کی طرح حال نہیں ہے جس کا عامل اور ہوتا ہے۔ اور اس حال میں عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ بات اور حال کی ہے اور وہ بے خبری میں چسپاں دوسرے حال پر کر رہے ہیں۔

الحاصل خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جمہور کے نزدیک صحیح حدیث کی روشنی میں ممنوع ہے۔
اور جس حدیث سے اجازت ثابت ہوتی ہے اس کا صحیح محمل بھی آپ جمہور کی طرف سے سُن چکے ہیں۔ دریں حالات خطبہ کی حالت میں نماز کو جائز تصوّر کرتے ہوئے اس پر قرأت خلف الامام کے جواز کو قیاس کرنا ایک بے حقیقت اور بے اصل بات ہے، خصوصاً جب کہ مسئلہ مذکورہ منصوص ہے۔

سولھواں اعتراض — امام بخاری رح، مبارک پوری رح اور مفتی کلانوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب امام قرأت کر رہا ہو اور کوئی شخص آکر اس کی اقتدا کرنا چاہتا ہے۔ تولامحالہ اس کو تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد ہی اقتدا نصیب ہو سکتی ہے اور اس کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے منافی ہے۔ لہذا مانعین قرأت خلف الامام کا عمل بھی آیت مذکورہ پر نہ ہوا۔
(جزء القرأۃ ص ۳۵ و تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳۱ وغیرہ)

جواب — پہلے پوری تفصیل کے ساتھ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ آیت کا مخاطب ہر ایسا شخص ہے جو امام کی اقتداء کر چکا ہو اور امام ابن جریرؒ وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ

فالانصات خلفہ لقرأتہ واجب علیٰ من کان مؤتما بہ۔ | جو آدمی امام کی اقتداء کر چکا ہو۔ امام کی قرأت کے لیے خاموش ہونا اس پر واجب ہے۔

رہا وہ شخص جس نے مطلقاً امام کی اقتدا نہ کی ہو یا ابھی اقتداء کرنے کا ارادہ ہی کر رہا ہو تو وہ شخص اس آیت کا مخاطب نہیں ہے اور تکبیر تحریمہ علمائے احناف کی تحقیق میں شرط ہے۔
(دیکھیے خانیہ جلد ۱ ص ۴۰ و سراجیہ ص ۱۰ و ہدایہ جلد ص ۸۲ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۶۰ وغیرہ)
اور شرط خارج ہوتی ہے۔ (وشرط الشئ خارج عنہ هامش کنز ص ۳۰) لہذا قرأت امام کے وقت مقتدی کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے کسی طرح مخالف اور منافی نہیں ہے۔
ہاں اس کا قرأت کرنا یقیناً منافی ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہاں آیت کو اپنے عموم پر کیوں نہیں رکھا گیا؟ اور جو شخص نماز میں شریک نہ ہوا ہو وہ شور و غل مچا رہا ہے
(محصلہ الاعتصام ص ۱۰، ۵ اکتوبر ۱۹۲۲ء) لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص نے اقتداء

نہ کی ہو اس کے لیے انصات و استماع مستحب ہے، اس کو شور و غل کا حق کس نے دیا ہے؟
اور آیت استحباب کے حکم میں اپنے عموم پر ہے ہاں وجوب صرف مقتدی کے لیے ہے۔
کیونکہ شان نزول بھی خلف الامام کا مسئلہ ہے۔ کما مر۔

ستر۱۷ھواں اعتراض۔ حضرت امام بخاری رح، امام بیہقی رح اور مبارکپوری صاحب رح وغیرہ کہتے ہیں کہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کرنے کے منکر ہیں۔ ان کا بھی آیت استماع و انصات پر عمل نہیں ہے کیونکہ وہ بھی امام کے پیچھے ثناء وغیرہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں تو ثناء وغیرہ کی قرأت کیسے صحیح ہوتی؟ لھذا ثناء وغیرہ کی قرأت کرنیوالے بھی آیت استماع و انصات پر عامل نہ ہوئے۔

(جزء القرأۃ ص ۷، ص ۱۰، کتاب القرأۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام ج ۲ ص ۴۶)

جواب۔ ان اکابر کا یہ اعتراض بھی سطحی قسم کا ہے اور قابل التفات نہیں ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے مدرک مراد ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے صرف ثناء کی قرأت کرنا ہے۔ اور امام کو ثناء، تعوذ اور تسمیہ بھی پڑھنا ہے۔ اگر مدرک امام سے پہلے قرأتِ ثناء سے فارغ نہ ہوا۔ تو امام کے ساتھ تو بہر حال فارغ ہو ہی جائے گا۔ اور جب امام قرأتِ قرآن (سورۂ فاتحہ) شروع کرے گا تو مدرک ثناء کے پڑھنے سے فارغ ہو چکا ہوگا۔ لہٰذا مدرک باوجود ثناء پڑھنے کے آیت مذکورہ کا مخالف نہ ہوا۔

وثانیاً۔ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے مسبوق مراد ہے تو محققین فقہائے احناف رح کی تصریح سے یہ بات ثابت ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت ثناء پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاوٰی قاضی خاں جلد ۱ ص ۴۷، فتاوٰی سراجیہ ص ۱۶ اور فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۵ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، بلکہ علامہ حلبی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۵۶ھ) نے اس کی تصریح کی ہے کہ ولا یاتی الثناء مطلقاً۔ (کبیری ص ۳۰۴) کہ جب امام قرأت شروع کر چکا ہو تو مقتدی کو کسی بھی نماز میں ثناء نہیں پڑھنی چاہیے۔ جہری نمازوں میں قرأتِ امام کا علم مقتدی کو آسانی سے ہو سکتا ہے اور سری نمازوں میں قرائن اور شواہد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۶۹ میں امام ابو جعفر رحمہ کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مقتدی جب امام کو سورۂ فاتحہ میں پائے تو بالاتفاق ثناء پڑھے۔ (منیۃ المصلی ص ۶۵ محصلہ) اس میں بالاتفاق سے تمام فقہاءِ احناف کا اتفاق مراد نہیں ہے بلکہ صرف امام ابو یوسف رحمہ اور امام محمدؒ کا اتفاق مراد ہے۔ (صغیری ص ۱۲۸ اور کبیری ص ۳۴۹)

وثالثاً۔ قاضی شوکانی رحمہ لکھتے ہیں کہ

وظاهر التقييد بقوله من القرآن يدل على انه لا بأس بالاستفتاح حال قرأة الامام بما ليس بقرآن والتعوذ والدعاء (الخ) (نيل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۶)

اور من القرآن کی ظاہری قید اس پر دلالت کرتی ہے کہ امام کی قرأت کے وقت ثناء اور تعوذ اور دعاء وغیرہ جو قرآن نہیں، پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:

و ایں روایات (یعنی فلا تقرأوا بشیء من القرآن وغیرہ) و نحو آں دلالت دارند برآنکہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم ست فقط و ما عدا قرأۃ توجہ و استعاذہ و نحو آں (یعنی ثناء وغیرہ) پس لا بأس بہ است۔ و نہی متناول آں نیست و نہ بوجہے از وجوہ برآں دلالت دارد۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴) مگر سورۂ فاتحہ کو نواب صاحبؒ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور یہی مضمون مولانا عبد الصمد صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو صرف قرأتِ قرآن سے منع کیا گیا ہے۔ ثناء، تحمید، تسبیح اور تشہد وغیرہ سے اس کو منع نہیں کیا گیا۔ اور آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ اور حدیث فلا تقرأوا بشیء من القرآن اس کی تائید کرتی ہے۔ اس بحث کو پیش نظر رکھنے سے حضرت امام بخاری رحمہ، امام بیہقی رحمہ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کا یہ مغالطہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ تمہارے نزدیک فرض (یعنی قرأت) سے غیر فرض (یعنی ثناء وغیرہ) کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان دیگر امور میں امام کفایت نہیں کر سکتا۔ مگر قرأت میں کفایت کر سکتا ہے۔ (جزء القراءۃ ص ۷، کتاب القراءۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۲)

یہ بات تو جانے دیجئے کہ ان اکابر کے نزدیک صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت کی اہمیت کیوں

ہے اور قرآن کریم کی باقی ایک سو تیرہ سورتوں کی اہمیت کیوں نہیں ؟ آخر وہ سورتیں بھی تو قرآن کریم کی ہیں ؟ — بیچ : ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

مگر قرآن وحدیث کی فہمایش کے علاوہ قاضی شوکانی رح اور نواب صاحبؒ بھی صحیح بات کہنے اور لکھنے پر مجبور رہیں کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم است، فقط۔ اس لیے جب مقتدی کو قرأتِ امام کے وقت صرف قرآنِ کریم کی قرآت سے منع کیا گیا ہے۔ تو ثناء وغیرہ کا سوال اُٹھانا دور از کار بات ہے۔

اٹھارواں اعتراض — حضرت امام بخاریؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب صبح کی نماز کی جماعت کھڑی ہو تو تمہارے نزدیک صبح کی سنتیں قریب ہی پڑھنی جائز ہیں۔ کیا تمہارا یہ فعل آیت استماع وانصات کے منافی نہیں ہے ؟ لہٰذا تمہارا عمل بھی تو اس آیت پر نہ ہوا۔ (جزء القراۃ ص۶)

جواب — پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا وجوبی طور پر مخاطب صرف وہ شخص ہے جو امام کی اقتدا اختیار کر چکا ہو۔ جس نے ابھی تک امام کی اقتدار نہیں کی وہ اس کا وجوبی طور پر مخاطب نہیں ہے۔ لہٰذا جماعت کے پاس سنتیں پڑھنے والا کسی طرح بھی آیت کا مخالف نہ ہو گا۔ علاوہ ازیں محققین علمار احنافؒ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کو سنتیں ترک کر کے جماعت میں شریک ہونا چاہیے۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ مسجد کے علاوہ اگر اور کوئی جگہ نہ ہو تو نمازی کو صبح کی سنتیں پڑھنا جائز نہیں ہیں کیونکہ ترک مکروہ فعل سنت پر مقدم ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

واشد مایکون کراھیۃ ان یصلیھما مخالطا للصف کما یفعلہ کثیر من الجھلۃ۔ (فتح القدیر جلد ا صہ ۳۴۱ طبع مصر)	اور سب سے زیادہ کراہت اِس بات میں ہے کہ صف کے پاس ہی صبح کی سنتیں[۱] پڑھی جائیں جیسا کہ بہت سے جاہل پڑھ لیا کرتے ہیں۔

غرضیکہ امام بخاری رح کا یہ اعتراض بھی کسی طرح ان کے لیے مفید نہیں ہے اور نہ اس طرح ان کا مطلب پورا ہو سکتا ہے۔

انیسواں[۱۹] اعتراض — مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ آیت مذکورہ خطبہ کو بھی شامل ہے

---

[۱] جب صبح کی جماعت ہو رہی ہو تو اس وقت صبح کی سنتوں سے متعلق حضرات فقہاءؒ اور محدثینؒ کا اختلاف ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

حالانکہ تمہارے نزدیک جب خطیب یاایھاالذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ پڑھتا ہو تو سامعین کو آہستہ آہستہ درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ (کفایہ جلد ۱ ص ۶۸ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۷۵) لہذا آیت استماع وانصات پر تمہارا عمل بھی نہ ہوا۔
(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۳)

جواب — یہ تحقیق نقل کی جاچکی ہے کہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے۔ نزول آیت کے وقت خطبہ کا وجود بھی نہ تھا۔ ہاں عموم الفاظ میں خطبہ بھی شامل ہے۔ اس لیے بالطبع اور ثانوی حکم کی ظاہری مخالفت سے مقصودِ اوّلین اور بالذات حکم کی مخالفت کرنی کیسے جائز اور صحیح ہوسکتی ہے ؟ علاوہ ازیں اگرچہ بعض علمائے احناف نے خطبہ کے وقت دل میں درود شریف پڑھنے کی اجازت دی ہے بلکہ اس کو صواب اور صحیح کہا ہے۔ لیکن محققین آہستہ پڑھنے سے بھی منع کرتے ہیں۔ چنانچہ امام قاضی خان[۱] رح (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ایک گروہ کہتا ہے کہ پاس ہی پڑھ لی جائیں۔ جیساکہ حضرت عبداللہ رض سے موقوفاً و رواییتیں آتی ہیں۔ علامہ ہیثمی رح ایک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ رواتہ، ثقات اور دوسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ رجالہ، موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۷۵) دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جماعت کے بعد پڑھ لی جائیں جیساکہ بعض احادیث میں آتا ہے لیکن اس مضمون کی بیشتر حدیثیں ضعیف ہیں۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر صبح کی سنتیں رہ جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن یہ قول مخدوش ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ سورج نکلنے کے بعد پڑھی جائیں (یہ ضروری نہیں کہ وہی جگہ اور وہی وضو ہو) جیساکہ صحیح اور مرفوع حدیث میں آتا ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۵۷، مستدرک جلد ۱ ص ۲۷۴، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۴۸۴) چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیماری اور تندرستی، اقامت اور کسی حالت میں صبح کی سنتیں ترک نہیں کیں۔ (طیالسی ص ۲۲۰، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۸۵) لہٰذا یہی آخری مسلک قوی تر ہے۔

[۱] حسنؒ بن منصورؒ امام کبیر اور بحر عمیق تھے، بڑے زیرک اور نکتہ رس تھے، بڑے عابد اور فقیہ النفس تھے۔ ان کا شمار مجتہدین فی المسائل میں ہوتا ہے۔ (فوائد بہیہ ص ۶۴، ۶۵) صاحب جواہر المضیہ (علامہ ابو محمد عبدالقادرؒ ۷۷۵ھ) ان کو الامام الکبیر سے یاد کرتے ہیں۔
(جواہر المضیہ جلد ۱ ص ۲۰۵)

ومشائخنا قالوا بانہ لا یصلی علی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم بل یستمع وینصت لان الاستماع فرض والصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یمکن بعد ھذہ الحالۃ۔ (خانیہ جلد ا ص۵۷)

ہمارے مشائخ کا بیان ہے کہ خطبہ کی حالت میں درود شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ استماع اور انصات ضروری اور فرض ہے اور سامع کو خطبہ کے لیے نہایت خاموشی سے توجہ کرنی چاہیے اور درود شریف کا پڑھنا اس کے بعد بھی ممکن ہے۔

فتاویٰ سراجیہ[1] ص ۱۷ میں لکھا ہے کہ فقیہ حسام الدینؒ نے آہستہ پڑھنے کی اجازت دی ہے لیکن شمس[2] الائمہ سرخسیؒ (المتوفی ۴۳۸ھ) آہستہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ اور مبسوط سرخسی جلد ۲ ص ۲۹ میں آہستہ پڑھنے کی بھی صراحت کے ساتھ ممانعت بیان کی گئی ہے، حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ محققین کا بیان ہے کہ چونکہ استماع اور انصات فرض اور ضروری ہے۔ اس لیے حضرت امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک خطبہ کے وقت آہستہ درود شریف پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ (فتح القدیر جلد ۲ ص ۴۲۱، طبع مصر) اور یہی مسلک علامہ ابن عابدین شامی رح (المتوفی ۱۲۵۲ھ) کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۲) لہذا مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے۔

بیسواں اعتراض — شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے استحباب پر استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ذکر قرأت اور دعا کے بغیر سکوت اختیار کرنا نہ مامور بہ ہے اور نہ عبادت ہے بلکہ وساوس کا دروازہ کھولنے کا ایک سبب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا سکوت سے افضل ہوگا۔ اور قرأت قرآن سے بہتر ذکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہذا سری نمازوں میں امام کے پیچھے

---

[1] علامہ سراج الدین اودی رح المتوفی فی حدود ۵۷۰ھ۔

[2] امام، علامہ، حجت، متکلم، مناظر، اصولی اور مجتہد تھے، مبسوط کی پندرہ جلدیں (باب الشروط تک) بغیر مراجعہ کتب کے زبانی انھوں نے املا کرائی تھیں۔ جب کہ حق گوئی کی پاداش میں حکومت وقت نے پرانے دستور کے مطابق ایک تاریک کنوئیں میں ان کو محبوس کر رکھا تھا۔ (فوائد بہیہ ص ۱۸۸)

سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مستحب ہوگا۔ (محصلہ فتاوی جلد ۲ ص ۱۵۰)

جواب۔ شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کا یہ استدلال بھی درست نہیں ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ مقتدی کا فریضہ استماع و انصات ہے نہ کہ قرأۃ اور استماع وسماع کا فرق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

وثانیاً۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کم وبیش پچّیس تیس آیتیں پڑھنی مسنون ہیں اور مقتدی کے لیے دیگر حضرات سلف و خلف کی طرح شیخ الاسلام رح کے نزدیک بھی مازاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجایش نہیں ہے۔ اگر کم وبیش تیس آیتوں کے طویل وقفہ میں مقتدی پر وساوس کا دروازہ نہیں کھلتا تو امید واثق ہے کہ سورۂ فاتحہ کے مختصر سی سات آیتوں کے وقفہ میں بھی باب وسوسہ مسدود ہی رہے گا۔

وثالثاً۔ خود شیخ الاسلام رح اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کے لیے مازاد علی الفاتحہ میں قرأت کی بجائے استماع افضل ہے۔ نہ معلوم یہاں ذکر، قرأت اور دعا کے بغیر سکوت کیوں اعلیٰ اور افضل ہو گیا ہے؟ اس لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت کے وقفہ میں بھی استماع افضل رہے گا کیونکہ بقول شیخ الاسلام رح آیت واذا قرئ القرآن کا اوّلین مصداق صرف سورۂ فاتحہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اور سرّی نمازوں میں بھی قرأۃ قرآن یقیناً ہوتی ہے۔ ہاں اگر واذا جھر بالقرآن کا ارشاد ہوتا۔ تو بات الگ تھی۔ ہم نے شیخ الاسلام رح کے جواب میں جو باتیں عرض کی ہیں وہ ہماری اپنی اختراع نہیں بلکہ خود موصوف نے بیان کی ہیں۔

وایضًا ففی اجماع المسلمین علی انہ فیما یزاد علی الفاتحۃ یؤمر بالاستماع دون القرأۃ دلیل علی ان استماعہ لقرأۃ الامام خیر لہ من قرأتہ معہ بل علی انہ مامور بالاستماع دون القرأۃ مع الامام۔

نیز مسلمانوں کے اس اجماع میں کہ مازاد علی الفاتحہ میں مقتدی کو قرأۃ کے بجائے استماع کا حکم ہے اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کو استماع کا حکم ہے اور اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کا استماع اس کے پڑھنے سے بہتر اور افضل ہے بلکہ اس کو صرف حکم ہی یہ ہے کہ وہ قرأت نہ کرے

اور استماع کرے۔ (فتاوی جلد ۲ ص ۱۴۵)

اور لکھتے ہیں کہ

فان الکتاب والسنۃ امرت المؤتم بالاستماع دون القرأۃ والامۃ متفقون علی ان استماعہ لما زاد علی الفاتحۃ افضل من قرأۃ ما زاد علیھا۔ (فتاوی جلد ۲ ص ۱۴۳)

کتاب اور سنت نے مقتدی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ قرأت نہ کرے بلکہ سنے اور امت اس پر متفق ہے کہ "مازاد علی الفاتحۃ" میں استماع قرأت سے بہتر اور افضل ہے۔

موصوف کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے نقل کردہ جملہ جوابات خود شیخ الاسلام کی عبارات سے ماخوذ ہیں۔ باقی استماع کا معنی اور مطلب پوری تشریح کے ساتھ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اس میں الجھ کر جادۂ مستقیم سے پہلو تہی کرنا ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا۔

قارئین کرام! ہم نے آیت کے سلسلے میں کافی وقت لیا ہے۔ اگرچہ فریق ثانی کی جانب سے اس سلسلے میں بعض لچر پوچ اور لایعنی اعتراضات یا استدلالات اور بھی کیے گئے ہیں لیکن ہمیں ابھی آپ سے بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے ہم ان کو نقل کرنے اور جواب عرض کرنے میں مزید آپ کے دماغ کو پریشان نہیں کرتے اور باب اول کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

باب دوم

پہلے باب میں قرآن کریم کی آیت اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور دیگر جمہور سلف و خلفؒ سے اس کی تفسیر نقل کی گئی ہے کہ واذا قرئ القرآن ... الآیۃ کا شان نزول صرف نماز ہے۔ اور مقتدی کو امام کے پیچھے کسی نماز میں قرأۃ کرنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ آیت کی یہ تفسیر مؤید بالاجماع ہے۔ اور آیت کی تفسیر پر جتنے اہم سوالات کیے گئے تھے ان کے تفصیلی جوابات بھی عرض کیے جا چکے ہیں۔ اب باب دوم میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح صریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام کا وظیفہ پڑھنا اور مقتدی کا خاموش رہنا ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے ان پر جو سوالات کیے گئے ہیں ان کو نقل کر کے ان کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے گئے ہیں؛ ؎

داریم بہ اخلاص سرسے بر خطِ تسلیم — با قول نبی چون وچرا را نہ شناسیم
قرآن و حدیث است شفائے دلِ رنجور — قانون و اشارات و شفا را نہ شناسیم

پہلی حدیث:

امام مسلمؒ[1] علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاقؒ[2] بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

---

[1] امام مسلم رحؒ (المتوفی ۲۶۱ھ) صحیح مسلم شریف کے مؤلف ہیں جو بخاری شریف کے بعد تمام حدیث کی کتابوں میں پہلے درجہ پر (حاشیہ[1] کا اور حاشیہ[2] اگلے صفحہ پر دیکھئے)

جریرؒ نے بیان کیا۔ وہ سلیمانؒ تیمی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ یونسؒ بن جبیرؒ سے اور وہ حطانؒ بن عبد اللہ الرقاشی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ سے (المتوفی ۵۲ھ) روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک طویل حدیث میں فرمایا:

(بقیہ نوٹ نمبر۱ و نمبر۲ پچھلا صفحہ) صحیح تسلیم کی جاتی ہے اور امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ کہ بخاری و مسلم دونوں کی تمام روایتیں صحیح ہیں۔ علامہ ذہبی رح ان کو الامام، الحافظ اور حجۃ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۰)

ے یہ وہی مشہور امام ہیں جو ابن راہویہؒ سے مشہور ہیں۔ مقدمہ میں ان کا ترجمہ نقل کیا جاچکا ہے۔

لہ علامہ ابو القاسم لالکائی رح کا بیان ہے کہ جریر رح بن عبد الحمید رح کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے اور ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۷۶) علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۰)

لہ امام مسلم نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم سلیمانؒ سے بڑا حافظ حدیث چاہتے ہو؟ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴ و درایہ ص ۹۴) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۷ قسم دوم ص ۱۸) ابن حماد حنبلیؒ ان کو امام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۲۱۲) امام ابن معینؒ، امام احمدؒ، نسائیؒ اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ثوریؒ کا بیان ہے کہ وہ حفاظ بصرہ میں تھے۔ امام شعبہؒ فرماتے تھے کہ سلیمانؒ خالص اور مجسم یقین تھے۔ امام یحییٰؒ کا بیان ہے کہ مجھے کسی ایسے شخص کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی جس کے دل میں سلیمانؒ تیمی سے زیادہ خوفِ خدا موجود ہو۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، متقن، حافظ، صاحب سنت اور بصرہ کے عبادت گذاروں میں تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۰۲) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۴۲)

سلہ محدث ابن ناصر الدینؒ کا بیان ہے کہ وہ مفسر قرآن آیۃ فی الحفظ اور نسب دانی کے امام تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۵۳) ابن سعدؒ ان کو ثقہ، مامون اور حجت لکھتے ہیں۔ (طبقات جلد ۷ قسم دوم ص ۱) عبد الرحمٰنؒ بن مہدیؒ کا بیان ہے کہ قتادہؒ حمیدؒ کے جیسے پچاس آدمیوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ قسم اول ص ۵۷) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ بصرہ کی جماعتِ افتاء کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲) ابن سیرینؒ کا بیان ہے کہ قتادہؒ سب لوگوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے (کتاب العلل ترمذی ج ۲ ص ۲۳۸ اور

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فبیّن لنا سنتنا وعلمنا صلوٰتنا فقال اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین فقولوا اٰمین۔ الحدیث

(مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور یہ فرمایا کہ نماز پڑھنے سے قبل اپنی صفوں کو درست کرلو۔ پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرآت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین کہے تو تم آمین کہو۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ قرآت کرنا امام کا فریضہ اور ڈیوٹی ہے۔ مقتدیوں کا وظیفہ صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے اور ان کے لیے بغیر انصات کے اور کوئی گنجایش نہیں ہے اور چونکہ یہ روایت مطلق ہے۔ لہٰذا سری اور جہری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ اور مقتدیوں کو کسی نماز میں امام کے پیچھے قرآت کرنے کی اجازت اور گنجائش نہیں ہے۔ یہ روایت صحیح مسلم کے علاوہ حدیث وغیرہ کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں بھی موجود ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۳۵۱)۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۵) حافظ ابن کثیر رح ان کو احد علماء التابعین والائمۃ العاملین لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۱۳) امام بیہقی رح ان کو حافظ حدیث لکھتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۰۶) ۱۱۷ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

۱۱ یونسؒ بن جبیرؒ امام مسلم کا بیان ہے کہ وہ حدیث کے بیان کرنے میں پختہ کار محدث تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۲۷) امام ابن معینؒ عجلیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳۶)

۱۲ حطانؒ بن عبداللہ الرقاشی رح، امام عجلیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث ابن مدینیؒ ان کو ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۹۲) حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ جلیل القدر اور صاحب مناقب صحابی ہیں۔

جس طرح کہ حاشیہ[1] سے بخوبی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حافظ ابو عوانہ رح کی بعض سندیں ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو عوانہ[1] رح فرماتے ہیں کہ ہم سے الصائغ[1] رح نے مکہ مکرمہ میں بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی[2] بن عبداللہ رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جریر رح نے بیان کیا۔ وہ سلیمان رح تیمی سے اور وہ قتادہ رح سے اور وہ ابو غلاب یونس رح بن جبیر رح سے اور وہ حطان رح بن عبداللہ رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رض نے فرمایا:

---

[1] یہ روایت ابو داؤد جلد۱ ص ۱۴۰، مسند احمد جلد۴ ص ۴۱۵، دارقطنی جلد۱ ص ۱۲۵، بیہقی جلد۲ ص ۱۵۵ ابن ماجہ ص ۶۱، محلی ابن حزم رح جلد۳ ص ۲۴۰۔ مشکوٰۃ جلد۱ ص ۸۱۔ جامع صغیر سیوطی ص ۱۳۰۔ مغنی ابن قدامہ جلد۱ ص ۶۰۲۔ فتاوٰی ابن تیمیہ رح جلد۲ ص ۱۴۴، نیل الاوطار جلد۲ ص ۲۴۹۔ نصب الرایہ جلد۲ ص ۱۴۔ توجیہ النظر ص ۲۴۰۔ شرح بلوغ المرام جلد۱ ص ۲۴۵۔ فتح الباری جلد۲ ص ۲۰۱۔ زہر الربیٰ جلد۱ ص ۱۴۶۔ درایہ ص ۹۹۔ ابن کثیر جلد۲ ص ۲۸۰۔ اعلاء السنن جلد۴ ص ۴۲۔ کتاب القرآۃ ص ۸۷۔ امام الکلام ص ۱۱۱۔ کنز العمال جلد۴ ص ۹۶، ۱۸۶۔ فتح القدیر جلد۱ ص ۲۴۱۔ شرح نقایہ ص ۸۳۔ عون الباری جلد۲ ص ۳۰۴۔ عون المعبود جلد۱ ص ۲۲۵۔ تنقیح الرواۃ جلد۱ ص ۱۵۲۔ عمدۃ القاری جلد۳ ص ۲۵۹۔ فصل الخطاب ص ۲۷۔ آثار السنن جلد۱ ص ۸۵۔ جوہر النقی جلد۱ ص ۱۵۳۔ تحفۃ الاحوذی جلد۱۔ کتاب العلل جلد۱ ص ۱۶۴۔ شرح المقنع الکبیر جلد ص ۱۳۔ منتقی الاخبار جلد۲ ص ۱۳۴۔ تعلیق المغنی جلد۱ ص ۱۲۴۔ فتح الملہم جلد۲ ص ۲۲۔ جزء القرآۃ ص ۵۶۔ تنوع العبادات ص ۸۶۔ ازالۃ الستر ص ۵۱۔ خاتمۃ الخطاب ص ۱۶۔ بذل المجہود جلد۲ ص ۵۵۔ برہان العجائب ص ۱۰۴ اور عقیدۃ المحمدیہ جلد۲ ص ۱۹۳ وغیرہ حدیث، تفسیر، شرح حدیث اور کتب فقہ میں نقل کی گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر رح اس طرح لکھتے ہیں:

کما رواہ مسلم فی صحیحہ من حدیث ابی موسٰی الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔ اھ (تفسیر جلد۲ ص ۲۸۰) اور قاضی شوکانی رح نے روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ اور فرماتے ہیں رواہ احمد و مسلم ... الخ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۵۰) اور امام احمد رح نے کتاب الصلوٰۃ ص ۵۲ میں اسی طرح نقل کی ہے۔

(باقی نوٹ نمبر ۲ و ۳ و ۴ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلمنا سنتنا وبین لنا صلوتنا فقال اذا کبر الامام فکبروا واذا قرأ فانصتوا (صحیح ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۳۳)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب کیا اور سنت کی تعلیم دی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور فرمایا کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابو عوانہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سلیمان[۱] رح بن اشعث سجستانی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصم[۲] بن نضر رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معتمر[۳] رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سلیمان تیمی رح سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں (حدثنا قتادۃ) ہم سے قتادہ رض نے بیان کیا۔ وہ ابو غلاب یونس بن جبیر رح سے اور وہ حطان رح بن عبداللہ الرقاشی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

(بقیہ نوٹ پچھلا صفحہ) [۱] امام ابو عوانہ کا نام یعقوب رح بن اسحاق رح ہے (المتوفی ۳۱۶ھ) علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ اور الثقۃ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲)

[۲] الصائغ کا نام محمد بن اسمٰعیل بن سالم تھا۔ (المتوفی ۲۷۶ھ) محدث ابو حاتم رح ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن خراش رح ان کو اہلِ فہم واہلِ امانت کہتے ہیں۔ ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۳۹ تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۸)

[۳] علی رح بن عبداللہ بن مدینی رح۔ (المتوفی ۲۳۴ھ) علامہ ذہبی رح ان کو حافظ العصر قدوہ اور من اباب ھذا الشان لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵) امام نسائی رح فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ مامون اور احد الائمہ فی الحدیث تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۳۵۶)

[۱] صحاح ستہ میں مشہور کتاب سنن ابوداؤد کے مصنف ہیں۔ علامہ ذہبی رح ان کو الامام الثبت اور سید الحفاظ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲) ۲۷۵ھ میں ان کی وفات ہوتی ہے۔

[۲] محدث ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۵۸) حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ ان کو صدوق لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۸۵) کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔

[۳] علامہ ذہبی رح ان کو الامام، الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶)

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فکاف ما بین لنا من صلوتنا و یعلمنا سنتنا قال اقیموا الصفوف ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر الامام فکبروا و اذا قرأ فانصتوا (صحیح ابو عوانہ ج ۲ ص ۱۳۳، ابو دائود جلد ۱ ص ۱۴۰)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور نماز کا طریقہ سکھایا اور سنت کی تعلیم دی اور فرمایا کہ صفیں درست کیا کرو۔ تم میں ایک امامت کا فریضہ انجام دے جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابو عوانہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے سہلؒ بن بحر جندسابوریؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن رشیدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو عبیدہ رح نے بیان کیا۔ وہ قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ الامام فانصتوا و اذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین۔ (ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۳۲)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔

لہ عبداللہؒ بن رشیدؒ اور ابو عبیدہؒ کو علامہ سمعانیؒ مستقیم الحدیث لکھتے ہیں۔ (کتاب الانساب ص ۱۳۷)۔ مولانا ظفر احمد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سہلؒ بن بحرؒ کا ترجمہ مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن کنز العمال جلد ۱ ص ۳ میں لکھا ہے کہ صحیح ابو عوانہ کی تمام حدیثیں صحیح ہیں۔ (اعلاء السنن جلد ۴ ص ۴۹) اور تدریب الراوی ص ۵۵ میں ابو عوانہ کو صحیح کتابوں میں شمار کیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے ابو عوانہ کو الصحیح المسند کے الفاظ سے بیان کیا ہے (تذکرہ جلد ۳ ص ۲) راقم الحروف کہتا ہے کہ مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ ایک سند کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ اور حافظ ابو عوانہؒ کی سند کا بھی صحیح ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۱۸) محقق نیمویؒ نے اس کو متابعت میں پیش کیا تھا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۵) اور مبارک پوری صاحبؒ نے تصحیح طلب کی تھی۔ (ابکار المنن ص ۱۵۲) مگر یہ عبارت خود ہی ان کا جواب ہے۔ خود اپنی پسند کے جواب سے بہتر جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟ وکفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔ مولانا عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم نے الکتاب المستطاب ص ۸۶ میں اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۱۶ اور ص ۱۴۷ میں ابو عبیدہؒ اور سہلؒ بن بحرؒ کے بارے میں ادھر ادھر کے راویوں کا نام لسان المیزان اور کتاب الکنی والدولابیؒ سے نقل کر کے ان کی جو تضعیف

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ان تمام صحیح روایات سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے اور مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے اور آپؐ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ جب امام جہر کرے تو تم خاموش رہو بلکہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور یہ مفہوم عبارۃ النص کے طور پر جہری اور سرّی سب نمازوں کو شامل ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پر فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی ہدیۂ ناظرین کر دیے جائیں۔ تاکہ فنِ روایت اور درایت کے لحاظ سے اس حدیث کی حقیقت بھی آشکارا ہو جائے اور اعتراضات کی پوزیشن بھی واضح ہو جائے۔

پہلا اعتراض

حضرت امام بخاریؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں سلیمان تیمیؒ مدلس ہیں اور وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس لیے حسبِ قاعدہ محدثین یہ روایت قابلِ استدلال نہیں ہو سکتی۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۴ وغیرہ)

جواب۔ یہ سوال بالکل سطحی قسم کا ہے۔

اوّلاً ــــ اس لیے کہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق[1] ہے کہ مدلس راوی جب حدثنا وغیرہ الفاظ سے تحدیث کرے تو تدلیس کا الزام اس پر سے رفع ہو جاتا ہے اور ہم پہلے ابو عوانہ اور ابو داؤد کی صحیح سند کے ساتھ ان کی تحدیث (سلیمان تیمیؒ قال حدثنا قتادۃؒ) نقل کر چکے ہیں اور معتمر بن سلیمانؒ پر بھی مدلس ہونے کا الزام ہے۔ مگر ابو عوانہ اور ابو داؤد کی سابق روایت میں وہ بھی سمعت فرماتے ہوئے تحدیث کرتے ہیں۔

(پچھلا صفحہ۔ حاشیہ) کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ بھلا صحیح ابو عوانہ کے یہ ضعیف راوی کیسے ہو سکتے ہیں جو بتصریح محدثین صحیح ہے۔ ابو عوانہ کی سند میں جو راوی ہیں وہ بالکل ثقہ ہیں اور جن راویوں کی انھوں نے نشاندہی کی ہے وہ راوی ابو عوانہ کے ہرگز نہیں ہیں۔

[1] شرح نخبۃ الفکر ص ۵۳، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۷۰، اور تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۲ وغیرہ ہیں محدثین کا یہ قاعدہ نقل کیا گیا ہے۔

وثانیاً۔ جملہ محدثین کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ اگر مدلس راوی کا کوئی متابع موجود ہو تو تدلیس کا عیب اور طعن اس سے اٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تدلیس کا طعن متابعت سے اُٹھ جاتا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۲) اور صحیح ابو عوانہؒ کی روایت میں ابو عبیدہ سلیمان تیمیؒ کے متابع ہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا محمد حسن صاحب محدث فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ صحیح ابو عوانہ کی مستقل سند میں ابو عبیدہ الحذاءؒ سلیمان تیمی رح کے متابع ہیں اور اس کی سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ (فی غایۃ الصحۃ) (الدلیل المبین ص ۸۱) علاوہ ازیں دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ اور سنن الکبرٰی جلد ۲ ص ۱۵۶ میں ان کے دو اور متابع موجود ہیں۔ عمرؒ بن عامرؒ[1] اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ[2] جب سلیمان تیمیؒ خود تحدیث کرتے ہیں اور ان کے تین ثقہ راوی متابع موجود ہیں تو پھر اعتراض کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

دوسرا اعتراض:

حضرت امام بخاریؒ، امام دار قطنیؒ اور امام ابوداؤدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت محفوظ نہیں ہے۔

لم یجئ بہ الا سلیمان التیمیؒ فی ہذا الحدیث۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶ وکتاب الکنیٰ ص ۳۵، دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ وابوداؤد جلد ۱ ص ۱۴۰)

کیونکہ سلیمان تیمیؒ کے بغیر اس حدیث میں یہ زیادت اور کسی سے مروی نہیں ہے۔

---

[1] عمرؒ بن عامرؒ۔ یہ مسلم کے رواۃ اور رجال میں تھے۔ امام ابن معینؒ اور محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ثبت فی الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۶۷)

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۷) امام دار قطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) اور امام بیہقیؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عمرؒ بن عامرؒ اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ کی سند میں سالمؒ بن نوحؒ واقع ہے۔ جو قوی نہیں ہے اس لیے یہ روایت متابعت کے قابل نہیں ہے۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ و سنن الکبرٰی جلد ۲ ص ۱۵۶) لیکن یہ اعتراض چنداں وزنی نہیں ہے۔ کیونکہ سالمؒ بن نوحؒ سے امام مسلمؒ (مثلاً جلد ۱ ص ۲۳۶،

جواب۔ ان اکابر کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہے:

اولاً: اس لیے کہ سلیمان تیمیؒ[1] بلا اختلاف ثقہ اور ثبت، متقن اور حافظ تھے۔ (جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں) اور تمام محدثین کا اس امر میں اتفاق ہے کہ ثقہ کی زیادت قابل قبول ہے۔ چند نقول ملاحظہ فرمائیں:

علامہ قسطلانیؒ (المتوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ ثقات کی زیادت مطلقاً قابل قبول ہے۔ (قسطلانی جلد ۱ صف) علامہ حازمیؒ (الشافعیؒ المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت مقبول ہے۔ (کتاب الاعتبار ص ۷) امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (کتاب العلل ۲ ص ۲۴۰) امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ فقہائے اسلام کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ متون اور اسانید میں ثقات کی زیادت مقبول ہوگی۔ (مستدرک جلد ۱ ص ۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ حافظ متقن اور مشہور راوی کی زیادت کا انکار ہرگز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی زیادت بہر حال قابل قبول ہوگی۔ لیکن اگر کوئی ایسا راوی جو اس کے ہم پایہ نہ ہو اور متواتر حدیث میں ایک جملہ زائد کرے تو وہ زیادت قابل قبول نہیں ہے۔ (محصلہ کتاب القراۃ ص ۹۵) لیکن سلیمان تیمیؒ تو دوسرے راویوں سے بڑے حافظ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ص ۲۹۹، ص ۳۵۰، ص ۳۵۶، جلد ۲ ص ۱۸۶، ص ۲۲۴، ص ۲۹۵، ص ۳۴۴، ص ۳۹۷، ص ۳۹۸ وغیرہ میں) اور ابن خزیمہؒ اور ابن حبانؒ نے اپنے اپنے صحیح میں احتجاج کیا ہے۔ (جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۲) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ما بحدیثہ بأس ان کی حدیث میں کوئی خرابی نہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو لا بأس بہ اور صدوق کہتے ہیں۔ امام یحییؒ کہتے ہیں ما بأس بذلک ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ابن عدیؒ ان کی حدیثوں کو اقرب الی الصواب کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجیؒ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۴۳، ۴۴۴) فریق ثانی ان کا موازنہ ذرا محمد بن اسحاقؒ سے کر دیکھے جن کی روایت سے ان کا احتجاج ہے۔ ع: وبضدھا تتبیّن الاشیاء

[1] امام دارقطنیؒ نے تشہد کے باب میں وحدہ لا شریک لہ کی زیادت کو جس میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں صحیح تسلیم کیا ہے۔ دیکھو دارقطنی جلد ۱ ص ۱۳۴

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جمہور محدثین اور علماء فقہ و اصول اس بات پر متفق ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت اور تفرد مقبول ہے۔ (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۳۱) علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۵) علامہ زیلعیؒ کا بیان ہے کہ ثقہ متقن اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (زیلعی جلد ۱ ص ۳۳۶) حافظ ابن حجرؒ بھی اس کی تصریح کرتے ہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۳۷) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (توجیہ النظر ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی جب تنہا کوئی زیادت نقل کرے تو وہ صحیح ہے اور اگر کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ اس زیادت کو بیان کرتا ہو تو اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸)

نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وشک نیست کہ زیادت ثقہ مقبول است۔ (بدور الاہلہ ص ۵۶) مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۵) مولانا گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اور زیادت ثقہ کی باتفاق جملہ محدثین قدیم و جدید کہ جن میں خود بخاری علیہ الرحمۃ بھی ہیں صحیح و معتبر ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (ہدایۃ المعتدی ص ۵) ان تمام اقتباسات سے یہ بات یقیناً اور حتماً ثابت ہو جاتی ہے کہ سلیمان تیمیؒ (جو بلا نکیر الامام، الحافظ ثقہ، ثبت اور شیخ الاسلام تھے) کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح اور معتبر ہے۔ اس کا انکار کرنا فن حدیث کے طے شدہ اصول سے انحراف کرنا ہے جو یقیناً مردود ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ

لہ یہ سب بحث روایتی حیثیت سے تھی اور درایتی لحاظ سے بھی یہ زیادت بالکل صحیح ہے مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت اس وقت شاذ اور ناقابل قبول ہوتی ہے جب اصل روایت کے منافی ہو اگر اصل اور ماقبل کے منافی نہ ہو تو جمہور محققین کے نزدیک وہ زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (ابکار المنن ص ۴۲) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ماقبل (انما جعل الامام لیؤتم بہ) کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ اس کے عین مطابق ہے کیونکہ انصات کرنا اور خاموش رہنا اتمام اور اقتداء کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کے وقت خاموشی اختیار نہیں کرتے وہ درحقیقت مؤتم اور مقتدی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اس لیے کہ ان کی امام کے پیچھے قرأت کرنا سراسر

والزیادۃ مقبولۃ والمفسر یقضی علی المبھم اذا رواہ اھل الثبت ... اھ (بخاری ج۱ ص۲۱)

زیادت مقبول ہے اور مفسر روایت مبہم پر حاکم ہے جب کہ اہلِ ثبت اس کو روایت کریں۔

امام خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ

قال الجمھور من الفقھاء واصحاب الحدیث زیادۃ الثقۃ مقبولۃ اذا انفرد بھا ..... اھ (کفایۃ ص۴۲۴)

جمہور فقہاءؒ اور محدثینؒ یہ فرماتے ہیں کہ ثقہ راوی جب منفرد ہو تو اس کی زیادت قابل قبول ہے

اور مختلف اقوال و آراء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

والذی نختارہ من ھذہ الاقوال ان الزیادۃ الواردۃ مقبولۃ علی کل الوجوہ ومعمول بھا اذا کان راویھا عدلاً حافظا ومتقنا ضابطا ..... اھ (کفایہ ص۴۲۵)

ان اقوال میں سے جو قول ہم اختیار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زیادت جہاں بھی وارد ہو وہ بہر صورت مقبول اور قابلِ عمل ہے جب کہ اس کا راوی عادل حافظ اور متقن ضابطہ ہو۔

اور نواب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ونیز زیادت ثقہ مقبول است مطلقاً نزد جماہیر از اہلِ حدیث وفقہ واصول قالہ النوویؒ ..... اھ (ھدایۃ السائل ص۱۹۱) اور علامہ محدث حسین بن محسن انصاریؒ نے شاذ اور معلل پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جب ثقہ راوی زیادت نقل کرے تو وہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے اس کو رد کرنے کا کیا معنیٰ ہ؟ (البیان المکمل ص ۷، المنضم مع الدارقطنی) اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

ومذھب الجمھور من الفقھاء والمحدثین قبولھا مطلقاً (تقریب النواوی مع تدریب الراوی ص۱۵۶)

جمہور فقہاءؒ اور محدثینؒ کا مذہب یہ ہے کہ زیادتِ ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔

اور علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ

وقد ادعی ابن الطاھر الاتفاق علی ھذا القول ..... اھ (تدریب الراوی ص۱۵۶)

اور ابن طاہرؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس قول پر سب کا اتفاق ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اقتدار کے خلاف ہے۔ (فتاوی جلد ۲ ص۱۴۴)

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۸ میں ایک راوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرد کوئی مضر نہیں ہوگا۔۔۔اھ

حافظ ابن حجرؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

وعلی تقدیر تفرد الاوزاعیؒ بذکرھا لا یستلزم ذٰلک تخطئتہ لانھا تکون زیادۃ من ثقۃ حافظ غیر منافیۃ لروایۃ رفقتہ فتقبل ولا تکون شاذۃً ولا معنی لرد الروایات الصحیحۃ بھذہ التعلیلات الواھیۃ۔ (فتح الباری جلد ۱، ص ۲۴۷ طبع مصر۔)

اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس زیادت کے ذکر کرنے میں اوزاعیؒ متفرد ہے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ان کی خطا ہے کیونکہ یہ ثقہ اور حافظ کی زیادت ہے اور یہ اس کے باقی رفقاء کی روایت کے منافی نہیں ہے سو یہ قابل قبول ہے اور شاذ نہیں ہے اور صحیح روایات کو ان رکیک بہانوں سے (کہ یہ شاذ ہیں) ٹھکرانے کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔

اور قاضی شوکانیؒ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۱ صـ ۱۹۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولا یلتفت الی تعلیل الحدیث بہ اذا کان الرافع ثقۃً۔ (نیل جلد ۱ ص ۲۰۲)

اور شاذ کہکر روایت کو معلول قرار دینے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جا سکتی جب کہ رافع ثقہ ہے۔

حضرات محدثین کرامؒ، فقہاء عظامؒ اور ارباب اصول کا یہ اتفاقی اجماعی اور طے شدہ قاعدہ ہے کہ جب راوی ثقہ اور حافظ ہو اور وہ زیادت نقل کرے تو مطلقاً اس کی روایت مقبول ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ سلیمان تیمیؒ ثقہ اور حافظ ہیں لہٰذا ان کی زیادت واذا قرأ فانصتوا بہر حال مقبول ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا (صـ ۴۱۵، صـ ۴۱۷ میں) اور اسی طرح قاضی قاضی مقبول احمد صاحب کا (ملاحظہ ہو الاعتصام صـ ۹ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

امام بیہقیؒ کی تقلید میں اس کو شاذ کہنا بالکل غلط اور قطعاً باطل ہے اور تمام اصول کے خلاف ہے۔ جس کی حیثیت ایک پرکاہ کی بھی نہیں ہے اور اصولِ حدیث کے پیش نظر اس کو کوئی سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اپنے جی کو خوش کرنے یا اپنے حواریوں کا غم ہلکا کرنے کے لیے وہ بڑے شوق سے اس کو شاذ کہتے پھریں۔

وثانیاً۔ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد نہیں، بلکہ صحیح ابو عوانہ کی روایت

میں ابو عبیدہؒ بھی اس زیادت کو نقل میں سلیمان تیمیؒ کے ساتھ ہیں اور ابو عوانہؒ کی سند کا صحیح ہونا خود مبارک پوری صاحبؒ کو بھی مسلم ہے۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ نیز عمرؒ بن عامر اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ بھی اس زیادت کو بیان کرتے ہیں اور دونوں ثقہ ہیں اور ان کی سند علی شرط مسلم صحیح ہے کما مر۔ الغرض فریق ثانی کا یہ اعتراض سراسر باطل ہے اور یہ اس حدیث کی صحت پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

وما اعله البخاری فلیس بقادح فی صحتہ (تنوع العبادات ص۵۹)

امام بخاریؒ (وغیرہ) نے اس حدیث کو معلول ٹھہرانے کی جو کوشش کی ہے تو اس سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

الحاصل سلیمان تیمیؒ کی یہ روایت بلا شک وشبہ بالکل صحیح ہے اور اس میں ان کی غلطی بتلانا ان پر بہتان باندھنا ہے۔ امام احمدؒ سے کسی نے سوال کیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سلیمان تیمیؒ نے خطا کی ہے تو امام احمدؒ نے جواب دیا: جس شخص نے سلیمان تیمیؒ کی طرف خطا کی نسبت کی ہے وہ ان پر بہتان باندھتا ہے (الجوہر النقی جلد ۲ صہ ۱۵۵) اس روایت میں اصل قصور اور خطا ان رواۃ کی ہے جنہوں نے یہ صحیح زیادت ترک کر دی ہے۔ فسامحھم اللہ تعالی بعموم فضلہ۔

مؤلف خیر الکلام نے اپنے پیشرو حضرات کے نقش قدم پر چل کر واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دھینگا دھینگی غیر مقبول اور شاذ بنانے کی کوشش ناکام کی ہے۔ اور شاذ کی تعریف پر مطلقاً غور نہیں کیا اور نہ غور کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ پھر تو قلعی کھل جاتی تھی اگرچہ انہوں نے صہ ۲۱۸ میں شرح نخبہ اور مقدمہ ابن الصلاح وغیرہ سے شاذ کی تعریف نقل کی ہے لیکن لفظ یخالف فیہ الناس پر غور نہیں کیا شاذ کی تعریف سنیئے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ

قال الشافعیؒ لیس الشاذ من الحدیث ان یروی الثقۃ مالا یرویہ غیرہ ھذا لیس بشاذٍ وانما الشاذ ان یروی الثقۃ حدیثا یخالف فیہ الناس

شاذ وہ حدیث نہیں ہے جس کو ثقہ روایت کرے اور دوسرے روایت نہ کرتے ہوں بلکہ شاذ وہ روایت ہے جس کو ثقہ روایت کرتا ہو مگر اس میں دوسرے لوگوں کی مخالفت کرے

هذا الشاذ من الحديث

(معرفۃ علوم الحدیث ص۱۱۹)

یہ ہے شاذ۔

امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ

وعلامة المنكر في حديث المحدث اذا ما عرضت روايته للحديث على رواية غيره من اهل الحفظ والرضى خالفت روايته روايتهم اولم تكد توافقها فاذا كان الاغلب من حديثه كذلك كان مهجور الحديث غير مقبوله ولا مستعمله۔ ...اھ (مسلم جلد ۱ ص ۵)

اور محدث کی قابل انکار حدیث کی علامت یہ ہے کہ جب اس کی روایت دوسرے اہل حفظ اور پسندیدہ راویوں کی روایت پر پیش کی جائے تو اس کی روایت ان کی روایت کے مخالف ہو یا ممکن ہی نہیں کہ اس کے موافق ہو پس جب اس کی حدیث پر اغلب یہ ہو تو اس کی حدیث متروک اور غیر مقبول ہوگی اور قابل عمل نہ ہوگی۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

لان الزيادة اما ان تكون لا تنافي بينها وبين رواية من لم يذكرها فهذه تقبل مطلقا لانها في حكم الحديث المستقل الذي يتفرد به الثقة ولا يرويه عن شيخه غيره واما ان تكون منافية بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى فهذه هي التي يقع الترجيح بينها وبين معارضها فيقبل الراجح ويرد المرجوح ....اھ

(شرح نخبۃ الفکر ص ۳۷)

کیونکہ زیادت یا تو ایسی ہوگی کہ اس میں اور دوسرے راویوں کی روایت میں جنھوں نے اس کو ذکر نہیں کیا منافاۃ نہ ہوگی تو ایسی زیادت مطلقاً مقبول ہے کیونکہ یہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کے بیان میں ثقہ راوی متفرد ہو اور اس کے شیخ سے اور کوئی روایت نہ کرتا ہو اور یا وہ زیادت ایسی ہوگی کہ وہ دوسرے راویوں کی روایت کے منافی ہوگی اس حیثیت سے کہ اس کے قبول کر لینے سے دوسری روایت کا رد لازم آتا ہو تو اس میں اور اس کی معارض میں ترجیح کا سوال ہوگا راجح کو قبول کیا جائے گا اور مرجوح کو رد کر دیا جائیگا۔

اور تدریب الراوی میں ہے۔

ثم يفسرون الشذوذ بمخالفة الثقة من هو أوثق منه والمنقول عن أئمة الحديث المتقدمين كابن مهدي ويحيى القطان وأحمد وابن معين وابن المديني والبخاري وأبي زرعة وأبي حاتم والنسائي والدارقطني وغيرهم اعتبار الترجيح فيما يتعلق بالزيادة المنافية بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الأخرى .... اھ

(تدريب الراوي ص ۱۵۷)

پھر حضرات محدثینؒ شذوذ کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ثقہ راوی ثقہ تر راوی کی مخالفت کرے اور متقدمین ائمہ حدیث مثلاً ابن مہدیؒ یحیی القطانؒ، احمدؒ، ابن معینؒ، ابن المدینیؒ بخاریؒ، ابوزرعہؒ، ابوحاتمؒ، نسائیؒ اور دارقطنیؒ وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ اعتبار ترجیح کا اس منافی زیادت سے متعلق ہے جس کا قبول کر لینا دوسری روایت کے رد کو مستلزم ہو۔

اور توجیہ النظر میں ہے۔

وزيادة راوي الصحيح والحسن تقبل مطلقاً إن لم تكن منافية لرواية من لم يذكرها لأنها حينئذٍ كالحديث المستقل الذي ينفرد به الثقة ولا يرويه عن شيخه غيره فإن كانت منافيةً لها بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الأخرى بحث عن الراجح منهما فإن كان الراجح منهما رواية من لم يذكر تلك الزيادة لمزيد ضبطه أو كثرة عدده أو غير ذلك من موجبات الرجحان ردت تلك الزيادة وإن كان الراجح

صحیح اور حسن کے راوی کی زیادت مطلقاً مقبول ہے اگر وہ ان راویوں کی روایت کے مخالف نہ ہو جنھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس وقت مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کو ثقہ راوی انفرادی طور پر بیان کرتا ہے اور اس کے شیخ سے کوئی اور اس کا راوی نہیں ہے۔ پس اگر وہ زیادت دوسری روایت کے جس میں زیادت نہیں ہے بایں طور منافی ہو کہ اس زیادت کے قبول کر لینے سے اس روایت کا رد لازم آتا ہو تو یہاں راجح و مرجوح کی بحث چلے گی۔ اگر راجح ان راویوں کی روایت ہے جنھوں نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ مزید ضبط

منها روایة من ذکر تلك الزیادة قبلت ..... اھ

(توجیه النظر ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

یا کثرۃ عدد یا ترجیح کے اور اسباب میں سے کوئی سبب ہو تو اس زیادت کو رد کر دیا جائیگا اور اگر راجح اس کی روایت ہے جس نے اس کو ذکر کیا ہے تو زیادت قبول کر لی جائے گی۔

ان تمام اقتباسات سے روز روشن کی طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ شاذ اور غیر مقبول روایت میں حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک ایک بنیادی شرط ہے وہ یہ کہ اس کی روایت باقی ثقات کی روایت کے مخالف اور منافی ہو اور مخالفت اور منافات بھی بایں طور کہ اس کے تسلیم کر لینے سے ان باقی ثقات کی روایت (جس کو وہ اپنے ثقہ شیخ سے صحیح اور متصل سند کیساتھ روایت کرتے ہیں اور ان میں وجوہ ترجیح بھی موجود ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔) کا رد لازم آتا ہو اور اس زیادت کی اصل حدیث کے ساتھ موافقت کی مطلقاً کوئی راہ نہ پیدا ہوتی ہو (اولم تکد توافقھا) لیکن یہاں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کا معاملہ ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل روایت سے قطعاً کوئی مخالفت اور منافات نہیں ہے بلکہ یہ تو حدیث کے اول حصہ کی مؤید ہے جیسا کہ ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کا کوئی جواب مؤلف خیر الکلام نے نہیں دیا بلکہ جواریوں کو مغالطہ دینے کے لیے یہ لکھ مارا ہے کہ قبول کرنے والوں نے شذوذ کا کوئی جواب نہیں دیا (ص ۴۲۲) ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت انما جعل الامام لیؤتم بہ کی عین مؤید ہے۔ اس کے منافی اور مخالف ہرگز نہیں اس لیے یہ کسی صورت میں شاذ اور غیر مقبول نہیں ہے۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جو لوگ اس زیادتی کو بقیہ حدیث کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کی تقریر یہ ہے کہ شروع حدیث میں یہ جملہ ہے انما جعل الامام لیؤتم بہ کہ امام کی پیروی کرو اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں یہ لفظ بھی ہے فلا تختلفوا علیہ۔ سنن کبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ اس کے ساتھ مخالفت نہ کرو یعنی جس طرح امام کرے اسی طرح کرو اس جملہ کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے پڑھے (محصلہ ص ۴۳۱) تو یہ سب ان کی غفلت کا نتیجہ ہے:

اوّلاً — اس لیے کہ حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت میں انما جعل الامام لیؤتم بہ کا حصہ عمرؒ بن عامر اور سعیدؒ بن ابی عروبہ کے طریق سے آتا ہے اور مؤلف خیر الکلام توص۴۱۱ میں ان کی حدیث کو شاذ کہتے ہیں۔ پھر بقول ان کے اس شاذ پہ بنیاد رکھنا کیونکر صحیح ہے؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی سالمؒ بن نوحؒ ہے جو مؤلف خیر الکلام کے نزدیک ضعیف ہے۔

وثانیاً — فلا تختلفوا علیہ کا جملہ محمدؒ بن عجلانؒ کی روایت میں ہے اور وہ ان کے نزدیک وہمی ہیں پھر اس کا کیا اعتبار؟

وثالثاً۔ اگر امام کی مخالفت کا یہی معنیٰ ہے تو مقتدی نہ صرف یہ کہ سورۃ فاتحہ ہی پڑھیں بلکہ ما زاد بھی پڑھیں اور جہر کے ساتھ پڑھیں اور ہر ایک امام کی طرح مصلی پر کھڑا ہو۔ کیونکہ جو امام کرتا ہے سو مقتدی بھی کریں فلا تختلفوا علیہ پر پورا عمل ہونا چاہیے۔ الغرض ان رکیک قسم جہات سے اس صحیح زیادت کا انکار اور اس کو شاذ کہنا سراسر باطل ہے۔

تیسرا اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں قتادہؒ مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے اور مدلس کی معنعن روایت قابلِ التفات نہیں ہوتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۱ وابکار المنن ص ۵۸ وغیرہ)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے:

اوّلاً — اس لیے کہ یہ روایت مسلمؒ کی ہے اور بخاریؒ و مسلمؒ کی ثقہ ذوات سے مروی جملہ روایات کے صحیح ہونے پر امّت کا اجماع و اتفاق ہے۔ اگر صحیحین کی معنعن حدیثیں صحیح نہیں تو امت کا اتفاق اور اجماع کس چیز پر واقع ہوا ہے جبکہ راوی بھی سب ثقہ ہیں

وثانیاً — یہ روایت ابو عوانہؒ کی ہے اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ لہٰذا قتادہؒ کی اس سند کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔

وثالثاً — محدثین کا اتفاق ہے کہ مدلس راوی کی تدلیس صحیحینؒ میں کسی طرح بھی مضر نہیں ہے

---

[۱] صحیحین کی تدلیس کے مضر نہ ہونے کا یہ قاعدہ امام نوویؒ و قسطلانیؒ کے علاوہ علامہ سخاویؒ (المتوفی ۹۰۲ھ) (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

وما فی الصحیحین من التدلیس فمحمول علی السماع من جهة اخری۔

صحیح بخاری و مسلم میں جو تدلیس واقع ہو تو وہ دوسرے دلائل سے سماعت پر محمول ہے۔

(مقدمہ ص ۱۸ و شرح مسلم جلد ۱ ص ۳۳)

یعنی اگر صحیحین میں کوئی مدلس راوی عنعنہ سے روایت کرتا ہے تو محدثین کرامؒ کے نزدیک وہ ایسی ہے جیسے اس راوی نے حدثنا اور اخبرنا وغیرہ سے تحدیث کی ہو اور علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ امام اعمشؒ، قتادہؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ سے بخاری و مسلم میں جو روایتیں عنعنہ سے مروی ہیں وہ سماع پر محمول ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان کی تحدیث پر اطلاع نہ ہو سکے۔ کیونکہ امام بخاریؒ و مسلم سے متعلق ہم یہی اچھا اور نیک گمان قائم کر سکتے ہیں۔ (قسطلانی جلد ۱ ص ۹) امام سبکیؒ نے علامہ مزیؒ سے سوال کیا کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے جو روایتیں عنعنہ کے ساتھ نقل کی ہیں کیا ان میں صراحت کے ساتھ تحدیث بھی ثابت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اکثر روایات میں اس کا ثبوت موجود نہیں ہے مگر ہمیں تحسین ظن کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ (تدریب الراوی ص ۵۹)

مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۲۰ میں یہ لکھ کر اپنا دل خوش کر لیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا۔۔۔ الخ مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ قاعدہ مذکورہ بخاری اور مسلم کی تمام مدلس روایتوں سے متعلق ہے صحیحین کی کوئی مدلس روایت اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں اور ایسی کوئی تنقید ان پر نہیں ہو سکی جس سے انکی مدلس روایت ضعیف ہو سکے لہذا صحیحین کے رواۃ کی تدلیس کی آڑ لے کر صحیح حدیث کا انکار کرنا قانون روایت اور فن حدیث کے بالکل خلاف ہے جو بہر صورت مردود ہے۔ ہاں اگر کوئی راوی ضعیف ہوتا تو معاملہ جدا ہوتا۔

و رابعاً ___ قتادہؒ کا شمار طبقہ اولیٰ کے ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی کتاب میں مضر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) نے فتح المغیث ص ۷۷ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی ص ۱۴۴ میں اور محدث عبدالقادر القرشیؒ (المتوفی ۷۷۵ھ) نے الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۴۲۹ میں اور نواب صاحبؒ نے ہدایۃ السائل ص ۱۹۱ میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نہیں ہے۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ مدلسین کا ایک گروہ وہ ہے جو اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر یا اپنے سے کچھ کم ثقہ راویوں سے روایت کرتا ہے، مگر وہ اس زمرہ سے خارج نہیں جن کی روایتیں قابل قبول ہوتی ہیں سوا ایسے۔ مدلسین میں ابو سفیان طلحہؒ بن نافعؒ اور قتادہؒ بن دعامہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۰۳) علامہ جزائریؒ علامہ ابن حزمؒ سے محدثین کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے ان مدلسین کی فہرست بتاتے ہیں جن کی روایتیں باوجود تدلیس کے صحیح ہیں اور ان کی تدلیس سے صحت حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا چنانچہ لکھتے ہیں کہ

منهم كان جلة اصحاب الحديث وائمة المسلمين كالحسن البصري وابي اسحاق السبيعي وقتادة بن دعامة وعمرو بن دينار وسليمٰن الاعمش وابي الزبير وسفيان الثوري وسفيان بن عيينة۔ (توجيه النظر ص ۲۵۱)

ان مدلسین میں جلیل القدر محدث اور مسلمانوں کے امام شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ، ابو اسحاق السبیعیؒ قتادہ بن دعامہؒ، عمروؒ بن دینارؒ، سلیمٰن اعمشؒ، ابو الزبیرؒ، سفیان ثوریؒ اور سفیان عیینہؒ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ پہلے تو صحیحین میں کسی راوی کی تدلیس مضر نہیں۔ قتادہؒ کی ہو یا کسی اور راوی کی اور پھر قتادہؒ کا شمار محدثین کے نزدیک ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی محل اور کسی موقع پر مضر نہیں ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رح نے جو یہ کہا ہے کہ قتادہ رح مدلس ہیں۔ لہٰذا یہ روایت متصل نہیں مردود ہے اس لیے کہ ولا شك عندنا ان مسلماً رحمه الله تعالىٰ يعلم هٰذه القاعدة ويعلم تدليس قتادةؒ فلولا ثبوت سماعه عنه لم يحتج به الى ان قال و نسبة الى مثل قتادة الذى محله من العدالة والحفظ والعلم والغاية العالية (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۰۹) ——— اور ہمارے نزدیک اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ امام مسلم رح یہ قاعدہ جانتے ہیں کہ مدلس کا عنعنہ قبول نہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قتادہ رح مدلس ہیں۔ اگر امام مسلمؒ کے نزدیک قتادہؒ کا سماع ثابت نہ ہو تو وہ اس سے احتجاج نہ کرتے۔ (پھر آگے فرمایا) اور امام دارقطنیؒ نے قتادہؒ جیسی شخصیت کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جن کا مقام عدالت اور حفظ اور علم اور کمال کے انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا ہے ——— یہ حضرات محدثین کرامؓ کا طے شدہ ضابطہ ہے۔ علامہ ابن حزمؒ کی ظاہریت نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے اور امام حاکمؒ نے بھی

اس کی تصریح کی ہے۔ کما مر۔

وخامساً۔ ہم مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع کے مشکور ہوں گے کہ وہ بخاریؒ[1] ومسلمؒ[2] کی ان جملہ روایات پر جن میں قتادہؒ نے عنعنہ کیا ہے۔ خط تنسیخ کھینچ دیں اور یا ان کے غیر صحیح ہونے کا کھلا اعلان کر دیں ؎

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں وکار آساں کن

مؤلف خیر الکلام نے وہی پرانی رٹ لگائی ہے کہ قتادہؒ مدلس ہیں اور حافظ ابن حجرؒ نے ان کو اپنی کتاب طبقات المدلسین میں تیسرے درجہ کا مدلس کہا ہے جن کی روایت بدون تصریح سماع صحیح نہیں اور امام حاکمؒ کا قول مجمل ہے اور معرفت علوم الحدیث ص۱۰۱ میں ہے کہ سلیمان شاذکونی فرماتے ہیں کہ جو شخص حدیث پر عمل کرنا چاہے وہ اعمشؒ اور قتادہؒ کی وہی روایت لے جس میں وہ سماع کی تصریح کریں اور بخاری میں قتادہؒ کی جو معنعن روایتیں ہیں وہ امام شعبہؒ کے طریق سے ہیں۔ (محصلہ خیر الکلام ص۴۲، ص۴۲۱) مگر یہ باتیں نہایت کمزور اور ضعیف ہیں۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ قتادہؒ کی تدلیس کے بارے میں امام حاکمؒ کا قول مجمل نہیں بڑا مفصل ہے۔ وہ ان کو طبقہ اولیٰ کا مدلس بتاتے ہیں جس طبقہ کی تدلیس قطعاً مضر نہیں ہوتی اور یہ محدثین کے ہاں طے شدہ امر ہے اور ہم نے فتح المغیث، تدریب الراوی اور ہدایۃ السائل وغیرہ کے حوالے درج کر دیے ہیں کہ صحیحین کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب جو مؤلف خیر الکلام نے دیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا اور حدیث زیر بحث پر تنقید ہو چکی ہے بلفظہٖ (ص۴۲) قطعاً باطل اور سراسر مردود ہے۔ یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ بخاری اور مسلم کی اُن روایتوں میں تدلیس مضر ہے جن پر تنقید ہوئی ہو۔ —— حوالہ درکار ہے مطلب انکے نزدیک یہ ہوا کہ بخاری

---

[1] مثلاً بخاریؒ جلد ۱ ص ۱۰۳/۱، ص ۱۸۳/۱، ص ۳۲۵/۱، ص ۴۶۱/۱، ص ۷۸۶/۲، ص ۷۹۰/۲، ص ۷۹۱/۲، ص ۹۲۴/۲، ص ۸۳۴/۲، ص ۸۳۵/۲۔

[2] مثلاً مسلم جلد ۱ ص ۱۸۸، ص ۱۹۲/۱، ص ۱۹۳/۱، ص ۲۵۵/۱، ص ۲۵۷/۱، ص ۲۳۶/۱، ص ۲۳۷/۱، ص ۲۴۹/۱، ص ۲۷۰/۱ وغیرہ وغیرہ۔

اور مسلم کی سب روایتیں صحیح نہیں کیونکہ انکی بعض روایتوں پر تنقید ہو چکی ہے تو پھر پرویز صاحب اور مودودی صاحب کا کیا قصور ہے؟ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ بخاری و مسلم کی سب روایتیں صحیح نہیں ہیں اور یہی فریق ثانی کے شیخ الحدیث صاحب کہہ رہے ہیں مگر کسی غیر مقلد کو اس پر واویلا مچانے کی توفیق نہیں ہوئی؟ آخر کیوں؟ اگر انکی رائے کے مطابق کوئی اور بھی صحیحین کی بعض روایتوں پر تنقید کرے تو انکو چیں بجبیں نہیں ہونا چاہیے۔ بلاشک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبقات المدلسین میں قتادہ رح کو تیسرے طبقہ کا مدلس کہا ہے مگر آخر میں اس سے رجوع کر لیا ہے۔

چنانچہ قاضی شوکانی رحمہ حافظ ابن حجر عسقلانی رح کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ونقل عنہ انہ قال لست راضیاً عن شیء من تصانیفی لانها عملتها فی ابتداء الامر ثم لم یتهیأ لی من یحررها معی سوی شرح البخاری ومقدمتہ والمشتبہ والتهذیب ولسان المیزان وروی عنہ فی موضع آخر انہ اثنی علی شرح البخاری والتعلیق والنخبۃ..... اھ (البدر الطالع ص۸۹ طبع اول ۱۳۴۸ھ)

حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں اپنی کسی تصنیف پر راضی نہیں ہوں کیونکہ وہ میں نے ابتدائی دور میں لکھی ہیں اور تحریر کرنیوالا رفیق بھی مجھے میسر نہ ہو سکا (اس لیے ان تصانیف میں سقم رہ گیا ہے) ہاں فتح الباری اس کا مقدمہ مشتبہ تہذیب اور لسان المیزان پر میں خوش ہوں اور ان سے دوسری جگہ مروی ہے کہ انہوں نے فتح الباری، تعلیق اور نخبہ کی بڑی تعریف کی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حافظ موصوف بغیر ان چند کتابوں کے جن میں فتح الباری بھی ہے اپنی اور کسی تصنیف پر نہ راضی ہیں اور نہ اعتماد کرتے ہیں کیونکہ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ کتابیں لکھی ہیں جن میں علم و عقل خام ہوتے ہیں اور قابلِ اعتماد رفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہو سکا۔ تاکہ اس کی امداد شامل ہو جاتی اور ان کی ابتدائی کتابوں میں طبقات المدلسین بھی ہے۔ بخلاف اس کے فتح الباری اور دیگر چند کتابوں پر جن کے نام اوپر بیان ہو چکے ہیں وہ بڑے راضی ہیں اور فتح الباری (مثلاً جلد ۲ ص ۲۰۲ وغیرہ) میں قتادہؒ کی معنعن روایت کو صحیح کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے سابق نظریہ سے رجوع کر لیا ہے۔ اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۰۶ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں قتادہؒ ہے جو تیسرے طبقہ کے مدلسین سے ہے اور یہاں عن کے ساتھ روایت کرتا ہے مگر بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے..... الخ مؤلف مذکور نے اس روایت

سے استدلال کیا ہے اور اس کی صحت پر کوئی کلام نہیں کیا کیوں؟ اس لیے کہ ؎

آخر کو ہم دونوں در جاناں پہ جا ملے

وثانیًا — حضرات محدثین عظام رحمہ اللہ کے ضابطہ پر تو مؤلف خیر الکلام مطمئن نہیں ہیں اور سلیمان شاذکونی کی لاتوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں اور یہ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ وہ کون ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فیہ نظر۔ ابن معین رحمہ اللہ نے اس کو حدیث میں جھوٹا کہا۔ ابو حاتم رحمہ اللہ اس کو متروک الحدیث اور نسائی رحمہ اللہ لیس بثقہ کہتے ہیں اور صالح جزرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کان یکذب فی الحدیث کہ حدیث میں جھوٹ کہتا تھا اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ شراب پیتا اور بیہودہ حرکتوں میں آلودہ تھا اور نیز فرمایا کہ درب دمیک میں شاذکونی سے بڑا جھوٹا اور کوئی داخل نہیں ہوا۔ بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رماہ الائمۃ بالکذب ائمہ حدیث نے اس کو جھوٹ سے متہم کیا ہے اور امام یحییٰ رحمہ اللہ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کان یضع الحدیث کہ وہ جعلی روایتیں بنایا کرتا تھا۔ امام ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ اس کو متروک الحدیث اور امام ابن مہدی رحمہ اللہ اس کو خائب اور نامراد کہتے تھے۔ امام عبد الرزاق رحمہ اللہ نے اس کو عدو اللہ، کذاب اور خبیث کہا اور صالح جزرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آناً فاناً سندیں گھڑ لیتا تھا اور صالح بن محمد رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ کذاب اور لونڈے بازی سے متہم تھا۔ (محصلہ لسان المیزان جلد ۳ ص ۸۴ تا ۸۷) یہ ہے مؤلف خیر الکلام کا وکیل لاحول ولا قوۃ الا باللہ امام بخاری رحمہ اللہ نے شعبہ رحمہ اللہ کے طریق کے علاوہ بھی بغیر تحدیث اور سوائے متابعت کے قتادہ رحمہ اللہ کی بہت سی روایتیں لی ہیں۔ مثلاً جلد ۱ ص ۷۶، ص ۸۱، ص ۸۲، ص ۱۳۸، ص ۱۴۰، ص ۱۵۲، ص ۱۶۷، ص ۱۷۸، ص ۲۵۷، ص ۲۷۸، ص ۳۲۵، ص ۳۳۰، ۳۴۱، ۳۴۳، ۳۸۳، ۳۸۵، ۴۰۱، ۴۱۶، ۴۸۱، ۴۸۶ وغیرہ وغیرہ۔ کیا ان تمام روایتوں کو ضعیف سمجھا جائے۔ مؤلف خیر الکلام ہوش میں آکر جواب دیں۔ نری لفاظی بیکار ہے۔

وثالثاً — امام دارقطنی رحمہ اللہ ایک سند اس طرح نقل کرتے ہیں: عن قتادۃ عن ابی غلاب عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی.... الخ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ وھذا اسناد متصل حسن (جلد ۱ ص ۱۳۴) یہاں قتادہ رحمہ اللہ عن سے روایت کرتے ہیں لیکن امام دارقطنی رحمہ اللہ اس کو متصل اور حسن کہتے ہیں۔

لطیفه : اس حدیث میں سلیمان تیمیؒ وحدہ لا شریک لہ کی زیادت نقل کرنے میں متفرد ہیں اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ خالفہ ھشام وسعید وابان وابو عوانة وغیرھم عن قتادة ... اھ کہ یہ سب راوی سلیمان تیمیؒ کی مخالفت ہیں۔ بایں ہمہ یہ روایت نہ معلل ہے اور نہ شاذ بلکہ متصل اور حسن ہے مگر افسوس کہ یہی سلیمان تیمیؒ جب واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کریں اور ان کے ثقہ متابع بھی موجود ہوں تو روایت فوراً شاذ ہو جاتی ہے آخر کیوں ؟

وسابعاً — تحدیث کبھی یوں ہوتی ہے کہ خود راوی کہتا ہے حدثنی فلاں یا سمعت فلانا یا اسی قسم کے اور الفاظ استعمال کرتا ہے اور کبھی لفظ عن ہوتا ہے لیکن اوپر کا راوی حدثہ یا یحدثہ کہتا ہے یہ بھی تحدیث ہی ہوتی ہے اور واذا قرأ فانصتوا کی روایت میں قتادہؒ کی تحدیث موجود ہے لہٰذا ان کو مدلس کہہ کر ان کی روایت کو رد کرنا قطعاً باطل اور یقیناً مردود ہے۔ چنانچہ ابو داؤد اور ابو عوانہ میں یوں ہے کہ

المعتمرؒ قال سمعت ابی ثنا قتادة عن ابی غلاب یحدثہ عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی ... اھ

(ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۴۰، ابو عوانہ ج ۲ ص ۱۳۲)

معتمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ (سلیمان تیمیؒ) سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قتادہؒ نے بیان کیا وہ ابو غلاب سے روایت کرتے ہیں انھوں نے قتادہؒ سے بطریق حطانؒ بن عبد اللہ الرقاشیؒ حدیث بیان کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابو غلابؒ نے قتادہؒ سے حدیث بیان کی ہے۔ تحدیث اور کیا ہوتی ہے ؟ اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

یحدثہ ای یحدث ابو غلاب قتادة عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی ... اھ

(بذل المجھود جلد ۲ ص ۱۲۱)

یعنی ابو غلابؒ نے قتادہؒ سے حطانؒ بن عبد اللہ الرقاشیؒ کے طریق سے حدیث بیان کی ہے۔

اس لیے قتادہؒ کی تدلیس کا بہانہ بھی سراسر باطل ہے کیونکہ اس روایت میں تحدیث موجود ہے صرف غیر بالغ نظر لوگوں نے لفظ عن سے دھوکا کھایا اور دیا ہے۔ امام نوویؒ

لکھتے ہیں کہ

وکذا قال وحدث وذکر وشبھھا فکلہ محمول علی الاتصال والسماع۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱)	اور اسی طرح لفظ قال اور حدث اور ذکراور ان کی مانند اور الفاظ اتصال اور سماع پر محمول ہیں۔

لہٰذا اصول حدیث کے رُو سے قتادہؒ کی یہ روایت متصل اور صحیح ہے باقی خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار مؤرخِ اسلام علامہ عبد الرحمٰن بن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) بخاری اور مسلم کی صحت اور مزیّت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ومن اجل ھذا قیل فی الصحیحین بالاجماع علی قبولھما من جھۃ الاجماع علی صحۃ ما فیھما من الشروط المتفق علیھا فلا تاخذک ریبۃ فی ذلک فالقوم احق الناس بالظن الجمیل بھم۔	اور اسی واسطے کہا گیا کہ بخاری اور مسلم کی روایات کے قبول کرنے پر اجماع ہے اس لیے کہ جو صحت کی متفق علیھا شرطیں ان میں موجود ہیں ان پر اجماع ہو چکا ہے لہٰذا اس بارے میں ذرہ بھر شک نہ کر کیونکہ وہ حضرات تمام لوگوں میں ظنِ جمیل کے زیادہ مستحق ہیں۔

اور صحیح مسلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ثم جاء الامام مسلم بن الحجاج القشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فالف مسندہ الصحیح حذا فیہ حذو البخاری فی نقل المجمع علیہ...اھ (مقدمۃ ابن ص ۴۴۵)	پھر امام مسلمؒ بن الحجاج القشیریؒ آئے اور انھوں نے اپنا مسند صحیح تالیف کیا جس میں وہ امام بخاریؒ کے نقش قدم پر چلتے رہے اور مجمع علیھا روایتیں نقل کرتے رہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

ولکن الشیخان لا یذکران الا حدیثاً قد تناظرا فیہ مشائخھما واجمعوا علی القول بہ والتصحیح لہ اھ (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۳۴)	اور لیکن امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ صرف وہی حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنے اساتذہ سے بحث و مناظرہ کیا ہوتا ہے اور جس کے بیان کرنے اور تصحیح پر ان سب کا اجماع ہو چکا ہے

اور علامہ حسین بن محسنؒ لکھتے ہیں کہ

وقد حصل الاتفاق علی الحکم بصحۃ ما فی الصحیحین غیر المستثنیٰ ... الخ
بے شک اس بات پر اتفاق حاصل ہو چکا ہے کہ بخاری اور مسلم میں تمام روایتیں بغیر استثناء کے صحیح ہیں۔

(البیان المکمل ص ۲)

حضرات محدثین کرامؒ کا یہ فیصلہ ہے لیکن غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث صاحب بخاریؒ اور مسلمؒ کی صحیح روایات کو بھی مودودی صاحب اور پرویز صاحب کی طرح تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ فَوَا اَسفَا ـــــ ترجمان الحدیث ماہ نومبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۷ میں جو بات ہمارے حق میں لکھی ہے وہ خود ان حضرات پر سو فیصد فٹ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ہم ناظرین کرامؒ سے ایمان اور دیانت داری کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ اگر محدثین اور رواۃ حدیث کے متعلق یہ رائے صحیح ہے جس کا اظہار یہ حضرات کر رہے ہیں تو از راہ انصاف بتلایا جائے کہ کیا محدثین کی امانت و دیانت محفوظ رہی؟ منکرین حدیث نے آخر کونسا تیر مارا جس کے زخموں سے ہم پریشان ہیں؟"

چوتھا اعتراض۔ مبارکپوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو امام بخاریؒ، ابوداؤدؒ، ابوحاتمؒ، ابن معینؒ، حاکمؒ، دارقطنیؒ، ابن خزیمہؒ، ذہلیؒ، ابوعلی نیشاپوریؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے یہ زیادت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۳)

جواب۔ ان حضرات کا اس زیادت کو صحیح نہ تسلیم کرنا اس بات پر مبنی تھا کہ اس زیادت کے بیان کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں، نیز قتادہؒ کی طرح وہ مدلس بھی ہیں اور ان باتوں کے تسلی بخش اور مسکت جوابات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لہٰذا اس زیادت کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مبارک پوری صاحبؒ اور ان کے اتباع مردم شماری کے لحاظ سے حق و باطل، صحیح و غلط میں تمیز قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو وہ بھی سن لیں:

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو صحیح سمجھنے والے یہ حضرات ہیں:

۱۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ (مسند احمد ۲ ص ۳۸۶، تعلیق الحسن جلد ۲ ص ۸۶، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۲۔ امام مسلمؒ (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، درایہ ص ۹۴)

۳- امام نسائیؒ (بہ حوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۴- امام ابن جریرؒ (تفسیر جلد ۹ ص ۱۱)

۵- علامہ ابن حزمؒ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۶- امام منذریؒ (عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴، تحقیق الکلام ۲ ص ۸۳، نفحۃ العنبر ۷۹)

۷- حافظ ابن کثیرؒ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰)

۸- امام اسحاقؒ بن راہویہؒ (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۷، تنوع العبادات ص ۸۶)

۹- امام ابوبکرؒ بن اثرمؒ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۱۰- حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱)

۱۱- امام ابو زرعہ رازیؒ (مقدمہ فتح الباری ص ۳۴۵، قسطلانی و تدریب الراوی ص ۳، و مقدمہ مسلم ص ۱۳ و ازالۃ ستر ص ۵۲)

۱۲- امام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ (مغنی جلد ۱ ص ۴۰۵)

۱۳- امام شمس الدینؒ ابن قدامہؒ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۱۳)

۱۴- امام ابن خزیمہؒ (برہان العجائب ص ۱۰۴، نفحۃ العنبر ص ۷۹)۔

۱۵- امام ابو عمرؒ بن عبد البرؒ (نفحۃ العنبر ص ۷۹)

۱۶- شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (فتاوی جلد ص ۴۱۲ و تنوع العبادات ص ۸۶)

۱۷- امام ابو عوانہ (کیونکہ باقرار مبارکپوری صاحبؒ انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی روایت متعدد اسانید سے انھوں نے صحیح میں درج کی ہے۔

۱۸- نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (عون الباری جلد ۱ ص ۳۲۳)

۱۹- علامہ ماردینیؒ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۷)

۲۰- علامہ عینیؒ (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۵۶)

۲۱- امام ابن معینؒ [۱]

---

[۱] امام مسلمؒ سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کی سند کیوں بیان نہیں کی جب کہ وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو امام موصوف نے جواب ارشاد فرمایا کہ

لیس کل شیٔ عندی صحیح وضعتہ ھاھنا انما وضعت ھاھنا ما اجمعوا علیہ۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے۔ اپنے صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے تو صرف وہ روایتیں درج کی ہیں۔ جن پر محدثین کا اجماع واقع ہوا ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

۲۲- امام عثمانؒ بن ابی شیبہؒ ۲۴- امام علیؒ بن المدینی رحؒ

۲۳- امام سعید بن منصور خراسانی رحؒ ۲۵- امام ابن صلاحؒ وغیرہ وغیرہ محدثینؒ و

فقہاءؒ اس حدیث کی تصحیح کرتے ہیں۔ جب سو فیصدی حنفی و مالکی اور حنبلی اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں اور جب شوافع اور غیر مقلدین حضرات کا ذمہ دار منصف مزاج اور معتد بہ گروہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہے؟ اور یہ بھی طے شدہ قاعدہ ہے کہ اثبات[1] نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ تو پھر نہ معلوم اس زیادت کی صحت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر محض مردم شماری سے مبارک پوری صاحبؒ میدان جیتنا چاہتے ہیں تو اس میں بھی ان کی شکست یقینی ہے۔ رہا مبارکپوری صاحبؒ کا امام ابن خزیمہؒ کو اس زیادت کی صحت کے منکرین میں شمار کرنا تو یہ باطل ہے۔ کیونکہ برہان العجائب کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے کہ امام

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) حافظ ابن صلاحؒ نے مقدمہ صفحہ ۹ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی صفحہ ۴۲ میں اور علامہ جزائریؒ نے توجیہ النظر ص ۲۴۰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ امام مسلمؒ کی مراد ما اجمعوا علیہ کے جملہ سے یہ محدث ہیں۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ، امام یحییٰؒ بن معینؒ، امام عثمانؒ بن ابی شیبہؒ، امام سعیدؒ بن منصورؒ خراسانی اور حافظ ابن حجرؒ ان میں امام علیؒ بن المدینیؒ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۳) اور امام ابن صلاحؒ فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم اپنے صحیح میں صحیح سمجھتے ہیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر میں یقینی ہے۔ (غایۃ المامول جلد ۱ ص ۶) اس لحاظ سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی اس زیادت والی روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

[1] اثبات کا نفی پر مقدم ہونا محدثین کا طے شدہ مسئلہ ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اثبات کو نفی پر ترجیح ہوتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۰)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ المثبت اولیٰ من النافی۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۹۴) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ المثبت اولیٰ من النافی (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۴۱) امیر یمانیؒ لکھتے ہیں: والاثبات مقدم (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۴۲) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اثبات مقدم است بر نفی (بدور الاہلہ ص ۳۷۹) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ من اثبت مقدم علیٰ من نفی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ص ۱۹۱) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ یہاں جرح ہی اثبات ہے۔ تصحیح اثبات نہیں ہے کیونکہ تصحیح ظاہر سند کے اعتبار سے ہے۔ اور

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

موصوفؒ اس زیادت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح امام ابن معینؒ کو بھی منکرین صحت میں شمار کرنا غلط ہے۔ کیونکہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ مسلم کی تمام مسند روایتوں کو صحیح سمجھتے تھے جن میں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت والی روایت بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں امام ابن معینؒ اور امام ابو حاتمؒ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر کلام نہیں کیا بلکہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت پر کلام کیا ہے، جس کا ذکر عنقریب ہوگا۔ (دیکھیے کتاب العلل ابن ابی حاتم جلد ۱ ص ۱۶۴ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ و بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۱۷) اس لیے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت کے انکار کرنے والوں میں ان کا شمار کرنا جہالت اور غفلت پر مبنی ہے۔

ووٹوں کی دنیا میں بھی دیکھ لیجیے کہ اس زیادت کے صحیح تسلیم کرنے والے زیادہ ہیں یا اس کے غلط قرار دینے والے: ع —— چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

پانچواں اعتراض

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اور حافظ ابو علیؒ کہتے ہیں کہ حضرت قتادہؒ کے جملہ تلامذہ میں سے سلیمان تیمیؒ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو نقل کرنے میں متفرد ہیں اور ائمہ حفاظ کی تضعیف

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تضعیف شذوذ پر مطلع ہونے کی بنا پر بس جرح ہی اثبات ہے۔ (ص ۴۲۲) محض جی بہلانے کا ایک بہانہ ہے اور ایک نرالا بہانہ ہے، اس شعبدہ بازی سے اثبات کو نفی اور نفی کو اثبات بنا دینا کون تسلیم کرتا ہے؟ تصحیح صرف ظاہر سند کے لحاظ نہیں بلکہ ٹھوس اصول کے اعتبار سے ہے اور جرح کا مفہوم یہاں یہ ہے کہ روایت صحیح نہیں اور نفی کیا ہوتی ہے؟

لہ برہان العجائب مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ (المتوفی ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء) غیر مقلد کی تالیف ہے۔

لہ امام مسلم کی ایک عبارت ملاحظہ کیجیے جس سے امام بیہقیؒ نے اصل مضمون کا حلیہ بگاڑ دیا ہے:

وفی حدیث جریرؒ عن سلیمان التیمیؒ عن قتادۃؒ من الزیادۃ واذا قرأ فانصتوا ولیس فی حدیث احد منھم فان اللہ عزوجل

جریرؒ، سلیمان تیمیؒ کے طریق سے قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بھی موجود ہے اور کسی کی روایت میں یہ مضمون نہیں ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح پر مقدم ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قال علی لسان نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم سمع اللہ لمن حمدہ الا فی روایۃ ابی کامل وحدہ عن ابی عوانۃ (مسلم جلد ص ۱۷۴)

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی زبان پر سمع اللہ لمن حمدہ کا حکم دیا ہے مگر یہ مضمون صرف ابو کاملؒ کی روایت میں ہے جس کو وہ ابو عوانہ سے روایت کرتے ہیں۔

اس عبارت کو آپ اچھی طرح دیکھ لیں اور پھر امام بیہقی رح کے اس ادعاء کی داد دیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا لیس فی حدیث احد منھم (کتاب القرأۃ ص ۸۷) واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ان میں سے کسی کی روایت میں نہیں ہے۔ امام مسلمؒ کے قول ولیس فی حدیث احد منھم کا تعلق ماقبل واذا قرأ فانصتوا سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مابعد فان اللہ قال علی لسان نبیہ کے ساتھ ہے اور یہ مضمون صرف ابو کاملؒ کی روایت میں ہے اور کسی نے اس کو نقل نہیں کیا۔ مگر امام بیہقی رح ولیس فی حدیث احد منھم کا تعلق ماقبل واذا قرأ فانصتوا کے ساتھ جوڑ کر خود غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور دوسروں کو مغالطہ دے رہے ہیں فسامحہ اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ۔

امام بیہقی رح ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ بعض علماء نے آیت کی تفسیر میں زیدؒ بن اسلمؒ کا قول نقل کیا ہے لیکن اس نے پوری عبارت نقل نہیں کی اور اس کا یہی وتیرہ ہے کہ عبارات میں سے وہ صرف اس حصہ کو نقل کر دیتا ہے جو اس کے مفید مطلب ہو سکتا ہے اور باقی عبارت چھوڑ دیتا ہے تاکہ دیکھنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ یہ ناقل کی دلیل ہے اور وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتا کہ علیم بذات الصدور اس کے اس فعل سے واقف ہے اور بسا اوقات اس کی کتاب کو پڑھنے والا اس کی تلبیس پر مطلع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کے ساتھ ایسی مغالطہ آفرینی سے محفوظ رکھے۔ (کتاب القرأۃ ص ۹۴) مگر امام بیہقی رح دوسروں کی شکایت کرتے کرتے خود اس کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ والمعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔ ؎

آپ ہی خود اپنے جور وجفا کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۸۴ میں غلط فہمی کے عنوان سے یہ بے مغز بات کہی ہے کہ امام بیہقی رح کی غلطی نہیں معترض کی غلطی ہے اور پھر آگے لکھا ہے کہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عبارت امام مسلمؒ کی ہو اور کچھ امام بیہقیؒ نے اپنی طرف سے کہہ دی ہو۔ (محصلہ) مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہئے کہ اِدھر اُدھر کی باتیں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وإنما لم يروها مسندة في صحيحه (نووی شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴) خصوصاً
جب کہ اس روایت کو امام مسلمؒ نے اپنے صحیح میں باسند پیش بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ
یہ روایت مسلم کی مسند روایتوں میں شامل نہیں ہے۔

جواب۔ یہ بات جانے دیجیے کہ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں یا
کوئی اور بھی اس کو بیان کرتا ہے؟ اور یہ بات بھی جانے دیجیے کہ حفاظ حدیث اس کی
تصحیح پر متفق ہیں یا تضعیف پر؟ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ حدیث جو حضرت ابوموسیٰ الاشعری
رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور جس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ہے۔ امام مسلمؒ کی
مسند روایتوں میں ہے یا غیر مسند میں؟ امام نوویؒ کا یہ خیال کہ یہ مسند نہیں باطل اور مردود ہے۔
حافظ ابن حجرؒ اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ وهو حديث صحيح اخرجه مسلم من حديث ابی موسیٰ
الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲ و نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۰۷) حضرت
ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ کی یہ روایت صحیح ہے اور امام مسلمؒ نے اس کی تخریج کی ہے۔
فریق ثانی اصولِ حدیث کی کتابوں کی طرف مراجعت کر کے دیکھ لے کہ محدثین کی اصطلاح میں تخریج
کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور کوئی محدث جب کسی سند کے ساتھ روایت بیان کرتا ہے اور اسی
سند کے رواۃ میں سے کسی کی زیادت کو بیان کرتا ہے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ مسند ہوتی
ہے یا غیر مسند؟

علاوہ بریں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ روایت امام مسلمؒ نے باسند پیش نہیں کی تو کیا ابوعوانہؒ
اور ابوداؤدؒ وغیرہ نے بھی اس کو مسند روایت نہیں کیا؟ اور کیا کسی حدیث کی تصحیح اس میں ہی منحصر
ہے کہ امام مسلمؒ اسے باسند نقل کریں تو صحیح ہوگی ورنہ ضعیف ہوگی؟ الغرض حضرت ابوموسیٰ الاشعری
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت امام مسلمؒ کی مسند روایتوں میں شامل ہے۔ اور امام نوویؒ کا یہ کھلا قصور ہے
کہ اس کو غیر مسند قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ عبارت ہے جس سے مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) سکتیں۔ بفضلہ تعالیٰ عربی دان کثرت سے موجود ہیں کسی ثالث عربی دان
سے دریافت کر لیں کہ غلطی امام بیہقیؒ کی ہے یا بقول مؤلف مذکور معترض کی خواہ مخواہ کا تعصب
اور جرأت نہ بن سکتی ہو اس کو بھی بنا ڈالنا علماء کی شان کے خلاف ہے۔

امرتسری کو غلط فہمی ہوئی۔ اور علی رؤس الاشہاد ان کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اس زیادت کے صحیح ہونے میں ذرا برابر شک وشبہ نہیں۔ البتہ۔ ع

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

چھٹا اعتراض:

حافظ ابن حجرؒ امیر یمانیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں۔ کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت صحیح ہے مگر اس سے مراد ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت ہے۔ یعنی جب امام اور تم (مقتدی) سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہو جاؤ تو امام قرأت کرے اور تم خاموش رہو کیونکہ واذا قرأ فانصتوا عام ہے اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سورۃ فاتحہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد۱ ص ۲۶۰، فتح الباری جلد۲ ص ۱۹۲، سبل السلام جلد۱ ص ۲۴۵)

جواب: ان حضرات کی یہ توجیہ اور تاویل قطعاً باطل ہے۔ اس لیے کہ مسلم اور ابو عوانہ وغیرہ کے حوالہ سے صحیح روایت ان الفاظ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جا چکی ہے۔

واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ فقولوا۔ آمین

کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

یہ عقدہ تو فریق ثانی ہی حل کرے گا کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے قبل وہ کون سی قرأت ہے جس میں امام کا فریضہ قرأۃ کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموش رہنا بتلایا گیا ہے؟ شاید ان کے نزدیک[۱] اس اثنا میں سورۃ یٰسین کی قرأت سنت ہو جس کی امام قرأت کرتا رہے اور اس وقت مقتدی خاموش رہیں؟ اس صحیح حدیث کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ

۱؎ مؤلف خیر الکلام لفظ قرأت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اثر اگرچہ مطلق ہے مگر قرأت بالاجماع چونکہ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اس واسطے اس اثر سے فاتحہ خلف الامام کا پڑھنا ثابت نہ ہوتا ہے۔ (صفحہ ۵۲۱) اس اعتبار سے مقتدی کو سورۃ فاتحہ کی قرأۃ کے وقت اولاً و بالذات خاموش رہنا ضروری ہے کیونکہ بالاجماع قرأت یہاں ہی سے شروع ہوتی ہے۔

اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تاویل قطعی طور پر باطل اور مردود ہے کیونکہ واذا قرأ فانصتوا کے حکم میں مقتدیوں کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرآت کی ممانعت اولاً اور بالذات ہے اور قرآن کریم کی بقیہ سورتوں کی ممانعت ثانیاً اور بالتبع ہے۔ فریق ثانی کے سطحی قسم کے لوگ عموماً یہ مطالبہ کیا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی صحیح روایت بتلاؤ جس میں سورۃ فاتحہ کی قرآت کی مقتدیوں کے لیے ممانعت آئی ہو۔ سو طلبۂ کرام کو مسلم اور ابو عوانہ کی یہ صحیح حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے اور حدیث نمبر ۳ وغیرہ ملاحظہ کریں اور اگر بالفرض اس حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نہ بھی[1] مذکور ہوتب بھی یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے نہ کہ مقتدیوں کا اس زیادت کے بغیر روایت کا مضمون یہ ہو گا۔ جب تم نماز پڑھنا چاہو تو اپنی صفیں درست کرلو۔ اور ایک تم میں سے امام بنے۔ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔ اگر مقتدیوں پر بھی سورۃ فاتحہ کی قرآت لازم ہوتی تو اذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کے بجائے اذا قلتم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ ہوتا جیسا کہ فقولوا آمین میں قولوا جمع کا صیغہ ہے حالانکہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ پڑھنے کی نسبت صرف امام کی طرف ہوتی ہے اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے۔ ہاں البتہ آمین کہنے میں مقتدی برابر کے شریک ہیں اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۶ کی ایک روایت میں اس طرح آتا ہے

کہ اذا قال القاری غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقال من خلفہ آمین الحدیث

کہ جب پڑھنے والا غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو جو اس کے پیچھے ہیں وہ آمین کہیں اس روایت میں شارع نے امام کو قاری اور پڑھنے والا کہا ہے اگر سب کے لیے قرأۃ لازم ہوتی تو صرف امام ہی قاری نہ ہوتا۔ (الدلیل المبین ص ۲۸۹) رہا حضرت عبادہؓ کی روایت کا حوالہ دینا تو اپنے مقام پر آئے گا کہ قرآت سورۃ فاتحہ برائے مقتدی کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس صحیح روایت سے اس کا تعارض قائم کرنا اور پھر اس کی تاویل اور توجیہ کرنا انصاف سے بعید تر ہے۔ ۵

---

[1] یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸، نسائی جلد ۱ ص ۱۳۲ اور طیالسی صفحہ ۳۳۶ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی، کدورتوں کی کچھ انتہا بھی
زباں رکھتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو، سوال کیا ہے؟

مؤلف خیر الکلام نے (ص ۲۲۳ و ص ۲۲۴ میں) یہ کہ کر جان چھڑانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ دونوں جملوں میں ترتیب ہے حالانکہ واو ترتیب کے لیے نہیں ہوتی جیسے مرزائی لفظ مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ میں ترتیب ثابت کرنے میں غلطی کرتے ہیں اسی طرح معترض نے بھی غلطی کی ہے اور دارقطنی جلد ا ص ۱۲۵ میں فانصتوا کا جملہ ولا الضالین کے بعد ہے مگر سند میں محمد بن یونس ہے جو ضعیف ہے۔ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس سے انصات کے محل کی تعیین ہوتی ہے (محصلہ) اور قاضی مقبول احمد صاحب نے الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۸ میں بزعم خویش قرآن وحدیث کی چند مثالیں دے کر آخر میں یہ کہا ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ واؤ ہمیشہ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی اور اس زیر بحث حدیث میں بھی ترتیب نہیں ہے تو مولانا موصوف کا طلبہ کو نصیحت کرنا محض طفل تسلی ہے اور اس فقرہ سے ما زاد علی الفاتحہ مراد لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اھ

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل بے جان ہے:

اوّلاً — اس لیے کہ اگرچہ جمہور نحاۃ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ حرف واو ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا لیکن بعض اکابر ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ اس میں ترتیب ہوتی ہے چنانچہ علم نحو کی مشہور کتاب مغنی اللبیب میں ہے کہ

وقول بعضهم ان معناها الجمع المطلق غير سديد لتقييد الجمع بقيد الاطلاق وانما هي للجمع لا بقيد وقول السيرافي ان النحويين واللغويين اجمعوا على انها لا تفيد الترتيب مردود بل قال بافادتها اياه قطربؒ والربعيؒ والفراءؒ وثعلبؒ

اور بعض کا یہ کہنا کہ حرف واؤ کا معنی جمع مطلق ہے درست نہیں ہے کیونکہ جمع کے ساتھ اطلاق کی قید لگ گئی ہے حالانکہ یہ بغیر قید کے جمع کے لیے ہے اور سیرافیؒ کا یہ کہنا کہ جملہ نحوی اور لغوی اس امر پر متفق ہیں کہ واو ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی بالکل مردود ہے کیونکہ قطربؒ، ربعیؒ، فراءؒ

وابوعمرو الزاھد وھشام والشافعي ونقل الامام في البرھان عن بعض الحنفية انها للمعية ... اھ (جلد ۲ ص ۱۳۱)

ثعلبؒ، ابو عمرو الزاہدؒ، ہشامؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ترتیب کا فائدہ دیتی ہے اور امام نے برہان میں بعض حنفیوں سے نقل کیا ہے کہ واؤ معیت کے لیے ہے۔

اور علامہ رضی لکھتے ہیں کہ

ونقل بعضھم عن الفراء والكسائي وثعلب والربعي وابن درستويه و به قال بعض الفقهاء انها للترتيب ... اھ (رضی جلد ۲ ص ۳۰۶)

بعض نے فراءؒ، کسائیؒ، ثعلبؒ، ربعیؒ اور درستویہؒ سے نقل کیا ہے اور اسی کے بعض فقہاء قائل ہیں کہ حرف واو ترتیب کے لیے ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء شافعیہ اور بعض نحویوںؒ کا یہی مذہب ہے کہ حرف واو ترتیب کو چاہتا ہے (محصلہ شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۴۲) اس سے معلوم ہوا کہ حرف واؤ کو ترتیب کے لیے ماننے والے بڑے بڑے ائمہ ہیں جن میں امام شافعیؒ وغیرہ بھی ہیں۔ لہٰذا معترض کو استدلال میں مرزائیوں سے تشبیہ دے کر اپنے دلِ ماؤف کی بھڑاس نکالنا اور حواریوں کو خوش کرنے کی بے جا سعی کرنا علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

وثانیاً — جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ حرف واو ترتیب کے لیے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ترتیب ضروری اور واجب نہیں یہ کب کہا ہے کہ ترتیب ناجائز اور حرام ہے؟ کسی سُنّی عالم نے حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی یہ روایت پیش کی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقید حیات تھے اور ہم یوں کہا کرتے تھے۔ ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ ۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۲۱۲ و قال حسن صحیح) یعنی اس ترتیب سے ہم ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے تو اس پر ایک رافضی بدحواس ہو کر بولا کہ حرف واو ترتیب کے لیے نہیں ہوتا۔ سُنّی عالم بولا کہ ترتیب ناجائز اور حرام بھی تو نہیں ہے۔

وثالثاً — حدیث زیر بحث کے تین جملے ہیں: فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين تو مؤلف خیر الکلام وغیرہ

---

[۱] اور ابن رشدؒ نے نحاۃ کوفیہ کا یہی مسلک نقل کیا ہے کہ واو میں ترتیب ہوتی ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۶)

کے ذہن کے مطابق واذا قرأ فانصتوا اور واذا قال غیر المغضوب علیھم ..... الخ جو حرف واو کے ساتھ مذکور ہیں فاذا کبر فکبروا سے پہلے بھی ہو سکتے ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ امام کے تکبیر کہنے سے پہلے ہی تم خاموش رہا کرو اور غیر المغضوب ...... الخ پڑھا کرو اس لحاظ سے ماقبل التکبیر میں بھی انصات کی صورت نکل آئی جو فریق ثانی کو بڑی مفید رہے گی اور امام بھی تکبیر سے پہلے ہی غیر المغضوب علیھم ..... الخ پڑھ لیا کرے گا اور مقتدی بھی آمین کہ لیا کریں گے کیونکہ حرف واو ترتیب کو نہیں چاہتا اس طرح انشاء اللہ تعالیٰ سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔

ورابعاً۔ دارقطنی کی روایت کے متعلق خود مؤلف خیر الکلام نے ضعیف ہونے کا اقرار کیا ہے پھر اس سے تعیین محل کا سہارا بالکل بیکار ہے انتہائی تعجب ہے کہ صحیح ابوعوانہ اور صحیح مسلم کے ثقہ راویوں کی متابعت تو مؤلف کے نزدیک کالعدم ہے مگر محمد بن یونس (جس کے بارے میں مولانا شمس الحق صاحب غیر مقلد لکھتے ہیں کہ ھو ضعیف لا یحتج بہ (تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۵) کی روایت سے تعیین محلِ انصات ضرور ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! آپ نے ملاحظہ کیا کہ فریقِ ثانی کس طرح بے جان اور بے وزن دلیلوں کا سہارا لیتا ہے۔

دوسری حدیث:

اِمام نسائیؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے جارودؒ بن معاذ ترمذیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو خالد الاحمرؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن عجلانؒ[3] سے روایت کرتے ہیں اور وہ زید بن اسلمؒ

---

[1] امام نسائیؒ (المتوفی ۳۰۳ھ) جن کی کتاب سنن نسائی صحاح ستہ میں تیسرے درجہ پر مانی جاتی ہے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۱)

[2] امام نسائی رح ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مستقیم الحدیث ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۶۴)

[3] امام وکیعؒ ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لا باس بہ اور ابو ہشام رفاعیؒ ثقہ اور امین کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں عجلیؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۸۱) علامہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابوصالحؒ[1] سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللھم ربنا ولك الحمد۔

(نسائی ج ۱ ص ۱۰۷)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدار کی جائے سو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو۔

(باقی پچھلے صفحے کے حاشیے) ذہبیؒ ان کو الحافظ الصدوق اور مشہور محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ا ص ۲۵)
[4] امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور مامون فی الحدیث کہتے ہیں۔ (ترمذی جلد ا ص ۶ و کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۷) امام بیہقیؒ ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ص ۴) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام فقیہہ اور عابد تھے۔ (تہذیب الاسماء قسم دوم جلد ا ص ۸۷) ابن عماد حنبلیؒ کا بیان ہے کہ وہ عابد پابند شریعت اور صداقت شعار تھے۔ (شذرات الذہب جلد ا ص ۲۲۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا ص ۱۵) امام احمدؒ سفیانؒ بن عیینہؒ ابن معینؒ عجلیؒ ابو حاتمؒ نسائیؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوبؒ بن شیبہؒ ان کو صدوق وسط کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجیؒ ان کو اہل صدق میں شمار کرتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو عابد ناسک اور فقیہ بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۴۴) مولانا شمس الحقؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ا ص ۱۲۴ و عون المعبود جلد ا ص ۲۳۵) اور خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تاریخ جلد ۲ ص ۳۰۴)
[5] زیدؒ بن اسلمؒ کو علامہ ذہبیؒ الامام اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۱۲۴) امام احمدؒ ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ محمدؒ بن سعدؒ، نسائیؒ، ابن خراشؒ۔ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹۶)

[1] ابو صالحؒ کا نام ذکوانؒ تھا۔ امام احمدؒ ان کو ثقہ اجل الناس اور اوثق الناس کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا ص ۸۳) امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ، ابو زرعہؒ، ابن سعدؒ، ساجیؒ اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث حربیؒ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۱۹) حضرت ابو ہریرہؓ جلیل القدر
(باقی اگلے صفحہ پر)

اس صحیح روایت[1] سے بھی معلوم ہوا کہ تمام نمازوں میں امام کا وظیفہ قرأۃ کرنا اور مقتدیوں[2] کا فریضہ خاموش رہنا ہے۔ اس حدیث پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ ملاحظہ کیجئے اور ساتھ ہی ان کے جوابات بھی دیکھ لیجئے۔

پہلا اعتراض:

حضرت امام بخاری رح[3]۔ امام بیہقی رح اور مبارکپوری رح صاحب وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کرنے میں ابو خالد الاحمر رح متفرد ہیں لہٰذا یہ زیادت قابل قبول نہیں۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶، کتاب القرأۃ ص ۹۰، ابکار المنن ص ۱۵۲ اور مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۴۳۲ اور ۴۳۴ میں اس روایت کو شاذ کہہ کر گلو خلاصی چاہی ہے اور قاضی مقبول احمد صاحب نے بھی اس کو شاذ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دی ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۱۰ کالم ۱)

جواب: اس زیادت کے رد کرنے کا یہ بہانہ محض بے کار ہے۔

(پچھلے صفحے کا باقی) صحابی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب رح اس سند کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ رجال اسنادہ ثقات۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

[1] یہ روایت ابن ماجہ ص ۶۱، ابوداؤد جلد ۱ ص ۸۹، مسند احمد ۴ ص ۴۱۵، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۴، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، جزء القرأۃ ص ۵۶، کتاب القرأۃ ص ۹۱، ابن جریر جلد ۹ ص ۱۱۰، ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۲۳، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴، عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵، درایہ ص ۹۴، زیلعی جلد ۲ ص ۱۶، مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، آثار السنن جلد ۲ ص ۸۷، ابکار المنن ص ۱۵۳، اعلاء السنن جلد ۴ ص ۵۵، دلیل الطالب ص ۲۹۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳، بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵ اور فتح الملہم ص ۲۲ وغیرہ میں مروی ہے۔

[2] نواب صدیق حسن خان صاحب رح لکھتے ہیں کہ و در حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ است واذا قرأ فانصتوا پس حظ مؤتم انصات و استماع قرأت امام است و انصات خاص بجہریہ نیست بلکہ شامل سریہ ہم است پس واجب سکوت باشد مطلقاً نزد قرأت الخ (ہدایۃ السائل ص ۱۹۳)

[3] امام بخاری رح لکھتے ہیں کہ لم یتابع علیہ مبارکپوری صاحب رح ایک سند کی تحقیق میں لکھتے (باقی اگلے صفحہ پر)

اوّلاً — اس لیے کہ جب ابو خالد الاحمرؒ بلا اختلاف ثقہ اور ثبت ہیں تو پھر ان کی زیادت کیوں قابلِ قبول نہ ہوگی؟

ثانیاً — اس زیادت کے بیان کرنے میں ابو خالد الاحمرؒ متفرد نہیں بلکہ محمدؒ بن سعد انصاری اشہلیؒ بھی اس زیادت کو نقل کرتے ہیں۔ اور اس روایت کے باقی وہی راوی ہیں جن کی توثیق عرض کر دی گئی ہے۔ البتہ محمدؒ بن عبد اللہؒ بن مبارکؒ کا ذکر نہیں ہوا۔ اور ہیں وہ بھی ثقہ، نواب صدیق حسن خانصاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابو خالدؒ از ثقاتِ اثبات است، بخاریؒ و مسلمؒ بوئے احتجاج کردہ اند۔ دریں صورت تفرد وش مضر نیست، و نیز وے نہ تنہا بایں زیادت متفرد است، بلکہ ابو سعید محمدؒ بن سعد انصاریؒ نیز تابع او بریں زیادت بودہ است۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

غرضیکہ یہ زیادت بھی سابق کی طرح بالکل صحیح ہے اور اس کے غیر صحیح ہونے کا ادنےٰ احتمال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض:

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ محمدؒ بن عجلانؒ میں کچھ کلام اور مقال ہے۔ نیز وہ مدلس ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ہیں کہ امام بخاریؒ کا محمدؒ بن عبد اللہؒ بن الحسنؒ سے متعلق لا یتابع علیہ کہنا ہرگز مضر نہیں کیونکہ محمدؒ مذکور ثقہ تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۳۱) کیا ہم بھی مبارک پوری صاحب سے اس انصاف کی امید رکھ سکتے ہیں۔

لہ یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۷، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۴، عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵، نصب الرایہ جلد ۲ صہ ۱۶ اور تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴ وغیرہ میں مذکور ہے۔

لہ امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ صہ ۱۰۱) دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ صہ ۱۲۵) زیلعیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (جلد ۲ صہ ۱۶) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ صہ ۲۵۴) مولانا شمس الحقؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (عون المعبود جلد ۱ صہ ۲۳۵ و تعلیق المغنی جلد ۱ صہ ۱۲۴)

سہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص ۳۲۷) الحاصل اس روایت کے بھی جملہ راوی ثقہ ہیں۔ اور اصول حدیث کی رو سے یہ روایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (ابکار المنن ص۱۵۲)

جواب۔ مبارک پوری صاحبؒ ان میں مقال کا شاید مطلب ہی نہیں سمجھے۔ رہی ان کی تدلیس تو وہ بھی مفروغ عنہ ہے۔

اوّلاً ۔۔۔ بقول بعض یہ مکحولؒ کے درجہ کے مدلس تھے۔ مگر فریقِ ثانی مکحولؒ کی تدلیس سے صرفِ نظر کر جاتا ہے۔[۱]

ثانیاً ۔۔۔ اگر ان کی تدلیس مضر ہوتی تو امام بخاریؒ اور ابو داؤدؒ وغیرہ ضرور اس کا تذکرہ کرتے مگر وہ صرف ابو خالدؒ الاحمر کے تفرد کی شکایت کرتے ہیں۔

ثالثاً ۔۔۔ دیگر محدثینؒ کو عموماً اور علامہ ذہبیؒ کو خصوصاً یہ قاعدہ معلوم ہے لیکن وہ محمدؒ بن عجلانؒ کی متعدد معنعن حدیثوں اور روایتوں کو صحیح کہتے ہوئے تصحیح کرتے ہیں۔ (مثلاً تلخیص مستدرک جلد ۱ ص۲۲ وغیرہ)

رابعاً ۔۔۔ محدثینؒ اور محققینؒ کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ محمدؒ بن عجلانؒ، قتادہؒ، سفیانؒ ثوری اور حسن بصریؒ وغیرہ کی طرح ان مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔

خامساً ۔۔۔ محمدؒ بن عجلانؒ کے دو متابع بھی موجود ہیں۔ خارجہؒ بن مصعبؒ اور یحییٰؒ بن علاءؒ (دیکھیے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۵۱) اور گو یہ کمزور اور ضعیف ہیں لیکن متابعت میں پیش کرنے پر مبارک پوری صاحبؒ کو بھی کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔[۲]

---

[۱] بعض لوگوں نے ان میں یہ کلام کیا ہے کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ان سے احتجاج نہیں کیا۔ لیکن یہ اعتراض باطل ہے۔ اوّلاً۔ اس لیے کہ ثقہ اور ثبت راوی کے لیے یہ شرط نہیں کہ ان سے امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ضرور احتجاج کیا ہو۔ ثانیاً۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (مستدرک جلد ۱ ص۲۲، بذل المجہود جلد ۲ ص۵۵ اور مسلم جلد ۲ ص۳۱ وغیرہ ملاحظہ کر لیجیے) محمدؒ بن عجلانؒ بطریق سعید مقبریؒ عن ابی ہریرہؓ کی بعض روایتوں پر کچھ کلام کیا گیا ہے (کتاب العلل ترمذی جلد ۲ ص۲۳۰ و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۳۴۱) لیکن وہ بھی صرف چند روایتیں ہیں اور علامہ ذہبیؒ نے ان کا جواب بھی دے دیا ہے (میزان جلد ۳ ص۱۰۲) مگر ہم نے جو سند پیش کی ہے وہ سعید مقبریؒ کے طریق سے نہیں بلکہ زیدؒ بن اسلمؒ کے طریق سے ہے۔

[۲] دیکھئے ابکار المنن ص ۱۳۱/۱۲۹ اور دیگر محدثینؒ بھی اس قاعدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سادسًا — جرح کرنے والے جرح پر بھی متفق نہیں ہیں۔ بعض ابو خالدؒ کا تفرد بتاتے ہیں اور بعض محمد بن عجلانؒ کی تدلیس اس سے بھی جرح کمزور ہو جاتی ہے۔ (اعلاء السنن جلد ۴ ص ۵۹)

سابعًا — اگر محمدؒ بن عجلانؒ میں واقعی کوئی کلام ہوتا۔ یا ان کی تدلیس مضر ہوتی تو حضرات محدثین کرامؒ کی ایک بہت بڑی جماعت اس حدیث کی ہرگز تصحیح نہ کرتی، حالانکہ اس حدیث کی ذیل کے ائمہ حدیث تصحیح کرتے ہیں:

۱۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۷) ۲۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (جلد ۱ ص ۱۷۴)

۳۔ علامہ ابن حزمؒ (محلی جلد ۳ ص ۲۴۰) ۴۔ امام نسائیؒ " (جلد ۱ ص ۱۰۷)

۵۔ دارقطنیؒ (جلد ۱ ص ۱۲۴) ۶۔ ابن جریرؒ " (تفسیر جلد ۹ ص ۱۱۱)

۷۔ حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبر (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۰۱) ۸۔ حافظ ابن کثیرؒ (تفسیر جلد ص ۶۲۳)

۹۔ علامہ ماردینیؒ (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۷) ۱۰۔ امام منذریؒ (زیلعی جلد ۲ ص ۱۶ و تعلیق المغنی

۱۱۔ علامہ جمال الدینؒ (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۶) جلد ۱ ص ۱۲۴)

۱۲۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ (عون المعبود ۱۳۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ

جلد ۱ ص ۲۳۵، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴) (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

بلکہ نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

وھذا الحدیث مما ثبت عند اھل السنن وصححه جماعة من الائمة۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

یہ حدیث ارباب سنن کے نزدیک ثابت اور محقق ہو چکی ہے اور ائمہ حدیث کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا حوالہ باب اوّل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ بڑی شد و مد سے واذا قرأ فانصتوا کی روایت اور اس میں زیادت کو صحیح ثابت کرتے ہیں، علامہ ابن حزم رحؒ

(بقیہ پچھلا صفحہ) ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳ و مقدمہ نووی ص ۱۶ و کتاب القرأۃ ص ۱۲۹ و تدریب الراوی ص ۸، اور اعلاء السنن ص ۲۴، اور لکھا ہے وھذا مجمع بین المحدثین مگر یہ یاد رکھیے کہ اصل راوی صرف مدلس ہو ضعیف اور کمزور نہ ہو۔ ورنہ متابعت بے سود ہوگی۔

لکھتے ہیں کہ بعض کا خیال ہے کہ اس زیادت میں محمدؒ بن عجلانؒ نے خطا کی ہے۔ مگر ہم ثقہ راوی کے بارے میں کسی واضح برہان کے بغیر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بہر حال سند کے لحاظ سے یہ زیادت بالکل صحیح ہے (محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۲۴۲) انصاف سے فرمایئے کہ کسی حدیث کی تصحیح کے لیے اس سے بڑھ کر حضرات محدثین کرامؒ کے پاس اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ مگر ؎

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور ہے کیا آفتاب کا۔

الحاصل حضرات ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت بھی اور اس کی پوری سند بالکل صحیح اور بے غبار ہے اور محض تعصب کی وجہ سے اس کو شاذ کہکر رد کرنا بے سود ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ[2] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے جعفر خلدیؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسنؒ بن علیؒ بن شبیب المعمریؒ[4]

---

[1] امام بیہقیؒ کا ترجمہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[2] حافظ ابو عبد اللہ الحاکمؒ صاحب مستدرک کا ترجمہ بھی باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[3] جعفرؒ بن محمدؒ بن نصیر الخلدیؒ، علامہ خطیبؒ ان کو ثقہ، صادق، دیندار اور فاضل لکھتے ہیں (تاریخ خطیب جلد ۷، ص ۲۲۷)

[4] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العلامہ اور البارع لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اور فہم سے بہرہ ور تھے۔ امام دارقطنیؒ ان کو صدوق اور حافظ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۵) ابن عدیؒ ان کو کثیر الحدیث اور امام ربانی کہتے ہیں۔ (ایضاً) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ تمام محدثین ان کے عادل ضابطہ اور صاحب فضیلت ہونے پر متفق ہو چکے ہیں۔ موسیٰؒ بن ہارونؒ کا بیان ہے۔ کہ وہ اوثق الناس اور اثبت الناس تھے اور ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ محدث عبدان اہوازیؒ کا بیان ہے۔ کہ میں نے معمریؒ جیسا محدث تمام روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۱ تا ۲۲۵ اور علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے فہم و حفظ سے متصف تھے۔ ان کی احادیث میں کچھ

نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد[۱] بن مقدامؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے طفاوی[۲]ؒ
نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ایوب[۳]ؒ نے بیان کیا۔ وہ زہریؒ[۴] سے روایت کرتے
ہیں اور وہ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قرأ الامام فانصتوا۔ (کتاب القراۃ ص۹۲) کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام قراۃ کرے تو تم خاموش رہو۔

اِس روایت میں بھی مقتدی کا وظیفہ (تمام نمازوں میں) خاموشی اور امام کا فریضہ قراۃ بتلائی گئی ہے اور اگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جاتے تو اس روایت پر بھی کوئی معقول اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ گو امام بیہقیؒ نے یہ فرمایا ہے کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بیان کرنے میں المعمریؒ متفرد ہیں۔ لیکن جب معمریؒ ثقہ ثبت اور الحافظ اور الامام ہیں تو ان کی یہ صحیح روایت اور زیادتِ بیان کس طرح رد کی جا سکتی ہے؟ معمریؒ کے طریق سے ایک روایت کی امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ دونوں علیٰ شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں (مستدرک جلد ۱ ص ۳۵۸) مؤلف خیر الکلام نے صد ۴۳۵ اور ۴۳۶ میں یہ لکھا ہے کہ معمریؒ

(بقیہ پچھلا صفحہ) غرائب اور افراد بھی تھے۔ دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور حافظ تھے، ان پر جرح موسیٰؒ بن ہارونؒ نے از روئے عداوت کی ہے۔ (بغدادی جلد ۷ ص ۳۷۰)

[۱] امام ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور صداقت شعار کہتے ہیں۔ محدث صالح جزرہؒ، مسلمہؒ بن قاسم ابن عبد البرؒ اور دیگر محدثین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خزیمہؒ ان کو دانا محدث کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ اور ابن عدیؒ صدوق کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۸۱) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الاثبات المسندین لکھتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ صد ۴۲)

[۲] علامہ ذہبیؒ ان کو مشہور محدث اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۳ صد ۸۹) امام ابن معینؒ ان کو لیس بہ بأس اور ابن مدینیؒ ثقہ کہتے ہیں اور ابو داؤدؒ اور ابو حاتمؒ لیس بہ بأس سے ان کی توثیق کرتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں دارقطنیؒ کا بیان ہے کہ بخاریؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ تمام متقدمین ان کی ثقاہت پر متفق ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۰۹)

[۳] امام احمدؒ ابن معینؒ، ابو زرعہؒ، نسائیؒ، ابن سعدؒ، دارقطنیؒ اور ابو داؤدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ (باقی اگلے صفحہ پر)

صاحبِ غرائب و افراد ہیں اور بعض محدثین نے ان کو کذاب کہا ہے۔ عبدانؒ کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ حسد سے کہا ہے اور بغدادیوں کی طرح یہ بھی موقوف کو مرفوع کر دیا کرتا تھا اور حدیث میں اضافے کرنے کی ان کی عادت تھی۔ (محصلہ خیر الکلام بحوالہ لسان المیزان)

الجواب: بخاری اور مسلم میں ایسے متعدد راوی موجود ہیں۔ مؤلف خیر الکلام کا شوق ہو تو ہم ماشاء اللہ تعالیٰ باحوالہ عرض کر سکتے ہیں اس لیے صاحبِ غرائب وافراد ہونا اصولِ حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے محض عداوت اور دشمنی کی وجہ سے ان پر جرح کی ہے اور کبھی یہ کہا کہ یہ موقوف کو مرفوع کر دیتے ہیں اور کبھی یہ کہا کہ یہ اضافے کرتے ہیں اور ان کے بڑے دشمن اور معاند موسیٰؒ بن ہارونؒ نے ان کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر بھی انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۴) اور ان کی تقلید کرتے ہوئے لوگ اس پر جرح کرتے اور اس زیادت کو انکار کرتے ہیں جب محدثینؒ کے سامنے حقیقت حال کھل گئی تو انھوں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

فاستقر الحال آخراً علیٰ توثیقہ فان غایۃ ماقیل فیہ انہ حدث باحادیث لم یتابع علیھا وقد علمت من کلام الدارقطنیؒ انہ رجع عنھا فان کان قد اخطأ فیھا کما قال خصمہٗ فقد رجع عنھا وان کان مصیبا بھا کما کان یدعی فذاک ارفع لہ واللہ اعلم۔
(لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۵)

پس آخر میں بات ان کی توثیق پر پکی ہوئی ہے زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں جو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں پائی گئی لیکن تم امام دارقطنیؒ کے کلام سے معلوم کر چکے ہو کہ انھوں نے رجوع کر لیا تھا سو اگر واقعی انھوں نے ان احادیث میں خطا کی تھی جیسا کہ ان کا خصم کہ رہا ہے تو اس سے ان کا رجوع ثابت ہے اور اگر وہ مصیب تھے جیسا کہ ان کا دعویٰ تھا تو یہ ان کی شان کو اور اونچا کرنے کا سبب ہے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) ان کو صالح الحدیث اور ابن عبد البرؒ ثقہ اور حافظ کہتے تھے۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۲)

ؔ ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ معمرؒ ثقہ ہیں اور ثبت بھی۔ اور ان کی یہ زیادت جو واذا قرأ فانصتوا سے وارد ہوئی ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ دوسری اسانید میں ثقہ راویوں سے بھی یہ مروی ہے اور قرآت خلف الامام انصات کے بالکل خلاف ہے اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں باب سوم میں آئیں گی کہ وہ بھی امام کے پیچھے سب یا بعض نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے اور شاذ مقبول کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مستقل حدیث ہو جس کو ثقہ راوی بیان اور روایت کرتا ہو انصاف کی دنیا میں اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور کسی حافظ کی قرآنِ کریم میں غلطی سے کوئی جملہ بڑھا دینا یہ شاذ مردود کی مثال ہے اس کو مؤلف خیر الکلام اپنے پاس ہی رکھیں۔ بات ثقہ راویوں کی زیادت کی ہو رہی ہے۔ الغرض واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح ہے ایک رتی شک اس کی صحت میں نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی آیت میں فاستمعوا وانصتوا کا حکم تھا اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی صحیح اور مرفوع روایتوں میں بھی اس کی تصریح ہے کہ واذا قرأ الامام فانصتوا اور ایک ایک سند کا صحیح ہونا بھی آپ معلوم کر آئے ہیں۔ اب ان کے حجت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وحدیث صحیح حجت است برامت در رنگ حجیت کتاب عزیز۔ (دلیل الطالب صفحہ ۸۸۰) اور لکھتے ہیں کہ اصل در امر[1] وجوب فعل مامور بہ است۔

(بدور الاہلہ ص ۲۲)

اور نیز تحریر فرماتے ہیں کہ امر بشیئ نہی است از اضداد او۔ (بدور الاہلہ ص ۳۴۸) الغرض مقتدی کے لیے استماع اور انصات کے وجوب کا حکم اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کے ممنوع اور منہی عنہ ہونے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھیے فریق ثانی

---

[1] ارباب اصول کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ امر مطلق کا مفاد وجوب ہے، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: "وامرہ المطلق علی الایجاب"۔ (القواعد النورانیۃ الفقہیہ، طبع مصر ص ۵۲، لشیخ الاسلام) یعنی صاحبِ شرع کا امر مطلق وجوب پر محمول ہوتا ہے، شیخ الاسلام ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: "وظاہر الامر الوجوب"۔ (احکام الاحکام جلد ۱ ص ۱۵۳) امر ظاہری طور پر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صیغۂ امر بے صارف محمول بر وجوب است۔

(افادۃ الشیوخ ص ۱۰۶)

مانتا ہے یا نہیں۔ کہیں وہ یہ نہ ارشاد فرمادے کہ ؎

یہ سب شوچ کر دل لگا یا ہے ناصح!

نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں۔

قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت ابو ہریرۃ رضؓ و حضرت انس رضؓ بن مالک کی پیش کردہ صحیح روایتیں اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے سرّی اور جہری سب نمازوں کو شامل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے اقتداء کر لینے کے بعد مقتدی کو سوائے استماع، انصات اور خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب بعض ایسی روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں خاص طور پر جہری نمازوں میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی سخت تنبیہ اور ممانعت آئی ہے۔ اور بعض روایتیں وہ بھی ہیں جن میں جہری نمازوں کی کوئی قید مذکور نہیں ہے بلکہ وہ سب نمازوں کو شامل ہیں۔

چوتھی حدیث۔ حضرت امام مالک رحؒ، امام ابن شہاب زہری رحؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن اُکیمہ لیثی رحؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ل؎ حضرت امام مالکؒ اور امام ابن شہاب زہری رحؒ دونوں کا ترجمہ مقدمہ .... میں نقل کیا جا چکا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضؓ صحابی ہیں۔ ابن اُکیمہ لیثی رحؒ کا نام عمارہ تھا۔ امام ابو حاتم رحؒ اور یحییٰ بن سعید رحؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام یعقوب رحؒ بن سفیان رحؒ ان کا مشہور تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن حبان رحؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۱۱) امام بیہقی رحؒ فرماتے ہیں کہ ابن اُکیمہ رحؒ اور ان کے بھائی دونوں ثقہ ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸ و مرقات جلد ۱ ص ۵۴۲) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحؒ لکھتے ہیں کہ ابو حاتم رازی رحؒ ان کو صحیح الحدیث اور حدیثہ مقبول لکھتے ہیں۔ ابو حاتم بستی رحؒ کا بیان ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمر رحؒ بن مسلم رحؒ، امام زہری رحؒ اور سعید بن ابی ہلال رحؒ نے روایت کی ہے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵) حافظ ابن حجر رحؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (تقریب ۲۷۶) مبارکپوری صاحب رحؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور اوساط تابعین رحؒ میں تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی یہ شرط نہیں کہ اس سے روایت کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصرف من صلوٰۃ جہر فیھا بالقرأۃ فقال ھل قرأ معی منکم احد آنفا فقال رجل نعم انا یا رسول اللہ قال فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی اقول مالی انازع القرآن فانتھی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک جہری نماز سے فارغ ہوئے اور یہ ارشاد فرمایا۔ کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ ایک شخص بولا۔ جی ہاں یا رسول اللہ! میں نے قرأت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جبھی تو میں (اپنے دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم کی قرأت میں منازعت اور ہاتھا پائی کیوں ہو رہی ہے؟ اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے

(بقیہ پچھلا صفحہ) جیسے ابن اُکیمہ لیثی رحمۃ اللہ علیہ ثقہ ہیں۔ حالانکہ امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی۔ (ابکار المنن ص ۹۱) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ ابن اُکیمہ کی توثیق کے لیے یہی ایک دلیل کافی ہے کہ امام زُہری جیسے جلیل القدر امام ان سے روایت کرتے ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸) حافظ ابن کثیرؒ اس حدیث کی امام ترمذیؒ اور ابوحاتم سے تحسین اور تصحیح نقل کرتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ۳ ص ۲۲۳) مولانا میر صاحبؒ ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ یہ موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مسند روایت ہے جس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہٖ تفسیر واضح البیان ص ۴۲۰)

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ نے جو یہ کہا ہے کہ ابن اُکیمہ لیثیؒ ثقہ ہیں۔ مگر امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی تو یہ ان کا وہم ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کا حوالہ پہلے نقل ہو چکا ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمرؒ بن مسلمؒ (ان کی روایت صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۶۰ میں ہے ملاحظہ کیجیے) امام زہریؒ اور سعیدؒ بن ابی ہلالؒ نے روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں ان سے ایک چوتھے راوی بھی ہیں۔ چنانچہ مستدرک جلد ۳ ص ۴۴۸ میں ہے عن ابی الحویرث عن عمارۃ بن اُکیمۃ اللیثیؒ..... الخ ابوالحویرث کا نام عبدالرحمٰنؒ بن معاویہؒ تھا۔ ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۱۱۸) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۲۷۲) لہٰذا علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ کی رائے صحیح نہیں ہے۔ ع خذ ما تراہ ودع شیئًا سمعت بہ۔

وسلم فیما جھر فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالقرأۃ حین سمعوا ذلک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (موطا امام مالک ص ۲۹، ۳۰)

قرأت کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت ترک کر دی تھی۔

یہ روایت موطا امام مالک کے علاوہ حدیث کی دیگر معتبر[1] اور مستند کتابوں میں مذکور ہے جس کے صحیح ہونے میں قطعاً کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت میں یہ روایت قطعی ہے۔

یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷ و ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰ وغیرہ) جس میں تقریباً تمام حضرات صحابہ کرامؓ موجود ہوں گے، مگر ان میں آپ کے پیچھے قرأت کرنے والا صرف ایک شخص تھا اور آپ نے ان دیگر حضرات کو کچھ بھی نہیں کہا جنھوں نے قرأت نہیں کی تھی بلکہ اسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی جس نے قرأت کی تھی اور حضرات صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ حضرت آپ نے تو قرأت کرنے کا خود حکم دیا ہے۔ پھر کیا ممانعت کا کوئی جدید حکم آیا ہے؟ اور محال ہے کہ آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیا ہو اور اس پر عمل کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہو اور آپ نے قیام رکوع، سجود اور قعدہ وغیرہ کو نیز تسبیح، تحمید اور تشہد کو ناگوار نہیں فرمایا۔ اگر ناگوار گزری ہے تو صرف مقتدی کی قرأت، جہری نمازوں میں اس سے بڑھ کر امام کے پیچھے قرأت کے منع ہونے کا اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟ مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۳۷ میں) یہ کہنا کہ اگرچہ حدیث میں لفظ مطلق قرأت ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت سے باز آ گئے مگر قرائن کی

---

[1] یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، ترمذی جلد ۱ ص ۴۲، ابن ماجہ ص ۶۱، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۰۱، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، جزء القرأۃ ص ۵۵، ۲۲، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷، کتاب القرأۃ ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۱۹۷، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸، ابن کثیر جلد ۳ ص ۶۲۳، مرقات جلد ۱ ص ۵۳۴، فتاویٰ ابن تیمیہ ۲ ص ۱۴۹، عقیدۃ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۹، فتح الملہم ۲ ص ۲۳، بذل المجہود ۲ ص ۵۷، تحقیق الکلام ۲ ص ۱۲۵، ابکار المنن ص ۱۵۵، فصل الخطاب ص ۳۳، اور اعلاء السنن جلد ۴ ص ۸۷ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے۔

بناپر مطلق کی تقیید ہو سکتی ہے الخ بالکل ایک بے وقعت بات اور مطلب پرستی کے لیے صرف ایک بہانہ ہے جس کو ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے اور یہی بے سود بہانہ قاضی مقبول احمد صاحب نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص۱) اور انھوں نے اس مطلق قرأت کو مازاد علی الفاتحہ پر محمول کر کے بالکل ایک اور غیر معقول بات کہی ہے جو طفل تسلی سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امام ابوبکر الرازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت جہر اور سر دونوں پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا۔ ہاں البتہ راوی نے اس کی تاویل یہ کی اور وہ یہ سمجھے کہ یہ جہر سے متعلق ہے۔ (محصلہ احکام القرآن جلد ۳ ص۱۵)

فریق ثانی کی طرف سے اس روایت پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کو ان کے جوابات کے ساتھ ملاحظہ کریں:

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ، علامہ حازمیؒ، علامہ ابن حزمؒ، امام نوویؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ ابن اکیمہ لیثی مجہول ہے۔ بنابریں یہ روایت قابل التفات نہیں۔ (سنن الکبریٰ ج۲ ص ۱۵۹، کتاب القرآۃ ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۹۸، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، شرح مہذب جلد ۳ ص ۳۶۸ و ابکار المنن ص ۱۵۵ وغیرہ)

جواب: ان اکابر کا یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ اوّلاً پوری تشریح کے ساتھ ابن اکیمہؒ کی توثیق نقل کی جا چکی ہے۔ اور باقرار میر صاحبؒ و مبارکپوری صاحبؒ موطا کی مسند روایت پر کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابن اکیمہؒ ثقہ تھے۔ پھر بھی اعتراض کیے جانا انصاف سے بالکل منافی ہے۔

ثانیاً حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ ہے کہ اگر کسی راوی کی دیگر محدثینؒ توثیق کریں (بلکہ اس سے روایت کرنے والا بھی اگر وہ اہل توثیق سے ہو خود توثیق کر دے) تو اس پر جہالت کا الزام نہیں رہتا۔ وہ ثقہ اور عادل راویوں کی صف میں آجاتا ہے۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۷۰ و غنیۃ الالمعی ص ۵۲، ۳، مولانا شمس الحقؒ المنضم مع معجم الصغیر للطبرانیؒ) اور ابن اکیمہؒ کو دیگر محدثینؒ بھی ثقہ کہتے ہیں۔ اور امام زہریؒ (جن کا اہل توثیق میں پایہ بہت بلند تھا) بھی توثیق کرتے ہیں۔ اور چار راوی ان سے فن حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ اندریں حالات ان کو مجہول کہتے جانا انصاف کا خون کرنا ہے۔

ثالثاً۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر جہالت کا الزام ہو اور امام ابن

حبانؒ اس کی توثیق کر دیں۔ تو جہالت کا الزام رفع ہو جاتا ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۳۱) اور ابن اکیمہؒ کو ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ غرضیکہ کسی راوی سے متعلق ثقہ، ثبت اور عادل ہونے کے جتنے قواعد محدثین کرامؒ کے نزدیک ثابت ہیں۔ وہ تمام ابن اکیمہؒ میں پائے جاتے ہیں۔ اور جہالت سے نکلنے کا کوئی ضابطہ ایسا نہیں جو ان میں نہ پایا جاتا ہو۔ پھر فریق ثانی ہی انصاف سے فرما دے کہ ابن اکیمہؒ نے وہ کون سا جرم کیا ہے کہ ان کے لیے جہالت کے چکر سے نکلنے کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ توثیق کا نام ہی جہالت ہے۔ ع

نام ان کا رکھ لیا ہے آسماں تحریریں

الحاصل فن حدیث کے لحاظ سے اس حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے میں مطلقاً کوئی کلام نہیں ہے۔ رہا اس حدیث کا حضرت ابو ہریرہؓ کے موقوف اثر (اقرأ بها فی نفسک) سے معارضہ کرنا تو اس کی بحث اپنے مقام پر آ جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

دوسرا اعتراض ۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، مولانا ابو عبد الرحمٰن محمد عبد اللہؒ اور مبارکپوریؒ صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ فانتھی الناس عن القرأۃ حین سمعوا ذلک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان نہیں کیا بلکہ یہ حضرت امام زہریؒ کا بیان ہے۔ اور امام زہریؒ کی عادت تھی کہ مرفوع حدیث میں اپنا قول ملا دیا کرتے تھے۔ اور اس دعویٰ کی دو دلیلیں ہیں۔ **اوّل** ۔ امام لیث بن سعدؒ اور ابن جریجؒ فانتھی الناس الخ کا ٹکڑا اپنی روایت میں بیان نہیں کرتے۔ **دوم** ۔ امام اوزاعیؒ، امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ

قال الزهری فاتعظ الناس فلم یکونوا یقرأون۔ (جزء القرأۃ ص ۲۳، ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸)	امام زہریؒ نے فرمایا کہ اس قول سے لوگوں نے نصیحت حاصل کر لی اور امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ جملہ امام زہریؒ کا مدرج ہے اور یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ نے یہ بات تو اچھی طرح محفوظ رکھی ہے (کہ فانتھی الناس الخ امام زہری کا مدرج ہے، مگر شومئی قسمت کہ) الا وانه لم یحفظ اسنادہ۔ لیکن وہ اس کی سند محفوظ نہیں .... رکھ سکے۔

(جزء القرأة ص ۲۳، کتاب القرأة ص ۶۹ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸، شرح مہذب ص ۳۷۰، عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۰ وغیرہ واللفظ للبیہقیؒ)

جواب - اِن حضرات کا یہ کہنا کہ یہ قول امام زہریؒ کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تابعینؒ نے امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی تھی..... محض دفع الوقتی پر مبنی ہے اور اصول کے لحاظ سے یہ غلط ہے۔

اوّلاً - اس لیے کہ امام بیہقیؒ کا بیان ہے کہ جو جملہ حدیث مرفوع کے ساتھ بیان ہو وہ مرفوع ہی ہوگا۔ اِلّا یہ کہ اس کے مدرج ہونے پر قاطع دلیل قائم ہو۔ (تلخیص الجبیر ص ۱۲۶) اور کمزور سند اور محض احتمال سے ادراج ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ محض احتمال سے ادراج ثابت نہیں ہو سکتا۔ (فتح الباری جلد ۱۱ ص ۴۲۵) اور اس کے مدرج ہونے کی کوئی عقلی اور نقلی صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔

ثانیاً - امام بیہقیؒ[1]، علامہ حازمیؒ[2]، حافظ ابن حجرؒ[3] اور امام نوویؒ[4] لکھتے ہیں۔ واللفظ لہ۔

وبیّنا انّ الصحیح بل الصواب الذی علیہ الفقہاء والاصولیون ومحققوا المحدثون انہ اذا روی الحدیث مرفوعًا وموقوفًا او موصولًا ومرسلًا حکم بالرفع والوصل لانہا زیادۃ ثقۃ وسواء کان الرافع والواصل اکثر او اقل فی الحفظ والعدد۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶)

ہم بیان کر آئے ہیں کہ صحیح بلکہ خالص حق بات یہ ہے جس پر فقہاء، علماءِ اصول اور محقق محدثین متفق ہیں کہ جب کوئی حدیث مرفوع اور موقوف روایت کی گئی ہو۔ یا موصول اور مرسل بیان ہوئی ہو تو اس صورت میں حدیث مرفوع اور متصل ہی سمجھی جائے گی چاہے رفع اور وصل کرنے والے حفظ اور عدد میں زیادہ ہوں یا کم حدیث بہر حال مرفوع ہو گی۔

علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی ثقہ راوی سے معاً دو مسئلوں میں اختلاف پیدا ہو کہ

---

[1] کتاب القرأۃ ص ۴۶

[2] کتاب الاعتبار ص ۱۲

[3] تلخیص الجبیر ص ۱۲۶

[4] شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶ - اور امام نوویؒ نے جلد ۱ ص ۲۸۲ و جلد ۱ ص ۲۷۴ و جلد ۲ ص ۴۰ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور جلد ۱ ص ۲۸۲ میں حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا خاص طور پر نام ذکر کیا ہے۔

کسی وقت وہ موصول بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا کسی وقت وہ مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت موقوف۔ تو صحیح قول کی بنا پر اس کے موصول اور مرفوع ہونے کا حکم کیا جائے گا نہ کہ مرسل اور موقوف ہونے کا۔ (شرح الفیہ جلد۱ ص ۸۳)

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ اذا کان الواصل ثقۃ فھو مقبول۔ (دلیل الطالب ص۲۷)

اور نیز فرماتے ہیں کہ

اختلافے کہ در رفع ووقف اوست قادح در حجیت نہ باشد چہ رفع زیادت است

(ایضاً ص۱۴۴)

اور نیز لکھتے ہیں کہ قال شیخنا و برکتنا الشوکانیؒ وھو الحسن اذا جاءت الزیادۃ من طریق الثقۃ۔ (ایضاص ۴۶۱) امام زہریؒ کی ثقاہت اور عدالت بھی بالاتفاق مسلم ہے۔ اس لیے اس طے شدہ قاعدہ کے رو سے یہ جملہ بھی مرفوع ہی ہوگا۔

ثالثاً۔ امام ابوداؤدؒ، ابن ابی السرحؒ[۱] سے روایت کرتے ہیں وہ معمرؒ[۲] سے اور وہ امام زہریؒ سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال ابوھریرۃؓ فانتھی الناس۔ (ابوداؤد جلد۱ ص ۱۲۰)

کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ لوگوں نے قرأت ترک کردی تھی۔

---

[۱] ابن ابی السرحؒ کا نام احمد بن عمروؒ بن عبداللہؒ بن عمروؒ بن السرح تھا۔ محدث علیؒ بن الحسنؒ بن خلفؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ ثبت اور صالح تھے۔ ابوزرعہؒ اور ابوحاتمؒ لا بأس بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن یونسؒ ان کو فقیہ اور من الصالحین الاثبات کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد۱ ص ۶۴) جب یہ ثقہ اور ثبت ہیں تو امام ابوداؤدؒ کے باقی چار اساتذہ اگر اس کو نقل نہیں کرتے تو نہ کریں زیادت ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام کا یہ عذر لنگ بھی قابل سماعت نہیں ہے اور اسی طرح لیث بن سعد وغیرہ کا اس جملہ کو نکال دینا اور امام زہریؒ کا سانس پھولنے یا کھانسی وغیرہ کی وجہ سے اس کو آہستہ پڑھنا بھی ہرگز ادراج کی دلیل نہیں ہے۔

[۲] معمرؒ بن راشد کو علامہ ذہبیؒ الامام الحجۃ احد الاعلام اور عالم یمن لکھتے ہیں (تذکرہ جلد۱ ص ۱۷۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۶۰) امام احمدؒ بن حنبلؒ سے سوال کیا گیا کہ امام

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس صحیح روایت سے معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے۔ نہ یہ کہ امام زہریؒ کا مدرج ہے۔ جب معمرؒ کا اثبت الناس فی الزہریؒ ہونا محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے۔ تو امام لیثؒ بن سعدؒ اور ابن جریجؒ کا اس جملہ کو نہ نقل کرنا اس کے مدرج ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس میں صحیح اور صواب بات معمرؒ ہی کی ہو گی خصوصاً جبکہ وہ مثبت بھی ہیں۔

رابعاً۔ گو امام اوزاعیؒ بہت بڑے محدث فقیہ اور امام تھے۔ لیکن کتب الرجال میں اس کی تصریح موجود ہے کہ امام زہریؒ سے جو روایت وہ کرتے ہیں وہ حجت نہیں ہو سکتی حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کی امام زہریؒ اور یحیٰیؒ بن ابی کثیرؒ سے جملہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔ (کتاب الانصاف ص ۲۰۱ و کتاب العلم ص ۲۰۱) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ اوزاعیؒ فی الزہری لیس بذاك (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۴۱) کہ امام اوزاعیؒ زہریؒ سے روایت کرنے میں قابل اعتبار نہیں ہیں۔ امام یعقوبؒ بن شیبہؒ کا بیان ہے کہ امام اوزاعیؒ ثقہ اور ثبت تھے۔ لیکن انکی زہریؒ سے جملہ روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ (ایضاً) یہ راوی ضعیف نسبتاً نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴۰ میں لکھا ہے۔ اور دھوکہ دیا ہے بلکہ یہ محدثینؒ کی تصریح کے مطابق زہریؒ کی روایت میں حقیقتہً ضعیف ہے۔ انصاف شرط ہے کہ امام معمرؒ کی روایت کو (جو اثبت الناس فی الزہریؒ ہیں) چھوڑ کر امام اوزاعیؒ کی روایت کو (جن کی زہریؒ

(بقیہ پچھلا صفحہ) زہریؒ کے تلامذہ میں سے زیادہ ثبت کون ہے؟ فرمایا معمرؒ اثبت الناس فی الزہریؒ۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۵) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ معمرؒ اثبت الناس فی الزہریؒ۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۹) لہٰذا زہریؒ کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند روایت صرف معمرؒ بن راشدؒ کے طریق ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس متصل حدیث کو مرسل کہنا، جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۳۹ میں کہا ہے بالکل باطل اور مردود ہے۔ اور قاضی مقبول احمد صاحب نے اسے موقوف صحابی اور فہم صحابی کہہ کر گلو خلاصی چاہی ہے جو انتہائی جہالت ہے۔ یہ فہم صحابی نہیں یہ روایت حدیث ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو اس کے نتیجے میں لوگ ہر قسم کی قرأت سے بالکل باز آ گئے۔ یہ روایت ہے نہ کہ فہم صحابی۔ اس لئے یہ حدیث بالکل صحیح اور قابل قبول ہے۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

کے طرق سے تمام روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔) کیونکر ترجیح دی جاسکتی ہے؟ امام بیہقی رحؒ پر امام اوزاعیؒ کی یہ نوازش ہوتی ہے کہ اتنا تو وہ یاد رکھ سکے ہیں کہ یہ جملہ مرفوع حدیث میں نہیں ہے۔ مگر سند محفوظ نہیں رکھ سکے۔ امام بیہقی علیہ الرحمۃ کو کیا مصیبت درپیش ہے کہ وہ ان لایعنی اور بے سند باتوں اور تار عنکبوت سے معمرؒ کی صحیح روایت کو رد کر کے اصول شکنی کرتے ہیں؟ مگر سچ ہے ایک غلطی کے درست کرنے کے لیے متعدد[1] غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

خامساً۔ اگر یہ جملہ بالفرض حضرت ابوہریرہؓ کا نہ ہو بلکہ امام زہریؒ کا ہو۔ تب بھی کامیابی اور فتح جمہور ہی کی ہوگی۔ فریق ثانی کو بغیر حرماں نصیبی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحؒ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض فانتھی الناس الخ کو امام زہریؒ کا مدرج ہی تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وزنی دلیل ہوگی کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام زہریؒ اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنا ضروری ہوتا تو یہ مسئلہ امام زہریؒ سے کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟ جب امام زہریؒ یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں لوگوں نے قرأت ترک کر دی تھی۔ تو یہ اس بات کی کھلی اور معقول دلیل ہے کہ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ امام کے پیچھے قرأۃ نہیں کیا کرتے تھے اور اسی پر امام موصوفؒ نے ان کو عامل پایا (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵)

سادساً۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ فریق ثانی اس جملہ کو امام زہریؒ کا مدرج تسلیم کرتا ہے۔ اگر یہ جملہ (فانتھی الناس الخ) سرے سے اس حدیث میں نہ ہو اور روایت مالی انازع القرآن پر ہی ختم ہو جائے (جیسا کہ امام لیثؒ بن سعدؒ وغیرہ کی روایت یہیں ختم ہوتی ہے) تو پھر بھی یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرنیوالا

---

[1] مثلاً یہ کہ صحیح اور ضعیف حدیث کا تعارض ہو تو صحیح قابل اخذ اور ضعیف متروک ہوگی۔ ثقہ کی زیادت[2] مقبول ہوگی۔ واصل[3] اور رافع کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ مثبت[4] کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ امام[5] معمرؒ اثبت الناس فی الزھری رحؒ ہیں۔ امام اوزاعیؒ[6] فی الزھری لیس بذاک وغیرہ وغیرہ تمام طے شدہ قواعد کو محض ایک غلط بات کو درست کرنے کے لیے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ فواعجباہ واسفاہ۔

صرف ایک ہی شخص تھا اور اس کو بھی آپ نے گوارا نہ فرمایا۔ پہلے آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فوراً سوال کیا۔ اور پھر اس شخص کے اقرار کرنے کے بعد مالی انازع القرآن کے جملہ سے اس کی قرآت کو ناپسند کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ فرمائی اگر فانتھی الناس کا جملہ سرے سے نہ ہو تو کیا اس تنبیہ کے بعد بھی اس کا حضرات صحابہ کرامؓ سے احتمال ہے کہ وہ باقاعدہ امام کے پیچھے قرآت کرتے رہے؟ حَاشَا وَ کَلاَّ۔ راقم کہتا ہے کہ اگر اس حدیث میں اور کچھ بھی نہ ہوتا صرف یہی جملہ ہوتا۔ ھل قرأ معی منکم احدٌ تو پھر بھی یہ جمہور کی دلیل کے لیے کافی ہوتا، حالانکہ جملہ فانتھی الناس حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے، جیساکہ بسند صحیح آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اصلی بات یہ ہے کہ امام زہریؒ کے فانتھی الناس الخ کے مضمون کے سمجھنے میں فریق ثانی کو غلطی[2] واقع ہے جس کے سبب انھوں نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور ایک بے بنیاد

---

[1] آپؐ نے ھل قرأ ارشاد فرمایا ہے۔ ھل جھر نہیں فرمایا جس سے سورۃ فاتحہ کی قرآت ہر طرح سے ممنوع ہو گی۔ اس لیے ھل قرأ کو جہر پر حمل کرنا یا ھل قرأ کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیساکہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) یقیناً باطل اور مردود ہے اور حمل النصوص علی ظواھرھا کے خلاف ایسا مطلب مراد لینا ہرگز صحیح نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر پڑھنے والے نے آہستہ قرآت کی تھی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے علم ہوا؟ تو یہ بڑی سطحی قسم کی بات ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آپ کو نماز کی حالت میں ایک مخصوص کیفیت حاصل تھی جس سے آپ مقتدیوں کے رکوع و سجود اور خشوع کو ملاحظہ کر لیتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۷۵) ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے جس کی وجہ سے ہم پر قرآن کریم کی قرأۃ ملتبس ہو جاتی ہے (نسائی جلد ۱ ص ۱۱۱) حافظ ابن کثیرؒ اسی مضمون کی ایک اور روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسناد حسن و متن حسن۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ مقتدیوں کے وضو کے نقصان سے متاثر ہوتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز سے (صحتہً و فساداً) وابستہ اور متعلق ہوتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۴۳۱) لہٰذا مقتدی کی آہستہ قرآت سے آپ کا متاثر ہونا بعید نہ تھا۔ اس لیے نماز کی حالت میں آپ کی طبیعت لطیف تر اور شفاف تر ہو جاتی تھی۔

[2] امام زہریؒ مرفوع حدیث بیان کر رہے تھے جس میں فانتھی الناس الخ کا جملہ بھی تھا۔ امام موصوفؒ

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور پادر ہوا بات کی درستی کے لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے امام کے پیچھے صرف جہری نمازوں میں قرأت کی ممانعت آئی ہے۔ حالانکہ تم سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے منکر ہو۔ لہٰذا تمہارا دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے۔ (تحقیق الکلام وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے شاگرد حضرات تھے۔ ایک نے یہ جملہ براہِ راست امام زہریؒ سے نہ سنا تو رفیق سبق سے پوچھا کہ امام زہریؒ نے کیا فرمایا تھا۔ وہ بولے فانتھی الناس الخ کہا تھا۔ اس سے بعض کو یہ دھوکہ ہوا کہ شاید یہ جملہ امام زہری کا مدرج ہے۔ حالانکہ یہ جملہ بھی مرفوع حدیث میں موجود تھا۔ (فتح الملہم جلد۲ ص ۲۳ و اعلاء السنن جلد۴ ص ۸۸) چنانچہ روایت یوں ہے کہ

وقال عبد الله بن محمد الزهری من بينهم قال سفيان وتكلم الزهری بكلمة لم اسمعها فقال معمر انه قال فانتهى الناس الخ

اپنے ساتھیوں میں سے عبد اللہ بن محمدؒ نے یہ بیان کیا کہ سفیانؒ نے فرمایا کہ امام زہریؒ نے ایک کلمہ بیان کیا لیکن میں خود ان سے نہ سن سکا۔ میں نے پوچھا کہ انھوں نے کیا فرمایا ہے؟ امام معمرؒ نے فرمایا کہ زہریؒ نے فانتھی الناس الخ کا جملہ بیان کیا ہے۔

(ابو داؤد جلد۱ ص ۱۲۰، کتاب القرأۃ ص ۹۹، سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۸)

اور کتب احادیث میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً زہیرؒ کا بیان ہے کہ ابو الزبیرؒ حدیث بیان کر رہے تھے۔ ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ وہ جملہ مجھے میرے رفیق درس یاسین زیاتؒ نے بتایا۔ (طیالسی ص ۲۴۰) حضرت جابرؓ بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیث ارشاد فرما رہے تھے لیکن ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتلایا (ترمذی جلد۲ ص ۴۵، ابو داؤد جلد۲ ص ۲۳۲، طیالسی ص ۱۰۱، بغدادی جلد۱ ص ۱۹۶) حضرت عبد اللہ بن قرطؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی مگر ایک خفیف سا کلمہ میں نہ سن سکا۔ میں نے پہلو میں اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا (مستدرک جلد۴ ص ۲۲۱) حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی لیکن ایک جملہ اہل مجلس کے رونے اور شور وغل کی وجہ سے میں نہ سن سکی۔ میرے قریب جو صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے وہ جملہ مجھے بتایا۔ (نسائی جلد۱ ص ۲۲۴ و مشکوٰۃ جلد۱ ص ۲۶) اور یہ تمام جملے مرفوع حدیث کے ساتھ تھے۔ یہی حال فانتھی الناس الخ کے جملہ کا ہوا ہے۔

جواب: یہ ٹھیک ہے کہ جمہور اہلِ اسلام تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآۃ کے عدم جواز کے قائل ہیں لیکن یہ دعویٰ کس نے کیا ہے کہ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے عدم جواز قرآۃ کی دلیل صرف یہی ایک حدیث ہے۔ ہاں جہری نمازوں میں عدم جواز قرآۃ خلف الامام کی ایک دلیل یہ روایت بھی ہے باقی سری نمازوں کے لیے قرآن کریم کی آیت۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی حدیث واذا قرء فانصتوا پہلے بیان ہو چکی ہے۔ بقیہ دلائل اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نقد تو وصول کر لیجئے۔ اور ادھار کے منتظر رہیے۔ دنیا بامید قائم است۔

باقی امام بیہقیؒ وغیرہ کا ابن اکیمہؒ کی روایت کا علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت سے معارضہ کر کے علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت کو ترجیح دینا سو یقیناً مردود ہے، جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز اور یہ بات بھی اپنے مقام پر انشاء اللہ تعالیٰ باحوالہ آئے گی کہ حضرت ابوہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآۃ نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ حضرت ابوہریرہؓ کا فتویٰ جہری نمازوں کو بھی شامل ہے بالکل بے کار ہے۔

پانچویں حدیث۔ امام عبداللہؒ [1] فرماتے ہیں کہ مجھ سے والد ماجد امام احمدؒ بن حنبلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یعقوبؒ بن ابراہیمؒ [2] نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن عبداللہ [3] بن مسلمؒ سے روایت کرتے ہیں

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۳) امام احمدؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[2] علامہ ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۸۰) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۰۶)

[3] امام احمدؒ ان کو صالح الحدیث اور لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ایک روایت میں ان کو صالح کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی روایتیں لکھی جا سکتی ہیں۔ امام ابو داؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ مجھے ان کی کسی حدیث میں خرابی معلوم نہیں اور میں نے ان کی کوئی حدیث منکر نہیں دیکھی۔ واقدیؒ ان کو کثیر الحدیث اور صالح کہتے ہیں۔ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں (اور یہ بالکل ایک ظاہر امر ہے کہ صحاح ستہؒ کے راوی میں اگر کوئی کمزوری ہو تو قابل برداشت ہوتی ہے جبکہ مقابلہ میں کوئی ثقہ راوی نہ ہو) صحیح بخاری میں ان کی دو حدیثیں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۷۸) امام زہریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

وہ امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے عبدالرحمٰن بن ہرمزؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن بحینہؓ[2] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

هل قرأ احد منكم معى انفا قالوا نعم قال انى اقول مالى انازع القرآن فانتهى الناس عن القرأة معه حين قال ذٰلك۔

(مسند احمد جلد ۵ ص ۳۴۵)

کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ حضرات صحابہ کرامؓ نے عرض کیا جی حضرت قرأت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تب ہی تو میں (دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآنِ کریم کی قرأت میں منازعت اور کشمکش کیوں کی جا رہی ہے؟ آپ کا یہ ارشاد جب سنا تو لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔

امام ابوبکر ہیثمیؒ (المتوفی ۸۰۷ھ) اس حدیث کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ رواه احمد ورجال احمد رجال الصحيح۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۰۹) یہ روایت امام احمدؒ نے بیان کی ہے اور امام احمدؒ کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ اس کے آگے علامہ ہیثمیؒ نے امام بزارؒ کا وہ اعتراض نقل کیا ہے جو عنقریب آ رہا ہے۔ الغرض سند کے لحاظ سے یہ روایت بھی صحیح ہے۔ اور اس میں جہری نماز کی کوئی قید بھی مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت جہری اور سری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ گویا اس روایت کے پیشِ نظر حضرات صحابہ کرامؓ نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأت ترک کر دی تھی۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۲ للجصاص الرازیؒ) اور اگر اس روایت میں جہر کی قید بھی ہو جیسا کہ مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۰

---

[1] امام ذہبیؒ ان کو الحافظ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۱ ص ۹۱)

[2] بحینہ اُن کی والدہ کا نام تھا (نووی ۱ ص ۲۱۱، طبقات ابن سعد جلد ۴ قسم دوم صفحہ ۳۰) والد کا نام مالک تھا۔ (صحیح مسلم ۱ ص ۲۱۱) مدینہ سے تیس ۳۰ میل دور مقام ریم میں متوطن ہو گئے تھے (استیعاب جلد ۱ ص ۳۵۱) اور جلیل القدر و فضلائے صحابہؓ میں ان کا شمار تھا۔ (اصابہ جلد ۴ ص ۱۴۱) المتوفی ۵۵ھ

[3] یہ روایت سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸ اور کتاب القرأۃ ص ۹۰ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

کی ایک روایت میں ہے صلّی صلوٰۃ یجھر فیھا الخ تب بھی جہری نمازوں میں ترک قرأۃ خلف الامام پر سابق روایات کی طرح یہ صریح دلیل ہے۔ اس روایت پر امام بزارؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں محمدؒ بن عبداللہؒ بن مسلمؒ نے خطا کی ہے۔ اصل روایت عن[1] ابن اکیمۃ عن ابی ھریرۃؓ الخ تھی۔ لیکن انھوں نے عن ابن بحینۃ کردی ہے۔ اور پھر محض لفظوں کے ذریعہ لوں رعب جمانے کی سعی کی ہے کہ ھٰذا اخطأ لا شك فیه ولا ارتیاب۔ (سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) لیکن محض ظن اور اٹکل سے ایسے لا یعنی اور بیکار اعتراض کون سنتا ہے؟ کیا ابن اکیمہؒ اور حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ عبداللہ بن بحینہؓ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ترک قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرنے کے مجاز نہیں تھے؟ اور کیا امام احمدؒ بن حنبلؒ اور علامہ ہیثمیؒ وغیرہ کو یہ غلطی اور خطا معلوم نہ ہو سکی؟ نہ تو اس میں اندراج کی غلطی سے انتقال سند ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴۱ میں کہا ہے اور نہ یہ روایت ضعیف ہے۔ وعلیٰ سبیل التنزل اگر یہ روایت عن ابن اکیمہؒ عن ابی ھریرہؓ ہی ہو۔ تب بھی یہ صحیح روایت پہلی روایت کی مؤید ہوگی اور اس کا صحیح ہونا آپ معلوم ہی کر چکے ہیں۔ حالانکہ یہ روایت عبداللہؓ ابن بحینہؓ ہی سے مروی ہے۔ امام معمرؒ اور سفیانؒ بن عیینہؒ کی زہریؒ عن ابن اکیمہ الخ کی روایت اپنے مقام پر صحیح ہے۔ نہ تو دونوں میں تعارض ہے اور نہ اختلاف۔ رہا اس روایت میں قرأ کو جہر پر حمل کرنا یا اس میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحۃ پر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹) تو محض فرسودہ اور بے حقیقت تاویل ہے۔ اور خالص سینہ زوری پر محمول ہے۔ فسامحه الله تعالیٰ بعموم فضله۔

---

[1] علامہ ہیثمیؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس روایت کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔ اگر اس روایت کو ابن اکیمہؒ سے تسلیم کیا جائے تو ابن اکیمہ بخاری کے راوی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا رجاله رجال الصحيح کہنا ہی امام بزارؒ کی تردید کے لیے کافی ہے اور اپنے وقت میں اگر علامہ ہیثمیؒ کو صحت اور سقم کی پرکھ نہیں تو اور کس کو تھی؟ مؤلف خیر الکلام کا ہیثمیؒ پر اعتراض بے سود ہے اگرچہ مسند احمد کی بعض روایتیں ضعیف و کمزور ہیں مگر یہ سند بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔

چھٹی حدیث: امام بزارؒ[1] فرماتے کہ ہم سے محمدؒ[2] بن بشارؒ اور عمروؒ بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمدؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یونسؒ[4] بن ابی اسحاقؒ نے اپنے باپؒ[5] سے بیان کیا۔ وہ ابو الاحوصؒ[6] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

---

[1] صاحب مسند احمد بن عمرو بن عبد الخالقؒ (المتوفی ۲۹۲ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۴)

[2] حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ اور عجلیؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ صدوق اور نسائیؒ لا باس کہتے ہیں۔ مسلمہ بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور مشہور کہتے ہیں۔ دار قطنیؒ ان کو من الحفاظ والاثبات کہتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷۲) عمروؒ بن علیؒ کو امام ابو زرعہؒ من فرسان الحدیث اور دار قطنیؒ من الحفاظ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ مسلمہ بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۸۲)

[3] ان کا نام محمد بن عبد اللہ بن الزبیرؒ تھا۔ امام ابن نمیرؒ ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ بندارؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ محدث ابو زرعہؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام ابو حاتمؒ ان کو حافظ الحدیث کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لیس بہ بأس ابن قانعؒ ثقہ اور ابن سعدؒ ان کو صدوق اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۲۵۵)

[4] امام ابن معینؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ حسن الحدیث اور نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو جائز الحدیث کہتے ہیں اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۱ ص ۴۳۴)

[5] ابو اسحاق السبیعیؒ علامہ ابن ناصر الدینؒ ان کو بڑے حفاظ اور ائمہ دین میں شمار کرتے ہیں (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۷۴) امام نوویؒ لکھتے ہیں ان کی توثیق جلالت اور ثنا پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۲ ص ۱۷۱) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰۸) امام احمدؒ ابن معینؒ، نسائیؒ، عجلیؒ اور ابو حاتمؒ وغیرہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۶۵)

[6] ان کا نام عوفؒ بن مالکؒ بن نضلہ تھا۔ امام ابن سعدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۸ ص ۱۶۹) حضرت ابن مسعودؓ جلیل القدر صحابی تھے جن کے کچھ مناقب باب اوّل میں بیان ہو چکے ہیں۔

کانوا یقرأون خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال خلطتم علیّ القرآن۔ (احکام القرآن جلد ۳ صہ۵۱ وطحاوی جلد ا صہ۱۰۶، الجوہر النقی جلد ۲ صہ۱۶۲)

کہ لوگ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ پر قرآن مجید کی قرأت خلط ملط کر دی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے پیچھے قرأت کرنے والوں کی قرأت کو گوارا نہ فرمایا اور مخصوص لہجہ میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی اور اس میں چونکہ جہری نماز کی قید نہیں۔ اس لیے سب نمازوں کو یہ روایت شامل ہوگی۔ اور آہستہ قرأت کرنے بلکہ مقتدیوں کے عدم تکمیل وضو سے آپ کا متاثر ہونا پہلے نقل ہو چکا ہے۔ علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ یہ روایت مسند احمد، مسند ابو یعلیٰ اور مسند بزار میں مروی ہے۔ اور مسند احمد کی روایت کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ صہ۱۱۰) علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ وھذا اسناد جیّد کہ یہ عمدہ اور کھری سند ہے۔ (الجوہر النقی جلد ۲ صہ۱۶۲) اور قرأت چونکہ مطلق ہے اس لیے سورۂ فاتحہ اور قرآن کریم کی جملہ سورتوں کی قرأت کو شامل ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جہر اور سرّ کا کوئی فرق بیان نہیں فرمایا۔ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

اس روایت میں قرأ کو جہر پر یا قرأت کو ما زاد علی الفاتحۃ پر بجبر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ کی تقلید میں کرنے والوں نے (جن میں قاضی مقبول احمد صاحب بھی ہیں) کیا ہے بالکل غلط ہے ایسی لایعنی تاویلات کو کون مانتا ہے؟

بعض طرق میں اس کا ذکر آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ آپ کے پیچھے جہر سے قرأت کرتے تھے مگر فیجھرون کے الفاظ سنداً و معناً محل نظر ہیں۔ یہ روایت دار قطنی جلد ا ص ۱۳۰ میں ہے، لیکن پوری سند یوں ہے: عن یونس بن ابی اسحٰق عن الاحوص..... الخ اور گو تعلیق المغنی میں کہا ہے: اسنادہ حسن مگر مؤلف خیر الکلام کے اصول سے یہ صحیح نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ

اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعیؒ ہیں حافظ ابن حجرؒ نے ان کو تیسرے طبقہ کے مدلسین

میں شمار کیا ہے۔ طبقات المدلسین صـ ۱۴ اور اس طبقہ کی روایات بدون تصریح سماع مقبول نہیں ہوتیں ..... الخ (خیر الکلام صـ ۲۶۸) بقول ان کے یہ نہ تو صحیح ہے اور نہ مقبول علاوہ ازیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یونسؒ کی اپنے والد سے روایت ضعیف ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳۴) اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۹۰ میں لکھا کہ بعض اہل علم ابو اسحاقؒ کو ان کے اختلاط کی وجہ سے چھوڑ چکے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۹۲) لہٰذا متروک کی روایت کا کیا اعتبار۔ کم از کم ان کو اپنے پیش کردہ اصول کا خیال تو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ساتویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسن علیؒ[۱] بن احمد حمامی مقریؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ[۲] بن سلیمان فقیہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم[۳] بن ہیثمؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے آدمؒ[۴] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

---

[۱] علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ صادق دیندار، فاضل اور حسن الاعتقاد تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ صـ ۳۲۹) مؤلف خیر الکلام نے (صـ ۴۴۷ میں) یہ کہا ہے کہ ابن ابی الفوارسؒ کہتے ہیں ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔ میزان جلد ۲ صـ ۲۱۷، اور لسان المیزان جلد ۴ صـ ۱۹۴) مگر یہ ان کی جہالت ہے کیونکہ جن کی تضعیف ابن ابی الفوارسؒ نے کی ہے وہ علیؒ بن احمدؒ بن ابی قیس المقریؒ الرفاعی..... ..... الخ ہیں جن کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوئی ہے۔ دیکھئے لسان جلد ۴ صـ ۱۹۴ وغیرہ اور زیر بحث سند میں علیؒ بن احمدؒ بن عمرؒ بن حفصؒ ابو الحسن المقری المعروف بابن الحمامیؒ ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی (دیکھئے بغدادی جلد ۱۱ صـ ۳۳۰) اس لیے مؤلف خیر الکلام کا صـ ۴۴۷ میں یہ کہنا کہ پھر یہ حدیث بالکل منکر شاذ اور ضعیف ہے۔ انتہیٰ بلفظہٖ قطعاً باطل اور مردود ہے۔

[۲] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الفقیہ اور شیخ العلماء لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ صـ ۶۹)

[۳] امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بحوالہ الجوہر النقی جلد ۱ صـ ۱۰) دارقطنیؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (جلد ۱ صـ ۱۸) ابن عدیؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۲۳) خطیبؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۶ صـ ۲۰۶)

[۴] آدمؒ ابن ابی ایاسؒ، امام ابو داؤدؒ، ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور

(باقی اگلے صفحہ پہ)

ہم سے ابن ابی ذئبؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ[2] بن عمروؒ سے اور وہ محمدؒ بن عبدالرحمٰنؒ[3] بن ثوبانؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ما کان من صلوٰۃ یجھر فیھا الامام بالقرأۃ فلیس لاحد ان یقرأ معہ۔ (کتاب القرأۃ ص ۹۹، وص ۲۲ طبع اشرف پریس)

جس نماز میں امام جہر سے قرأت کرتا ہو۔ اس نماز میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ امام کے ساتھ قرأت کرے۔

یہ روایت بھی اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے کسی مقتدی کو اس کی گنجایش نہیں ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کرے۔ امام بیہقیؒ نے قرأت سے جہر اور ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت مراد لی ہے۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مامور من اللہ تھے۔ اور آپ کو فاصدع بما تؤمر کا حکم تھا۔ مطلق قرأت اور سورۂ فاتحہ کی مقید قرأت میں نیز نفسِ قرأت اور جہر بالقرأۃ میں آپ اچھی طرح فرق جانتے تھے۔ پھر نہ معلوم آپ نے اتنی رازداری اور کنایہ سے کام کیوں لیا؟ آپ نے یہ کیوں نہ فرمادیا کہ فلیس لاحد ان یجھر معہ اور یہ کیوں نہ فرمادیا: فلیس لاحد ان یقرأ معہ غیر سورۃ الفاتحۃ آپ کے الفاظ تو یہ ہیں فلیس لاحد ان یقرأ معہ کسی کو یہ حق نہیں کہ امام کے ساتھ کسی قسم کی قرأت کرے۔ آپ کے مطلق حکم کو بلا دلیل مقید کر دینا

(بقیہ گذشتہ صفحہ) مامون کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ا ص ۱۹۲)

[1] ثقہ، فقیہ اور فاضل تھے۔ (تقریب ص ۳۲۹)

[2] امام ابو زرعہؒ، نسائیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۳۷۴)

[3] ابن سعدؒ، ابو زرعہؒ، نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعینؒ میں تھے اور ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۹ ص ۲۹۴) حضرت ابوہریرہؓ مشہور صحابی تھے۔ غرضیکہ اس روایت کا ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے۔

اور مطلق قرأت کو مقید قرأت پر بغیر کسی حجت کے حمل کرنا سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک اور بات اس روایت کے بارے میں امام بیہقیؒ سے نکلی ہے، وہ بھی بہت ہی عجیب ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت منکر ہے۔ اگر کوئی روایت صرف امام بیہقیؒ کے منکر کہنے سے منکر ہو جایا کرتی ہے تو پھر ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن اصول حدیث کے لحاظ سے یہ روایت کسی طرح منکر نہیں ہے۔ حضرات محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں منکر وہ روایت ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہو جو فاحش غلطی اور کثرتِ خطا کا مرتکب ہوا ہو۔ یا اپنے سے زیادہ کسی ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ (دیکھیے شرح نخبۃ الفکر ص ۵۵ و ۵۹ وغیرہ) لیکن اس روایت کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور اس روایت میں کوئی ایسا راوی موجود نہیں۔ جو کسی ثقہ راوی کی مخالفت کر رہا ہو۔ اگر امام بیہقیؒ کی مراد اس روایت کو علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت کے خلاف بتانا ہے۔ تو اس کی حقیقت بھی عنقریب آشکارا ہو جاتے گی۔ انشاء اللہ العزیز اندریں حالات اس کو منکر کہنا اصول کے خلاف ہے جو کسی طرح مسموع نہیں ہو سکتا۔ اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ یہ نقل ہو چکا ہے کہ امام بیہقیؒ کا کوئی قول بلا دلیل حجت نہیں ہو سکتا۔ مؤلف خیر الکلام (ص ۴۴۶ میں) لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے طبیعت نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ جو صحیح روایات حضرت ابوہریرہؓ سے وارد ہیں یہ بوجہ ان کے خلاف ہونے کے شاذ ہے..... الخ اگر امام بیہقیؒ کی طبیعت صحیح حدیث کو نہیں مانتی تو نہ مانے۔ صحیح حدیث کو ماننے والے بھی دنیا میں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں اور حضرت ابوہریرہؓ سے جہری نمازوں میں کوئی روایت خلف الامام قرأت کی ثابت نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان ہو گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) لہٰذا خلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آٹھویں روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوبکرؒ بن اسحاقؒ الفقیہ اور ابوبکرؒ بن عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے

---

[1] امام ابو عبداللہؒ کا ترجمہ باب اول میں گزر چکا ہے۔ ابوبکرؒ بن اسحاق الفقیہؒ اور ابوبکرؒ بن عبداللہؒ کی سند ڈبل ہے مگر مزید تسلی اور تسکین کے لیے (کیونکہ ابوبکر الفقیہ تو مشہور امام ہیں) ابوبکر بن عبداللہ کا ترجمہ سن لیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام، الاوحد، المعدل اور محدث نیشاپور لکھتے ہیں۔ (المتوفی ۳۴۲ھ) (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۰۴)

ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن بشرؒ بن سعد المرثدیؒ اور حسنؒ[1] بن سفیانؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے فضیلؒ[2] بن عبدالوہابؒ اور محمدؒ بن خالدؒ بن عبداللہ الواسطیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے خالدؒ[3] بن عبداللہ الطحانؒ نے بیان کیا۔ وہ عبدالرحمٰنؒ[4] بن اسحاقؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ سعید مقبریؒ[5] سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] سند کی یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ اور حسنؒ بن سفیانؒ کا ترجمہ باب اوّل میں امام زہریؒ کے اثر میں نقل ہو چکا ہے کہ وہ جلیل القدر امام تھے۔

[2] یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ فضیلؒ ثقہ اور لا بأس بہ تھے۔ محدث عبدالرحمٰنؒ اپنے والد سے ان کی توثیق نقل کرتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۳۹۳) ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور ابوبکر بزارؒ لیس بہ بأس کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۲۹۳)

[3] امام احمدؒ ابن سعدؒ، ابو زرعہؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صحیح الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ محمدؒ بن عمارؒ ان کو اثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً ۳ ص۱۰۱) امام احمدؒ ان کو من افاضل المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۲۹۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۲۳۹)

[4] امام احمدؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوبؒ بن شیبہؒ صالح اور یعقوبؒ بن سفیانؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ حسن الحدیث کہتے ہیں۔ ابو داؤدؒ ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ (جلد ۲ ص۱۱۱ میں) لیس بہ بأس کہتے ہیں۔ ابن خزیمہؒ بھی لیس بہ بأس کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ صالح الحدیث اور ساجیؒ صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ ترمذیؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۳۸) مؤلف خیر الکلام ص۸۸ میں لکھتے ہیں کہ ابن معینؒ نے ان کو ضعیف کہا اور امام احمدؒ نے منکر الحدیث کہا یہ جرحیں اگرچہ مبہم ہیں مگر ان سے راوی مرتبہ سے گر جاتا ہے اھ (محصلہ) الجواب: امام ابن معینؒ نے ان کو ثقہ کہا ہے اور امام احمدؒ نے ان کو صرف ابو الزنادؒ کی روایت میں منکر کہا ہے اور یہ روایت سعید مقبریؒ سے ہے اور لطف یہ ہے کہ خود مؤلف مذکور جرح کو مبہم کہتے ہیں اور خیر الکلام ص۱۸۷ میں لکھا ہے کہ پھر اس پر جو جرحیں کی گئی ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا بام الکتاب فہی خداج الا صلوٰۃ خلف امام۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۵، طبع دہلی وص ۱۷۱، طبع اشرف پریس)

کہ ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو وہ نماز ناقص ہوتی ہے، مگر ہاں وہ نماز اس سے مستثنیٰ ہے جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

اس روایت میں خلف امام اور ام الکتاب کی قید خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئے۔ اور یہ بھی کہ آپ نے تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کو ضروری اور لازم ٹھہرایا ہے۔ مگر مقتدی کے لئے اس کی قرأت کی مطلقاً گنجایش نہیں چھوڑی اور امام بیہقیؒ وغیرہ جہاں قرأت سے ما زاد علی الفاتحۃ مراد لے کر گلو خلاصی کیا کرتے ہیں۔ یہ روایت ان کی اس تاویل کو بھی باطل ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ اس میں خاص طور پر ام الکتاب کی قید موجود ہے جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اور اس صحیح روایت سے بھی فریق ثانی کا یہ مطالبہ آسانی سے پورا ہوجاتا ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کرو۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مفسر نہیں محدثین اور اصول فقہ والوں کے ہاں اس قسم کی جرح مقبول نہیں ہوتی اور امام احمدؒ کی اصطلاح منکر الحدیث کے بارے میں بالکل جدا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان ابن حنبلؒ یطلق علی من یغرب علی اقرانہ فی الحدیث ای یأتی بالغرائب انہ منکر الحدیث ... انتہی (ہامش تدریب الراوی ص ۲۳۴) امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو راوی اپنے باقی ساتھیوں سے متفرد ہو کر کوئی غریب حدیث بیان کرے تو وہ منکر الحدیث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ غریب حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ کما لا یخفی۔ یہ یاد رہے کہ اس سند میں راوی عبدالرحمٰنؒ بن اسحاقؒ المدنی ہیں جو کہ رجال مسلم میں سے ہیں نہ کہ الواسطی جن پر امام بیہقیؒ نے امام ابن معینؒ اور امام احمدؒ کا کلام نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب القرأۃ ص ۱۰۶ طبع دہلی) کیونکہ المدنی سے خالدؒ بن عبداللہ الطحان الواسطیؒ کی اور المدنی کی سعید مقبریؒ سے روایت ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۳۷) مگر الواسطی اس پوزیشن میں نہیں۔ امام بیہقیؒ غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ (فصل الخطاب ص ۸۰) اور اسی عبدالرحمٰنؒ بن اسحاقؒ سے فریق ثانی ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰ کی روایت فانتہی الناس کے مرسل ہونے پر استدلال کرتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۸۰ للعلامۃ الکشمیریؒ)

ہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، المحدث اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۰ غرضیکہ حضرت ابوہریرہؓ تک تمام رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں۔

اعتراض: بیہقیؒ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اصل روایت میں الا صلوٰۃ خلف امام کا جملہ نہیں ہے جیسا کہ علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کا موقوف اثر نقل کیا ہے اور اس میں یہ جملہ مذکور نہیں ہے اور یہ خالد الطحانؒ کی خطا ہے کہ وہ یہ جملہ زائد کر کے حدیث کا مطلب بگاڑ رہے ہیں (کتاب القرأۃ ص۱۳۵ محصلہ)

جواب: یہ اعتراض چنداں وقعت نہیں رکھتا: اولاً: اس لیے کہ مرفوع حدیث کو موقوف اثر کے تابع بنا کر مطلب لینا خلافِ اصول ہے۔ وثانیاً: اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ کہ اعتبار راوی کی مرفوع حدیث کا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ وثالثاً: خالد الطحانؒ بالاتفاق ثقہ اور ثبت تھے۔ اور ثقہ کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے تو پھر نہ معلوم یہ غدر اور غلطی ان کے سر کیسے تھوپی جاسکتی ہے؟ ورابعاً: الزامی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر واقعی اس حدیث کے مضمون میں غلطی واقع ہوئی ہے تو کیوں نہ ہو کہ الا صلوٰۃ خلف امام کی زیادت صحیح ہو۔ اور علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت میں غلطی اور خطا کی وجہ سے یہ زیادت چھوٹ چکی ہو۔ اور اس زیادت کے ترک کر دینے یا چھوٹ جانے کی وجہ سے حدیث کا مضمون بدل گیا ہو بلکہ قرین انصاف بھی یہی بات ہے کہ غلطی خالد الطحانؒ کی نہ ہو جو ثقہ اور ثبت تھے بلکہ یہ غلطی اور خطاء علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی ہو۔ کیونکہ ان پر کتب رجال میں کلام اور جرح کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبرؒ اور علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معینؒ فرماتے تھے لیس حدیثہ بحجۃ کہ علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی حدیث حجت نہیں ہوسکتی، ابن عدیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کی بعض حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔ ابوزرعہؒ کا بیان ہے کہ وہ کوئی زیادہ قوی نہ تھے، امام ابو داؤدؒ کا بیان ہے کہ محدثین نے ان کی صیام شعبان کی حدیث ان کے مناکیر میں شامل کی ہے، محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں۔ جن میں ان کا کوئی متابع نہیں ہے۔ (دیکھئے کتاب الانصاف ص۱۶ میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۱۲ اور تہذیب التہذیب جلد ۸ ص۱۸۶) اس لیے قرین قیاس اور مبنی بر انصاف صرف یہی بات ہے کہ اس زیادت کے ترک کرنے میں غلطی علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی ہے اور یہ روایت ان کی منکر روایتوں میں شمار ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا ص۱۸۷ میں یہ کہنا کہ علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ پر جرح مبہم ہے، اور نور الانوار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جرح مبہم اثر انداز نہیں ہوتی۔ پس وہ ثقہ ٹھہرے۔

امام مسلمؒ نے ان سے استشہاد کیا ہے، لہٰذا ان کے ہاں بھی ثقہ تھے۔ اور اُمّت نے مسلم کی روایات کو جن پر تنقید نہیں ہوئی صحیح کہا ہے لہٰذا بالاجماع صحیح ہوئی۔ (محصّلہ) محض تسکین قلب کا سامان ہے امام ابن معینؒ نے ان پر مفسر جرح کی ہے اور جرح مبہم سے بھی مؤلف مذکور کے نزدیک راوی گر جاتا ہے اور اس پر ابن معینؒ وغیرہ نے تنقید کی ہے۔ لہٰذا یہ کسی طرح صحیح نہیں یہ ان کی غلطی ہے اور خالد الطحانؒ کی زیادت بلاشک و شبہ صحیح ہے کیونکہ وہ ثقہ ثبت صحیح الحدیث اور اثبت ہیں۔ الغرض یہ روایت بالکل صحیح ہے نہ اس میں خالد الطحانؒ کا وہم ہے اور نہ عبدالرحمٰنؒ بن اسحٰق کا، جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کہا ہے۔ امام مسلمؒ نے مقدمہ میں یہ تبلایا ہے کہ وہ استشہاد میں متکلم فیہ راوی کو بھی لے لیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص۴) لہٰذا ان کا مسلم میں آجانا جبکہ ان پر تنقید بھی ہوئی ہے ثقاہت کا ثبوت نہیں ہے

نویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالحسن[۱] علی بن احمدؒ بن عبدانؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد[۲] بن عبید الصفارؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد[۳]ؒ بن غالبؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابوعمر[۴]ؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہمام[۵]ؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے زیاد[۶] الاعلمؒ نے بیان کیا۔ وہ حسن[۷]ؒ سے روایت کرتے ہیں

۱؎ علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ ص ۳۲۹)

۲؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۸۷)

۳؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۱۷۲) دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور مامون اور حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ کہتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد۵ ص ۳۳۷) اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۳۳۸) نیز امام دارقطنیؒ نے ان کو مکثر مجود اور حافظ ابن حجرؒ نے متقن کہا ہے۔ (ایضاً)

۴؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۶۷)

۵؎ ذہبیؒ ان کو الامام، الحجۃ اور الحافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۸)

۶؎ امام احمدؒ، ابن معینؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور ابن سعدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابوزرعہؒ ان کو شیخ کہتے اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۶۲)

۷؎ امام حسن بصریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

اور وہ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے:

انه دخل المسجد والنبي صلى الله عليه وسلم راكع فركع قبل ان يصل الى الصف فقال النبي صلى الله عليه وسلم زادك الله حرصاً ولا تعد۔

(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰)

وہ کہتے ہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو آں حضرت[۲] صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رکوع میں چلے گئے تھے۔ چنانچہ صف میں ملنے سے قبل ہی وہ (تکبیر تحریمہ[۳] ادا کر کے) رکوع میں چلے گئے اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے صف میں مل گئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیکی کرنے پر اور حریص کرے پھر ایسا نہ کرنا۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرہ بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے۔ رکوع میں شامل ہو گئے تھے۔ مع ہذا ان کی اس رکعت کو اور ان کی اس نماز کو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکمل اور صحیح سمجھا۔ اور ان کو اعادۂ نماز کا حکم نہیں دیا۔ اور یہ دعویٰ کہ انھوں نے وہ رکعت دوبارہ پڑھی تھی بالکل بے بنیاد بات ہے بلکہ ایک توجیہ[۴] کے لحاظ سے عدم اعادہ کا صریح حکم ارشاد فرمایا۔ اگر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعت

---

[۱] ان کا نام نفیع بن الحارث تھا جنگ طائف کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ فضلائے صحابہ میں تھے۔ بصرہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ اور وہیں ۴۹ھ میں وفات پائی۔ (مقدمہ تجرید البخاری ص ۳)

[۲] یہ روایت صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸ و مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۹۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۳۹ و مسند احمد، ابو داؤد جلد ۱ ص ۹۹ و نسائی جلد ۱ ص ۱ اور الجامع الصغیر للسیوطی مع الشرح جلد ۲ ص ۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے یہ بخاری شریف کی روایت ہے جس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مزید تسلی کے لیے ہم نے سنن الکبریٰ کے روات کی توثیق بھی نقل کر دی ہے۔

[۳] یہ جملہ بین القوسین اور بریکٹ میں تھا کتابت کی غلطی کی وجہ سے قوس رہ گئے تھے۔ یہ حدیث کے ترجمہ میں داخل نہیں ہے۔ جیسا کہ الاعتصام ۲ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۴ میں اس کو غلط ترجمہ اور اضافہ کہہ کر پھبتی اڑانے کی بے جا سعی کی گئی ہے۔ اور چونکہ تکبیر تحریمہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک فرض ہے۔ اس لیے بین القوسین اس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حدیث مسئی الصلوٰۃ میں جو صحیح اور مشہور حدیث ہے ثم کبر ثم اقرأ کی تصریح موجود ہے اور حافظ ابن رشد لکھتے ہیں کہ فمفهوم هذا ان التكبيرة الاولى هي الفرض فقط (بدایۃ المجتہد جلد ۱ ص ۱۱۸) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ فرض صرف تکبیر تحریمہ ہی ہے۔

(حاشیہ نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

میں رکن اور ضروری ہے تو حضرت ابوبکرہؓ کی نماز کیسے صحیح ہوگئی تھی؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرہؓ کے رکوع میں شریک ہونے کو بنظر کراہت نہیں دیکھا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب نے سمجھا ہے۔ (دیکھئے الاعتصام ۱۶ر نومبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۵) بلکہ بحالت رکوع چل کر صف سے ملنے کو پسند نہیں فرمایا اور دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوا کہ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب۔

مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے کہ قرأت خلف الامام کو ضروری قرار دینے والوں کے دو قول ہیں ایک یہ کہ رکوع کی حالت میں اگر امام کو پائے تو اس رکعت میں فاتحہ فرض نہیں ہوتی ...... الخ (صفحہ ۴۵) لہٰذا یہ حضرات تو ہمارے ہمنوا ہوئے۔ رہے دوسرے حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رکعت اس کی شمار نہ ہوگی تو اس کا جواب انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا اور اس حکم میں حضرت ابوبکرہؓ کی خصوصیت بھی نہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے اور اسی حدیث سے جمہور اہل اسلام اور حضرات ائمہ

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ نمبر ۴) بعض محدثین اس کو لَا تَعْدُ پڑھتے ہیں۔ یعنی نماز کے لیے دوڑ کر نہ چلا کرو۔ بلکہ اطمینان اور وقار سے چلو اور بعض اس کو لَا تَعُدْ پڑھتے ہیں۔ یعنی پھر جماعت میں تاخیر اور تنہا صف کے پیچھے نماز شروع کرنے کی حرکت نہ کرنا اور بعض اس کو لَا تُعِدْ پڑھتے ہیں۔ یعنی تمہاری نماز بالکل صحیح ہے۔ نماز کا اعادہ نہ کرو۔ امام نوویؒ نے (ہامش مشکوٰۃ صفحہ ۹۹ ملاحظہ کریں) اور حافظ ابن حجرؒ نے لَا تُعِدْ کو بھی نقل کیا ہے۔ (دیکھئے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۱۴) قاضی شوکانیؒ اور نواب صدیق حسن خانصاحبؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے دوبارہ نماز پڑھی اور اس کا اعادہ کیا اور انھوں نے طبرانی کی اس روایت سے استدلال کیا ہے صل ما ادرکت واقض ما سبقك (امام الکلام ص ۵۱) لیکن حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے غیث الغمام از ص ۴۶ تا ص ۵۰ میں اس کا عقلاً و نقلاً خوب رد کیا ہے۔ وہ بحث وہاں ہی ملاحظہ کریں یہاں اتنی بات پیش نظر رکھیں کہ طبرانی کی روایت کی سند کیا ہے؟ اور اگر سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو کاروائی تم نے کی پھر ایسا نہ کرنا بلکہ جو حصہ نماز کا تمہیں جماعت کے ساتھ مل جائے اس کو جماعت کے ساتھ پڑھو اور جو چھوٹ جائے اس کو جماعت کے بعد اکیلے پڑھو۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ اس نماز کے اعادہ کا حکم دیا خالص کم فہمی ہے۔

۱؎ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ بڑی محنت اور مشقت سے رکوع میں ملنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور یہ اس کی واضح

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اربعہؒ نے مدرک رکوع کے مدرک رکعت ہونے پر استدلال اور احتجاج کیا ہے جس کی پوری تفصیل اپنے محل میں بیان ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ علامہ ابن حزمؒ ایک موقع پر حضرت ابوبکرہؓ کی ایک روایت سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ

فھذا آخر فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان ابوبکرۃؓ شھدہ وانما کان اسلامہ یوم الطائف بعد فتح مکۃ وبعد حنین۔ (محلی جلد ۴ جلد ۴ صفحہ ۲۲۷)

یہ فعل اور عمل آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل ہے کیونکہ اس میں ابوبکرہؓ موجود اور حاضر تھے۔ اور وہ فتح مکہ اور حنین کے بعد طائف کے دن مشرف باسلام ہوئے تھے۔

اس صحیح اور مرفوع حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ امام کے ساتھ رکوع میں ملنے والے کی وہ رکعت صحیح ہے۔ اگر اس پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہوتا، جیسا کہ فریق ثانی کا زعم ہے تو یقیناً اس رکعت کا اعتبار نہ ہوتا اور فریق ثانی کے دعویٰ کے مطابق کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سُورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظہٖ جیسا کہ سخن ہائے گفتنی میں عرض کیا جا چکا ہے) یہ نماز بھی کالعدم اور باطل ہونی چاہیئے تھی۔ عیاذاً باللہ تعالیٰ۔

تکبیر تحریمہ میں احناف کے نزدیک اتنا قیام جس میں تکبیر تحریمہ ادا ہو سکے فرض ہے۔ جب فرض ہے تو حضرت ابوبکرہؓ پر یہ فرض کیسے مخفی رہا پس لازمی امر ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے بحالتِ قیام ہی تکبیر تحریمہ ادا کی ہوگی، مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۵۳) میں یہ کہنا کہ ابوبکرہؓ نے قیام میں تکبیر کہ کر رکوع کیا ہوگا۔ ایک فرضی

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) دلیل ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہے۔ ورنہ یہ اکابر اس کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتے (بمعناہ) اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا۔ اس نے وہ رکعت پالی۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰) اس روایت کی سند میں یحییٰؒ بن ابی سلیمانؒ ہے جو متکلم فیہ ہے لیکن امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ ان کی ایک سند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ صحیح ولم یذکر بجرح (مستدرک جلد ۱ ص ۲۷۳) اور دوسرے مقام پر امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقات بصریین میں تھے۔ اور علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (مستدرک جلد ۱ ص ۲۱۶) اسی مضمون کی ایک اور مرفوع حدیث بھی امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے ساتھیوں کا بھی اسی پر عمل تھا۔ (ادب المفرد ص ۱۵۳)

بات ہے۔ بالکل غلط ہے۔ یہ فرضی بات نہیں ایک واضح اور کھلی حقیقت ہے اور اس کا انکار کرنا بے سُود ہے۔

دسویں حدیث: امام ابن ماجہؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے علیؒ بن محمدؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ اسرائیلؒ[4] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو اسحاقؒ[5] (السبیعیؒ) سے اور وہ ارقمؒ بن شرجیل[6] سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے (ایک طویل حدیث میں جس کا ضروری خلاصہ یہ ہے) روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے امامت سپرد کی۔ تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھایا کریں۔ ایک مرتبہ آپ کو خیال ہوا کہ میں باجماعت نماز ادا کروں۔ پہلے آپ کو تکلیف زیادہ تھی۔ پھر جب مرض میں تخفیف ہوئی۔ تو آپ دو آدمیوں کے سہارے پر آہستہ آہستہ چل کر مسجد میں پہنچے

---

[1] امام ابن ماجہؒ صاحب السنن (المتوفی ۲۷۳ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ ابو یعلی الخلیلیؒ ان کو ثقہ کبیر اور متفق علیہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸۹)

[2] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ، الثبت، محدث اور عالم قزوین تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۹)

[3] وکیعؒ، الامام، الحافظ، الثبت، محدث العراق اور احد الائمۃ الاعلام تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ حافظ اور عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۸۵)

[4] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے بلاوجہ لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ (ایضاً ص ۳۲) امام احمدؒ، عجلیؒ، یعقوبؒ بن شیبہؒ، ابو حاتمؒ، ابن نمیرؒ، ابن سعدؒ اور نسائیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۲) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الحجۃ، صالح، خداترس اور علم کا ظرف تھے۔ جن لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ ان کا قول مردود ہے۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے اُن سے احتجاج کیا ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹)

[5] ان کا ترجمہ حدیث نمبر ۶ میں نقل ہو چکا ہے۔

[6] محدث ابو زرعہؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ، اور ابن عبد البرؒ ان کو ثقہ اور جلیل القدر محدث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۵)

اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کر چکے تھے۔ اور ایک حد تک قرأت بھی کر چکے تھے۔ غرضیکہ آپ صفوں میں سے گزرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں جا پہنچے۔ چنانچہ وہ پیچھے ہٹ آئے اور ان کی جگہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ چونکہ آپ بیماری کی وجہ سے بلند آواز سے بول نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں تک آواز پہنچانے میں مکبّر کا فریضہ انجام دیا اور جب آپؐ پہنچے تو

واخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ۔

وہیں سے آپ نے قرأت شروع کی جہاں تک ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

(ابن ماجہ ص ۸۸ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۲)

اور ایک روایت میں (جو اس روایت کے لیے بطور شاہد اور تائید کے نقل کی جاتی ہے) یوں ہے: فقرأ من المکان الذی بلغ ابوبکرؓ من السورۃ۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سورت کے اس مقام سے قرأۃ شروع کی جہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

اور ایک روایت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

فاستفتح النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہٰی ابوبکرؓ من القرآن۔

اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کے اس حصہ سے قرأت شروع کی جس تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

(سنن الکبریٰ جلد ۳ ص ۸۱ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۲)

اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے:

فاستتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہی ابوبکرؓ من القرأۃ ..... الخ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۹۷)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں سے قرأت پوری کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

یہ روایت[1] سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ اس کا ایک ایک راوی ثقہ ہے جیسا کہ آپ

[1] یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۵ مشکل الآثار جلد ۲ ص ۲۷، طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۱۳۰ نصب الرایۃ جلد ۲ ص ۵۰ درایہ ص ۱۰۱ اور فتح الباری جلد ۲ ص ۱۳۵، دار قطنی ص ۱۵۲ وغیرہ میں مذکور ہے اور ازالۃ الخفا جلد ۱ ص ۷۸ میں ہے واخرجہ ابو یعلی الموصلی فی مسندہ .... الخ

ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اور مؤلف خیر الکلام کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ روایات مذکورہ بالا کے رواۃ ثقہ ہیں ..... الخ ص ۴۵۶ حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ مسند احمد اور ابن ماجہ کی سند قوی[1] ہے۔ (فتح الباری جلد ۵ ص ۹۲۹) چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بیمار تھے، جلدی جلدی چلنا آپ کے لیے دشوار تھا اور دو آدمیوں کے سہارے آپ مسجد میں پہنچے، حتیٰ کہ آپکے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے اور نماز آپ کے تشریف لانے سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سورۃ فاتحہ مکمل پڑھ چکے ہوں گے اور ان حالات کے پیش نظر یہی بات قرین انصاف ہے۔ اور اس میں تو ذرا برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سورۃ فاتحہ اگر مکمل نہ ہوئی ہوگی تو اس کا اکثر حصہ تو یقیناً پڑھا جا چکا ہوگا۔ اور آپؐ نے وہیں سے اور اُس آیت سے قرأت شروع کی جہاں تک حضرت ابو بکرؓ قرأت کر چکے تھے اور جن کے نزدیک سورۃ فاتحہ مقتدی پر لازم ہے۔ وہ سب سورۃ فاتحہ کے لزوم کے قائل ہیں اور جو منکر ہیں وہ بھی سب سورۃ فاتحہ کے منکر ہیں۔ اس میں قائل بالفصل کوئی بھی نہیں الغرض آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوری سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی تھی یا اس کا اکثر حصہ مگر باوجود اس کے آپ کی نماز ادا ہو گئی۔ اور آپ نے اس نماز کو صحیح اور درست سمجھا، نہ آپ کی نماز کالعدم ٹھہری اور نہ باطل اور بیکار (عیاذاً باللہ تعالیٰ) اگر ہر رکعت میں امام[2] کے

---

[1] اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں واسنادہٗ حسن (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۳۸)

[2] قاضی شوکانیؒ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پوری فاتحہ چھوٹ چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ کیا بعید ہے کہ جس رکعت میں آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو پالیا تھا۔ اس رکعت کے علاوہ باقی سب رکعتوں میں آپ نے پوری اور مکمل سورۃ فاتحہ پڑھی ہو، آگے لکھتے ہیں:

لان النزاع انما هو فی وجوب الفاتحة فی جملة الصلوٰة لا فی وجوبها فی کل رکعة۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۴۰)

کیونکہ سورۃ فاتحہ کے ہر ہر رکعت میں وجوب کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ سورۃ فاتحہ کے جملہ نماز میں وجوب کا جھگڑا اور نزاع ہے۔

علامہ عبد الرحمٰن جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مقتدی پر فرض ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے مگر جس صورت میں امام ساری فاتحہ یا اس کا کچھ حصہ پڑھ چکا ہو تو اس صورت میں امام اس کا متحمل ہو جاتا ہے —

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیچھے اقتدا کرنیوالے پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا لازم اور ضروری ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ نماز ہرگز صحیح نہ ہوتی ہے حالانکہ آپؐ کی یہ نماز بالکل صحیح تھی اور امام شافعیؒ و حافظ ابن حجرؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ بیماری کے دنوں میں آپؐ نے صرف یہی ایک نماز جماعت سے ادا کی تھی۔ اور اس لحاظ سے آپ کے اس آخری فعل اور عمل سے بھی یہ حکم آشکارا ہو گیا کہ

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) (فقہ المذاہب الاربعہ، جلد ا ص ۲۲۹) اور مولف خیر الکلام نے بھی یہ حوالہ نقل کیا ہے دیکھئے ص ۴۹) اور خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ جو لوگ فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ہاں رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے اور ان میں سے بعض اس طرف بھی گئے ہیں کہ جہری نمازوں میں اگر مقتدی پوری فاتحہ یا آدھی فاتحہ کے بعد آئے تو اس سے ساری فاتحہ یا آدھی فاتحہ ساقط ہو جاتی ہے۔ اھ خیر الکلام ص ۴۵۹) قاضی صاحبؒ اور مؤلف خیر الکلام نے تو اس طرح گلو خلاصی کر کے وقت پاس کر لیا ہے۔ لیکن تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج اور انعامی چیلنج کرنے والے تو ہر ہر رکعت میں قرأت فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔

لہ کتاب الام جلد ۲ ص ۱۸۵۔ ٢ه فتح الباری جلد ۲ ص ۱۴۵۔

۳ه روایات اور محدثینؒ کا اس باب میں شدید اختلاف ہے کہ مرض الموت میں آپ نے مسجد میں باجماعت ایک نماز پڑھی تھی یا دو؟ یہ نماز جہری تھی یا سری؟ آپ امام تھے یا مقتدی؟ وغیرہ وغیرہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک ہی نماز تھی جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے اور یہ ظہر کی نماز تھی (بخاری جلد ۲ ص ۶۹۳) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ظہر میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سری نماز ہے ..... الخ (ص ۴۶۵) بالکل مردود ہے۔ سری نمازوں میں قرأت ہوتی ہے جہر نہیں ہوتا ایک آدھ آیت کو قدرے آواز سے پڑھ لینا سر کے خلاف نہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے محض اپنی گاڑی چلانے کے لیے قرأۃ کو نماز پر حمل کیا ہے جو بالکل بے دلیل ہے اور ان بالا دلائل سے آنکھیں بند کر کے وہ یہ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابتدا ہی سے امام تھے جو بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کی صحیح روایت صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکرؓ قاعدًا جو اوپر گذر چکی ہے بالکل اس کے خلاف ہے اور یہ بھی صحیح روایت میں موجود ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ پیچھے ہٹنے لگے تو آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ پیچھے مت ہٹو، اگر ابتداء سے

مقتدی پر سورۂ فاتحہ لازم نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کے حوالہ سے آئے گا کہ یہ نماز ظہر کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرّی نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا نہ صرف یہ کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مطابق ہے بلکہ آپ کا آخری عمل بھی یہی ہے۔ امام بخاریؒ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

انما یؤخذ بالاٰخر فالاٰخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بخاری جلد ۱ ص ۹۶) یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو آخری عمل ہوگا۔ قابل عمل صرف وہی ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) امامت کا ارادہ ہوتا تو ایسا نہ فرماتے، ہاں اس کے بعد آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا ہے اور امام طحاویؒ وغیرہ کی بھی یہی مراد ہے کہ آپ بالآخر امام تھے اور ابتداء میں آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار کی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں یوں آتا ہے: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکرؓ قاعداً کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۲۷، طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۷ بیہقی جلد ۳ ص ۸۲، ترمذی جلد ۱ ص ۴۸، محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۹۶، ترمذیؒ فرماتے ہیں حسن صحیح) اور امام بخاریؒ (جلد ۱ ص ۹) نے یہ باب قائم کیا ہے۔ باب من قام الی جنب الامام لعلۃ اور امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۶۹) نے باب استخلاف الامام اذا عرض لہ عذر اور امام نسائیؒ (جلد ۱ ص ۱۲۷) نے باب صلوٰۃ الامام خلف رجل من رعیتہ قائم کرکے اور یہ حدیث اس باب میں نقل کرکے اس امر کو مبرہن کیا ہے۔ یہ دلائل بھی ملاحظہ ہوں اور قاضی مقبول احمد صاحب کی یہ تعلّی بھی دیکھیں کہ کیا مولانا سرفراز صاحب کسی حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ پہلے بطور مقتدی شامل ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں ...... الخ الاعتصام ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۹) اور پھر جب حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کی آمد کا علم ہوا تو خود پیچھے ہٹ گئے۔ اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور آپؐ نے وہیں سے قرأۃ شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ پڑھ چکے تھے اور صدیقؓ نے مکبّر کا فریضہ ادا کیا (دیکھئے نووی جلد ۱ ص ۱۷۹، فتح الباری جلد ۲ ص ۲۴ وغیرہ) اور یہی بات صحیح اور صواب ہے ولیس وراء عبادان قریۃ حافظ ابن حجرؒ نے الفاظ حدیث کے ظاہری تعارض کی وجہ سے تعدد واقعہ کو الصواب کہا ہے (الدرایہ ص ۱۰۰) مگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو واقعہ صرف ایک ہی ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے تطبیق آسانی سے ہو سکتی ہے اور تعدد واقعہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

الحمدللہ تعالیٰ کہ جس طرح جمہور کا مسلک متعدد صحیح و مرفوع قولی حدیثوں سے حق ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کے آخری عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس روایت سے متعلق فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیئے جائیں۔

پہلا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابواسحاق السبیعیؒ واقع ہیں اور وہ مدلس تھے اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ علاوہ بریں آخر عمر میں وہ اختلاط کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی روایت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ (او کما قال تحقیق الکلام جلد ۲ ص وغیرہ) اور یہی عذر لنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے کہ ابواسحاقؒ تیسرے درجے کے مدلس ہیں جن کی روایت بدوں تصریح سماع مقبول نہیں ملخصلہ خیر الکلام ص ۴۶۸، ۴۶۹) مگر بخاری میں ان کی معنعن حدیثوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ تاقیامت دے بھی نہ سکیں گے۔

جواب: حضرت قتادہؒ کی تدلیس کے ضمن میں حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ نقل کیا جا چکا ہے کہ تدلیس کرنے والے راویوں کا ایک گروہ وہ بھی ہے جن کی تدلیس کسی طرح مضر نہیں ہے اور محدثینؒ ان کی معنعن حدیثوں کو بھی صحیح سمجھتے ہیں، جن میں خصوصیت سے ابواسحاق السبیعیؒ کا نام بھی پیش کیا گیا ہے۔ رہا ابواسحاق السبیعیؒ کی تخلیط کا سوال تو وہ بھی چنداں باعث تشویش نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ ذہبیؒ ناقد فن رجال لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ تابعینؒ اور اثبات میں تھے، بڑھاپے کی وجہ سے ان پر کچھ نسیان طاری ہو گیا تھا۔ ولم یختلط (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۹۳) لیکن وہ مختلط نہیں ہوئے تھے۔ اور تصریح کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ان سے صرف ابن عیینہؒ نے سماعت کی ہے اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

قلت ما اختلط ابواسحاق ابدًا وانما یعنی بذلک التغیر ونقص الحفظ۔ (تذکرہ ۱ ص ۲۱۵)	میں کہتا ہوں کہ ابواسحاق تخلیط سے کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔ ہاں ان کے حفظ میں کچھ تغیر اور نقص واقع ہو چکا تھا۔

اور فن اصول حدیث کا یہ طے شدہ قاعدہ[1] ہے کہ معمولی وہم، تغیر یسیر اور نسیان کی وجہ سے ثقہ رواۃ

---

[1] امام عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ وہم سے کون بچ سکتا ہے؟ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۷) امام احمدؒ فرماتے

کی روایتوں کو ہرگز رد نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ابو اسحاق السبیعیؒ کی تدلیس اور تخلیط کا بہانہ کر کے
ان کی صحیح روایت کو رد کرنا سراسر باطل ہے۔

بعض محدثین (جن میں حافظ ابن حجرؒ وغیرہ بھی ہیں) اختلاط وغیرہ کا لفظ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن صرف لغوی اور عمومی معنوں میں جس سے ان کی ثقاہت اور عدالت پر کوئی دھبہ نہیں لگ سکتا اور اسی لیے وہ ان کی روایت کی تصحیح اور تحسین کرتے ہیں۔ مگر مبارکپوری صاحبؒ[1]

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہیں کہ امام یحییٰ بن سعیدؒ پختہ کار محدث تھے اور بہت کم خطا ان سے سرزد ہوتی تھی۔ مگر باوجود اس کے چند حدیثوں میں ان سے بھی خطا ہوئی ہے۔ آگے فرماتے ہیں: ومن یعری من الخطاء و التصحیف (بغدادی جلد ۱۴ صـ۱۴۰) یعنی متن اور سند میں خطا سے کون محفوظ رہ سکتا (بلکہ سکا) ہے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ابو الحسن القطانؒ نے ہشامؒ بن عروہؒ اور سہیلؒ بن ابی صالحؒ پر جو تخلیط کا الزام لگایا ہے وہ باطل ہے۔ ہاں ان کے حافظہ میں کچھ نقص ضرور پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن کیا وہ نسیان سے معصوم تھے؟ پھر کیا ہوا؟ کیا اس قسم کا وہم امام مالکؒ، امام شعبہؒ اور امام وکیعؒ وغیرہ اکثر ائمہ اور ثقات کو پیش نہیں آتا رہا؟ تو کیا ان کی روایتیں رد کر دی جائیں گی؟ خبط چھوڑ دے اور ائمہ ثقات سے بدظنی نہ کر (میزان الاعتدال جلد ۲ صـ۲۵۵)

محدث عقیلیؒ نے امام علیؒ بن المدینی پر جرح کی تھی۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں:

فمالك عقل یا عقیلی اتدری فی من تکلم۔ — یعنی اے عقیلیؒ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کس امام میں کلام کر رہا ہے۔

پھر آگے جوشِ تحریر میں آ کر عقیلیؒ سے ملتی جلتی عقل والوں کو الٹی میٹم کرتے ہیں۔

وانما اشتہی ان تعرفنی من ھو الثقۃ الثبت الذی ما غلط۔ — میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے تم کسی ایسے ثقہ کا نام تو ذرا ہمت کر کے پیش کرو جس سے غلطی سرزد نہ ہوئی ہو۔

(میزان جلد ۲ ص ۲۳۱)

اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی غلطی کا ہو جانا یہ کوئی ایسا اعتراض نہیں جس سے حدیث ضعیف ہو جاتے پس یہ حدیث صحیح ہے ..... الخ صـ۳۰۷۔

اگر وہم اور اختلاط کی مزید تحقیق مطلوب ہو تو فتح المغیث صـ۱۳ وغیرہ اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس قاعدہ سے غافل اور بے خبر ہیں اور خواہ مخواہ ان کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

دوسرا اعتراض: مبارکپوریؒ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اسرائیلؒ بن یونسؒ نے ابو اسحاق السبیعیؒ سے روایت کی ہے اور ان سے اسرائیلؒ کی سماعت اختلاط کے بعد ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ روایت قابل توجہ نہیں (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۷)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔ **اوّلاً** - اس لیے کہ ابو اسحاقؒ اس اصطلاحی تخلیط کا تو کبھی شکار ہی نہیں ہوئے جس کے سبب ان کی روایت کمزور اور ضعیف سمجھی جا سکے اور ان کے معمولی وہم اور تغیرِ حفظ سے ان کی حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے اگر اسرائیلؒ کی سماعت ابو اسحاقؒ کے لغوی اختلاط یا نقص حفظ کے بعد بھی ہو تو اس کا اثر اور فرق کیا نکلے گا؟ **ثانیاً** - امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ ابو اسحاقؒ کے جملہ تلامذہ میں اسرائیلؒ ابو اسحاقؒ کی روایتوں میں اصح اثبت اور احفظ واقع ہوئے ہیں (جلد ۱ ص۱) امام ابن مہدیؒ کا بیان ہے کہ اسرائیلؒ کو اپنے دادا ابو اسحاقؒ کی جملہ روایتیں اس طرح یاد تھیں جیساکہ مسلمانوں کو سورۂ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۱) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ اسرائیلؒ صحیحین کے راوی ہیں۔ وھو فی الثبت کالاسطوانۃ۔ یعنی وہ حدیث کے بیان کرنے میں ایسے مضبوط تھے، جیسے ستون۔ البتہ ہاں امام شعبہؒ ان سے زیادہ ثبت تھے لیکن ابو اسحاقؒ سے روایت کرنے میں اسرائیلؒ امام شعبہؒ سے بھی زیادہ ثبت تھے۔ (میزان جلد ۱ ص ۹۸) اور تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص۳۵۴ میں ایک حدیث کے بارے میں جس میں اسرائیل عن ابی اسحاقؒ ..... الخ ہے فرماتے ہیں اسناد قوی امام دارقطنیؒ

لہ حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کی ایک جگہ تصحیح (فتح الباری جلد ۵ ص ۲۶۹) اور دوسری جگہ تحسین کی ہے (جلد ۲ ص ۱۲۵) اور مبارک پوری صاحبؒ کی بڑی ہی سعادت ہے کہ ان کو حافظ صاحب کی صرف تحسین ہی ملی ہے اور اس پر بھی وہ بڑے ناراض ہیں۔ اگر ان کی تصحیح بھی مل جاتی تو نہ معلوم ان پر کیا گذرتی؟ مگر ازراہ بزرگی یہ نہ سوچا کہ نہ ابو اسحاق رہ کی تدلیس مضر ہے اور نہ نقصِ حفظ اور تغیر کی وجہ سے ان کی حدیث ضعیف ہے بلکہ ان کی روایت اصولِ حدیث کے رُو سے بہر حال صحیح ہے۔ لا شک فیہ۔

کا بیان ہے کہ امام عبدالرحمٰنؒ بن مہدیؒ نے فرمایا کہ ابو اسحاقؒ کی روایتوں میں اسرائیلؒ امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ ثقہ تھے۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور تقریباً یہی مضمون حافظ ابن حجرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (درایہ ص ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق صاحبؒ اسرائیلؒ عن ابی اسحاقؒ ..... الخ کی روایات کے بارے میں یہ فیصلہ درج کرتے ہیں کہ کلہا صحیحۃ (التعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور حافظ ابن حجرؒ اسرائیلؒ عن ابی اسحاق .... الخ کی سند کی تصحیح کرتے ہیں۔[1] حافظ ابن القیمؒ، ابو اسحاقؒ کے تمام تلامذہ اور اصحاب میں اسرائیلؒ کو اتقن لکھتے ہیں۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۳۳۶) اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ مبارکپوری صاحبؒ نے تحقیق الکلام اور ابکار المنن میں جوش جوانی میں سب اناپ شناپ لکھ مارا ہے۔ لیکن جب تحفۃ الاحوذی لکھنے کی باری آئی اور عقل اور علم میں پختگی ہوگئی اور اپنی ذمہ داری کا گہرا احساس ہوا تو اس قاعدہ کے لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ اسرائیلؒ ابو اسحاقؒ سے روایت کرنے میں امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ قوی اور ثبت تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۱۷۱)

اب انصاف شرط ہے کہ ہم مبارکپوری صاحبؒ کی اس سے بڑھ کر اور کیا تسلی کر سکتے ہیں؟

وثالثاً۔ اس روایت میں اسرائیلؒ کے ایک اور ثقہ اور ثبت متابع بھی موجود ہیں، جن کا نام زکریاؒ بن ابی زائدہؒ ہے۔ چنانچہ عبداللہؒ بن احمدؒ اپنے والد امام احمدؒ بن حنبلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ یحییٰ[2]

---

[1] مثلاً دیکھئے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۸ و جلد ۷ ص ۵۰ وغیرہ۔ اگر مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع کے نزدیک اسرائیلؒ عن ابی اسحٰقؒ ..... الخ کی سند ضعیف اور کمزور ہے تو از راہ کرم بخاری (مثلاً جلد ۱ ص ۵۶، ۱ ص ۲۲۹، ۱ ص ۳۷۱، ۱ ص ۳۹۴، ۲ ص ۵۷۹ و ۲ ص ۱۰۰۰ وغیرہ) اور مسلم کی تمام حدیثوں پر قلم پھیر دیں۔ کیونکہ ان میں ابو اسحاق کا اختلاط کارفرما ہوگا۔ قاضی مقبول احمد صاحب ان کو نسیان کا مرض لگا کر وہمی قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے الاعتصام ص ۶، ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء) لہٰذا بخاری اور مسلم سے اس وہمی کی سب روایتیں نکال دیں۔ ملاحظہ کیجئے کہ غیر مقلدین کے تعصب اور گروہ بندی کی وجہ سے صحیحین کی کتنی احادیث غیر صحیح قرار پاتی ہیں۔ نعوذ باللہ تعالیٰ من شرور انفسنا۔

[2] اس سند کے باقی راویوں کی توثیق پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ یحییٰؒ بن ابی زکریاؒ کو حافظ ابن کثیرؒ من الائمۃ الثقات لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۸۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثبت، المتقن اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ (تقریب ص ۳۹۱)

بن ابی زکریاؒ سے اور وہ زکریا بن ابی زائدہؒ سے اور وہ ابو اسحاق السبیعیؒ سے اور وہ ارقمؒ بن شرحبیلؒ سے اور وہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے حدیث کا وہی مضمون ہے جو پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۱) جب اسرائیلؒ خود اوثق اور اثبت ہیں اور ان کا متابع بھی ثقہ اور ثبت ہے تو پھر ان کی روایت کیوں صحیح نہیں ہے؟ الغرض نہ تو یہ روایت شاذ ہے جیسا کہ الاعتصام ۱۶ر نومبر ۱۹۶۲ء ص ۵ میں اس پر بلا وجہ زور لگا تعصب کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور نہ یہ مرجوح اور بخاری کی روایت راجح ہے۔ راجح اور مرجوح کا سوال تعارض کے وقت ہوتا ہے۔ جب دونوں میں تعارض ہی نہیں تو راجح و مرجوح کا سوال بالکل بیکار ہے دونوں صحیح ہیں۔ ایک مجمل ہے اور دوسری مفصل ہے جس میں زیادت ثقہ ہے۔ جو باتفاق جملہ محدثین کرامؒ قابل قبول ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا شاہد:

اسدؒ بن موسیٰؒ اپنی کتاب فضائل صحابہؓ میں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہؒ نے بیان کیا۔ وہ

---

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو صداقت شعار مشہور اور حافظ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۳۴۹) امام عجلیؒ ابو زرعہؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ یعقوبؒ بن سفیانؒ اور ابو بکر البزارؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام قطانؒ ان کو لا بأس بہ اور ابن معینؒ صالح کہتے ہیں امام احمدؒ ان کو ثقہ اور حلو الحدیث، اور علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۳) غرضیکہ اس سند کے بھی جملہ رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں۔

[۲] امام بخاریؒ اسدؒ بن موسیٰؒ کو مشہور الحدیث اور امام نسائیؒ اور ابن یونسؒ ثقہ کہتے ہیں۔ خلیلیؒ ان کو صالح کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶) مولانا شمس الحق صاحبؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے (التعلیق المغنی جلد ۱ ص ۵) امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں اسدؒ بن موسیٰؒ ہے علیٰ شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (المستدرک مع التلخیص جلد ۳ ص ۲۹۳)

[۳] مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مجھے کتب اسماء الرجال میں ان کا پتہ نہیں مل سکا۔ نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ اگر ایسے مشہور اور ثقہ محدث کا پتہ بھی مبارکپوری صاحبؒ کو نہیں مل سکا تو ان کو کیا ملے گا؟ ان کا نام محمدؒ بن خازمؒ اور لقب ضریر تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد مشائخ الحدیث الثقات المشہورین لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۲۵) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الائمۃ الاعلام الثقات (میزان جلد ۳ ص ۲۸۲) اور ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۹۹) امام عجلیؒ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

عبداللہ الرحمن بن ابی بکرؒ سے اور وہ ابن ابی ملیکہؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کا بعینہٖ مضمون وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں گذر چکا ہے (حافظ بدرالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۴۷ میں نقل کیا ہے)

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے کیونکہ پیش کردہ سندوں میں عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ..... الخ ہے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) یعقوبؒ بن سفیانؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو صدوق کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۳۷) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص ۳۱۸) علامہ خطیبؒ نے ان کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے (بغدادی جلد ۵ ص ۲۴۲)

۱؎ جمہور محدثینؒ واقعی ان کی تضعیف کرتے ہیں مگر ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں لکھی جا سکتی ہیں۔ امام ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان میں ضعف ہے مگر قابل برداشت ہے۔ فیہ ضعف یحتمل۔ ابن حبانؒ ان کی توثیق کی طرف مائل ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ینفرد عن الثقات ما لا یشبہ حدیث الاثبات یعنی وہ ثقہ راویوں سے ایسی روایات میں منفرد ہوتے ہیں جو اثبات یعنی ثقہ اور ثبت راویوں کی روایات کے مشابہ نہیں ہوتیں کم ہوتی ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۴۶) امام ابن معینؒ نے ان کو ضعیف ابو حاتمؒ نے لیس بقوی فی الحدیث اور نسائیؒ نے لیس بثقہ اور متروک الحدیث کہا ہے لیکن مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۷ و ص ۴۸ میں الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ جرح مفسر نہیں اور عام فقہاءؒ اور محدثینؒ کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں۔ (محصلہ) البتہ امام بخاریؒ اور امام احمدؒ نے اس راوی کو منکر الحدیث کہا ہے۔ (تہذیب جلد ۶ ص ۱۴۶) لیکن مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اگر امام بخاریؒ کسی راوی کو منکر الحدیث کہیں تو اس سے روایت کرنا ان کے ہاں جائز نہیں۔ امام احمدؒ اور اس قسم کے لوگ کسی کو منکر کہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۴۹) اور ہم نے تو ان کو صرف شاہد کے طور پر پیش کیا ہے نہ کہ بطور احتجاج کے۔ اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام میں لکھتے ہیں کہ ان (آثار) کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۲۱۶)

۲؎ ذہبیؒ ان کو امام فقیہ حجت فصیح اور بلند مرتبہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۶)

اور مسند بزار[۱] کی روایت میں عن ابن عباسؓ عن ابیہ العباسؓ عن النبی ﷺ ...... الخ اس لیے یہ روایت قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص محصلہ)

جواب: مبارکپوری صاحبؒ کو لفظ اضطراب تو آتا ہے، مگر افسوس کہ وہ حقیقتِ اضطراب سے ناواقف ہیں۔ محدثین کرامؒ کے نزدیک اضطراب کی چند شرطیں ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ دونوں سندیں ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہوں ورنہ اضطراب نہ ہوگا صحیح قابلِ اخذ ہوگی اور ضعیف قابلِ رد ہوگی۔ (دیکھیے شرح نخبۃ الفکر ص۴۱ وغیرہ) اور ہم نے حضرت ابن عباسؓ رض[۲] کی جو سندیں بیان کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے اور مسند بزارؒ کی روایت میں قیس بن ربیع واقع ہے۔ امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ امام وکیعؒ ان کو ضعیف کہتے تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۲۶) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث لکھتے ہیں (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۱) امام ابو حاتمؒ اور امام یحییٰؒ اس کو لیس بالقوی اور ضعیف کہتے تھے۔ امام احمدؒ اس کو کثیر الخطاء اور ابن مدینیؒ و دارقطنیؒ اس کو ضعیف کہتے تھے (میزان الاعتدال جلد ۲ ص) اور لطف یہ ہے کہ خود

---

[۱] یہ روایت نصب الرایہ جلد ۲ ص۵ میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹، اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۵۳ وغیرہ میں بھی آتی ہے۔

[۲] اگر کوئی صاحب حضرت ابن عباسؓ کی کم سنی کا بہانہ کرتے ہوئے ان کی روایت کے مرسل ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ بھی باطل ہوگا کیونکہ اگر بالفرض حضرت ابن عباسؓ کی روایت مرسل بھی ہو، تب بھی حضرات صحابہؓ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں، جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر بیان ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ بریں اس میں قدرے اختلاف ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر دس سال تھی یا پندرہ؟ مسند احمد جلد ۱ ص ۳۳۷ میں اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۳۴ میں بسند قوی اور صحیح یہ روایت موجود ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ان کی عمر پندرہ برس کی تھی اور اسی کو امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۹۶) وغیرہ نے ترجیح دی ہے اور یہ روایت مرض الموت کی ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کم سنی وغیرہ کے بہانے سے ان کی روایت کو مرسل قرار دینا مردود اور باطل ہوگا اور بخاری جلد ۲ ص ۷۵۳ کی روایت سے آپ کی وفات حسرت آیات کے وقت ان کی عمر دس سال ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مُبارک پوری صاحبؒ بھی اس کو ضعیف اور کمزور بتاتے ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵) اس لیے اس حدیث کے اضطراب کا دعویٰ قطعاً مردود اور باطل ہے۔ یہ حدیث بلاچون وچرا صحیح ہے۔ البتہ لاتسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔

چوتھا اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں (اور اسی کو مؤلف خیر الکلام نے دوہرایا ہے ملاحظہ ہو ص ۲۶۴) کہ اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی اور مع ہٰذا آپ کی نماز درست ہوگئی بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ نماز پوری کیے بغیر حجرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ تو یقیناً آپ نے وہاں نماز مکمل کی ہوگی اور اس دعویٰ پر یہ حدیث نقل کی ہے:

فما قضیٰ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصّلوٰۃ حتیٰ ثقل فخرج یہادی بین الرجلین۔

پس آپ نے ابھی نماز مکمل نہ کی تھی کہ آپ کے مرض میں اضافہ اور تیزی ہوگئی۔ سو آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد سے باہر تشریف لے گئے۔

اس میں حرف فار ہے جو تعقیب بلا مہلہ کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اس روایت سے ترک قرأت

لہ یہ روایت مشکل الآثار جلد ا صـ اور المختصر صـ۴۹ وطحاوی جلد ا صـ۲۳۵ وغیرہ میں مروی ہے اور سنن الکبریٰ جلد ۲ صـ۸۱ کے الفاظ یہ ہیں فما قضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ حتیٰ ثقل جدًّا فخرج یہادی بین الرجلین وان رجلیہ لتخطان الارض فمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یوص۔ سو آپ نے نماز پوری نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ آپ پر بیماری کا غلبہ ہو گیا۔ پس آپ دو آدمیوں کے سہارے سے تشریف لے گئے اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ پس آپ کی وفات ہوگئی اور آپ نے کوئی وصیت نہ کی۔ فمات میں بھی حرف فاء ہے۔ کیا مبارک پوری صاحبؒ کی تحقیق میں مسجد سے نکلنے کے فوراً بعد آپ کی وفات ہوگئی تھی۔ یا چار پانچ دن کے بعد وفات ہوئی تھی؟ (دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۵ صـ۲۲۵ وغیرہ) اگر ان کے نزدیک ہر مقام پر حرفِ فار تعقیب بلا مہلہ کے لیے آتا ہے تو وہ اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا الآیۃ میں اور اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ میں اور اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلَی الْمَیِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَہُ الدُّعَاءَ میں اور تزوج فلان فولد لہ وغیرہ وغیرہ مقامات میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟ اور اگر ان مقامات میں حرف فاء تفصیل کے لیے ہے یا کسی اور مناسب

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

سُورۂ فاتحہ کا مسئلہ اور بصورت ترک تکمیلِ نماز کا ادعا صحیح نہیں ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۱۱)

جواب: مُبارک پوری صاحبؒ کا یہ دعوٰی کرنا کہ آپ نماز کی تکمیل کے بغیر مسجد سے باہر نکل کر تشریف لے گئے تھے نہ معلوم کس بات پر مبنی ہے؟ اِس دعوٰی کا ثبوت تو کسی روایت سے نہیں مل سکتا۔ اس روایت سے تو اتنا ہی ثبوت ملتا ہے کہ نماز کی تکمیل سے قبل ہی آپ پر بیماری کا زور ہو گیا۔ اور اگر فخرج میں حرف فاء کو مبارکپوری صاحبؒ تعقیب بلامہلہ کے لیے سمجھتے ہیں اور اس پر اپنے دعوٰے کی بنیاد رکھتے ہیں تو یہ ان کو سراسر مضر پڑے گا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ علاوہ بریں اس کی تصریح موجود ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ نماز ہی پوری کی، بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ کو نماز کے بعد خطاب بھی فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں یوں الفاظ آتے ہیں: فصلّٰی لھم وخطبھم (بخاری ۲ ص۸۵۱) آپ نے حضرات صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی اور ان سے خطاب فرمایا

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

ثم خرج الی الناس فصلّٰی لھم وخطبھم۔ (بخاری ۲ ص۶۳۹ و فتح الباری) پھر آں حضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم (اپنے حجرہ سے) لوگوں کی طرف نکلے ان کو نماز پڑھا کر ان سے خطاب

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) معنٰی میں مستعمل ہوا ہے تو فخرج میں حرف فاء سے کوئی ایسا مناسب اور موزوں معنٰی کیوں نہیں لیا جاسکتا تاکہ دوسری صحیح روایات سے تعارض پیدا نہ ہو اور اگر مبارکپوری صاحبؒ اس پر بضد ہیں کہ حرف فاء تعقیب بلامہلہ کے لیے ہی ہوتا ہے تو کامیابی پھر بھی جمہور کی ہو گی۔ کیونکہ قرآن کریم کی آیت واذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ... الاٰیۃ اور حدیث اذا قرأ الامام فانصتوا میں بھی ان کے اصول کے تحت حرف فاء تعقیب بلامہلہ کے لئے ہو گا۔ اور مطلب یہ ہو گا کہ امام کی قرأت شروع کرنے کے فوراً بعد مقتدیوں پر استماع اور انصات واجب ہے۔ اور سبھی جانتے ہیں کہ امام کی قرأت سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ ما زاد علی الفاتحہ سے۔ لہٰذا مقتدیوں پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ممنوع ٹھہرا۔ اور قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر محمول کرنے کی رٹ باطل ہو گئی ؎

خوش نوایانِ چمن کو غیب سے مژدہ ملا — دام میں صیاد اپنے مبتلا ہونے کو ہے

جلد ۱۰ ص ۱۴۰ و عمدۃ القاری جلد ۱۰ ص ۱۷۱) فرمایا۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے جماعت کے ساتھ نماز کی تکمیل کی۔ اور پھر حضرات صحابہ کرامؓ سے خطاب بھی کیا۔ اور جو روایت مبارکپوری صاحبؒ نے پیش کی ہے۔ اس سے ان کا مدعیٰ ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ تکمیل نماز سے قبل ہی آپ کا مرض بڑھ گیا تھا۔ اور اس کا کون منکر ہے؟ اور نماز اور خطاب سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ دو آدمیوں کے سہارے سے جیسے تشریف لائے تھے۔ ویسے ہی واپس تشریف لے گئے۔ اگر مبارک پوری صاحبؒ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بحالت نماز مرض بڑھ نہیں سکتا یا تکمیل نماز کے بغیر ہی دو آدمیوں کے سہارے پر گھر جانا ہی متحقق ہو سکتا ہے۔ تو ہماری بلا سے مبارک پوری صاحبؒ جانیں اور ان کی سمجھ۔ بہر صورت مسئلہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری با جماعت نماز میں سورۃ فاتحہ مکمل یا اس کا اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا۔ معہذا آپؐ کی نماز صحیح ہو گئی تھی۔ وہو المطلوب۔

پانچواں اعتراض: مولوی محمد صادق صاحب سرگودھوی (غیر مقلد) لکھتے ہیں کہ اگر آپؐ نے امام ہونے کے باوجود سورۃ فاتحہ ترک کی تو حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ امام پر سورۃ فاتحہ واجب ہے تو حنفیہ کا اعتراض جیسا کہ اہل حدیث پر ہے۔ ویسا ہی ان حنفیوں پر بھی ہے۔ (خیر الکلام ص ۶۰)

جواب: یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فقہائے حنفیہ کی کتابیں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ورنہ وہ اس قسم کی سطحی بات ہرگز تحریر نہ کرتے۔ علماء احناف کے نزدیک سورۃ فاتحہ کی قرأۃ اس امام پر ضروری ہے جو اول سے آخر تک امامت کا فریضہ ادا کر رہا ہو۔ اگر کسی نے اس حالت میں امام کی اقتدا کی ہو۔ کہ امام سورۃ فاتحہ پڑھ چکا ہو یا رکوع کے لیے سر جھکا چکا ہو۔ اور امام کو حدث کو لاحق ہو گیا ہو تو ایسے مقتدی کو امام اپنا نائب اور خلیفہ بنا سکتا ہے اور ایسے نائب امام کی نماز بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی جائز اور صحیح ہے۔ اور رکوع کی حالت میں بھی مسبوق کو نائب اور خلیفہ بنانا جائز ہے۔ (دیکھئے ہدایہ جلد ۱ ص ۱۱۰ وغیرہ) اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی اور بعد کو آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا تھا جیسا کہ اس کی پوری تشریح

پہلے ہو چکی ہے۔ لہٰذا حنفیوں پر تو مطلقاً اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانیوالے اور صَلُّوا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِىْ اُصَلِّىْ کی حدیث پر عامل ہونے کے مدعی اس صحیح حدیث سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور شاید کہ تا قیامت ہو بھی نہ سکیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیگر صحیح قولی احادیث کی طرح آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اس صحیح اور فعلی حدیث سے بھی یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آخری باجماعت نماز بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے بھی درست اور صحیح ہو گئی تھی اور یہی جمہور اہل اسلام کا مسلک ہے اور آپ کے آخری فعل کے حق اور درست ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے بعد نسخ کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ازراہ انصاف خدا تعالیٰ سے ڈر کر فریق ثانی کو اپنے اس فتویٰ پر نظر ثانی کرنی چاہیے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس آخری عمل کے پیش نظر یہ فتویٰ کس بے باکی اور جسارت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیاں اور لغزشیں معاف کرے۔

گیارھویں حدیث: امام احمدؒ بن منیعؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق[1] ازرقؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوریؒ اور شریکؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ دونوں روایت

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۹)

[2] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۳۲۵) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۴) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد الائمۃ الحدیث لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۲۷)

[3] سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور شریکؒ ان کے متابع ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الصادق اور احد الائمۃ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۹۶) نیز لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ الاعلام، حسن الحدیث، امام، فقیہ اور کثیر الحدیث تھے وحدیثہ من اقسام الحسن (تذکرہ ۱ ص ۲۱۴) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ مامون اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۳۶) یہ یاد رہے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کرتے ہیں موسیٰ بن ابی عائشہؒ[1] سے۔ وہ عبد اللہؒ[2] بن شدادؓ سے اور وہ حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (بحوالہ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے امام کی اقتدا کی تو امام کی قرأۃ مقتدی کو بس ہے۔

اس روایت[3] میں جہری اور سری نماز کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اپنے عموم پر ہے کیونکہ اس میں حرف مَنْ شرطیہ ہے جو عموم کے لیے ہے۔ بخلاف لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ کے کہ وہاں حرف من موصولہ یا موصوفہ ہے جس میں عموم وخصوص دونوں آ سکتے ہیں۔ اور اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے جب کسی نے اقتدا اختیار کر لی ہو تو مقتدی کو جدا اور الگ قرأت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ امام کا پڑھنا گویا مقتدی کا پڑھنا ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہم نے شریکؒ کو صرف متابع کے طور پر پیش کیا ہے۔ استدلال امام سفیان ثوریؒ سے ہے جو ثقہ اور ثبت تھے۔ (ترجمان الحدیث ص ۲۱ ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں تضدات کے چند نمونے کا عنوان قائم کر کے اور ہماری اس عبارت سے لفظ متابع ہضم کر کے جو اعتراض کیا ہے، علمی طور پر خالص بد دیانتی ہے۔ ہم نے سفیان ثوریؒ کو ان کا متابع نہیں بتایا بلکہ ان کو سفیان ثوریؒ کا متابع کہا ہے مگر مضمون نگار نے ص ۲۲ میں دجل کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں جبکہ سفیان ثوریؒ اس کا متابع موجود ہے۔

[1] امام حمیدؒ ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۵۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ۳۶۷) امام بخاریؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۲ ص ۳۳۷)

[2] یہ حضرت ام المومنین میمونہؓ کے بھانجے تھے (بخاری جلد ۱ ص ۴۷ و ۴۲) حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا تولد ہوا تھا۔ امام عجلیؒ، خطیبؒ، ابو زرعہ، نسائی، ابن سعدؒ اور واقدیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲)

[3] یہ روایت شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۷، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۴، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۲۸، ابکار المنن ص ۱۹۰، فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۳، حاشیہ طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸، اعلاء السنن جلد ۴ ص ۹۳ اور بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۸ وغیرہ کتابوں میں اجمالاً وتفصیلاً نقل کی گئی ہے۔

اور ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت میں فریق ثانی کا کلی اتفاق ہے کہ اس میں امام کی قرأت مقتدی کی قرأت سمجھی جائے گی اور مقتدی پر الگ قرأت لازم نہیں ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اور باقی سب راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ نے اپنی افتاد طبع کے تحت گو آئیں بائیں شائیں سے کام لینے اور گلو خلاصی کی ناکام کوشش کی ہے، لیکن اتنی بات تسلیم کیے بغیر وہ کوئی مفر نہیں پاتے کہ بظاہر صحیح[1] ہے کیونکہ موصول بھی ہے۔ اس کے تمام روات بالاتفاق ثقہ بھی ہیں اور کوئی علت قادحہ بھی بظاہر اس میں نہیں پائی جاتی .... الخ (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸)

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب تمام راوی ثقہ ہیں اور سند بھی موصول ہے۔ اور بظاہر کوئی علت قادحہ بھی اس میں پائی نہیں جاتی۔ تو مبارکپوری صاحب جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ اور یا صحیح تسلیم کرتے ہوئے۔ اس کا کوئی معقول جواب دیتے۔ مگر چونکہ اپنی رائے کو ترک نہیں کرنا۔ اس لیے ان حضرات کی طرف سے صحیح حدیث کو معلول ٹھہرانے کی کوشش اور سعی کی گئی ہے۔ مبارک پوری صاحبؒ نے جو کچھ کہا اس کو آپ پڑھ لیں اور ساتھ ساتھ جواب بھی ملاحظہ کرتے جائیں۔

پہلا اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں (اور یہی اعتراض خیر الکلام از ص ۴۷۱ تا ۴۷۵ میں پانی کی طرح بلویا گیا ہے) کہ یہ روایت مرفوع نہیں ہے اور اس کی دلیلیں یہ ہیں:

(۱) اگر یہ طریق مرفوع ہوتا۔ تو محدثین کرامؒ، امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ اور جریرؒ کو امام ابو حنیفہؒ کا مخالف ہرگز نہ بتاتے۔

(۲) اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو امام طحاویؒ، علامہ ماردینیؒ، حافظ زیلعیؒ اور محدث عینیؒ وغیرہ محل احتجاج میں ضرور اس کو پیش کرتے۔

(۳) حافظ ابن ہمامؒ نے مسند احمدؒ بن منیعؒ کے جس نسخہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے عبداللہؓ بن شدادؓ کے بعد عن جابرؓ کا جملہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اور

---

[1] نواب صدیق حسن خان صاحبؒ مسند احمد بن منیع کے طریق سے دو سندوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والاسناد الاول صحیح علی شرط الشیخین والثانی علی شرط مسلم اھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۲)

حقیقت میں یہ روایت مرسل ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸ وابکار المنن ص۱۶۱)

جواب: مبارکپوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ بمعہ پیش کردہ دلائل کے از سرتاپا لغو اور بیہودہ ہے۔ یہ روایت مرفوع ہے مرسل نہیں ہے، ترتیب وار ہر شق کا جواب ملاحظہ کیجئے:

پہلی شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ جریرؒ، سفیانؒ اور شریکؒ وغیرہ امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کرتے ہوئے اس کو مرسل روایت کرتے ہیں باطل ہے، چنانچہ علامہ آلوسیؒ ان کی روایت کو کئی سندات کے ساتھ نقل کر کے لکھتے ہیں۔ (علامہ آلوسیؒ ثقہ ناقل ہیں ان کو متاخر آدمی کہکر ٹال دینا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص۲۷۳ میں کیا ہے نرے تعصب پر مبنی ہے اور اہل علم کی شان کے لائق نہیں ہے)

فھولاء سفیانؒ وشریکؒ وجریرؒ وابو الزبیرؒ رفعوہ بالطرق الصحیحۃ فبطل عدھم فیمن لم یرفعہ۔ (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۲)

سو یہ امام مثلاً سفیان ثوریؒ، شریکؒ، جریرؒ اور ابو الزبیرؒ (وغیرہ) صحیح اسانید کے ساتھ اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس کو مرفوع روایت نہیں کیا۔ ان کا قول سراسر باطل ہے۔

اور اسی طرح فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹ میں بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام بیہقیؒ، دارقطنیؒ اور ابن عدیؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کہ اس روایت کو تنہا حضرت امام ابوحنیفہؒ ہی مرفوع بیان کرتے ہیں اور اس رفع میں ان کا اور کوئی ساتھی نہیں محض باطل ہے اور امام ابوحنیفہؒ سے اس روایت کو نقل کرنے والے بھی اس کو مرفوع ہی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں:

ھذا حدیث رواہ جماعۃ من اصحاب ابی حنیفۃؒ موصولاً وخالفھم عبداللہ بن المبارکؒ الامام فرواہ عنہ مرسلاً۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۱)

امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب اور تلامذہ میں سے ایک بہت بڑی جماعت نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے لیکن امام عبداللہ بن مبارکؒ اس کو مرسل روایت کرتے ہیں۔

اسحٰق ازرقؒ، ابو یوسفؒ اور یونسؒ بن بکیرؒ وغیرہ کی روایتیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲ اور ص ۱۲۳ میں مذکور ہیں اور محمد بن الحسنؒ، محمد بن الفضلؒ البلخیؒ، سلیم بن مسلمؒ، مکی بن ابراہیمؒ، علی بن یزید الصدائیؒ

اور مروانؒ بن شجاعؒ کی روایتیں عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ الاحکام لمذہب ابی حنیفہؒ میں مذکور ہیں۔ (کذا فی الدلیل المبین ص ۹۵ لمولانا المحدث محمد حسن فیض پوریؒ) لہٰذا اسحاق ازرقؒ کی روایت کو شاذ، غلط اور ضعیف قرار دینا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۲۷۲ و ۲۷۳) محض بے بنیاد امر اور نرا باطل دعویٰ ہے۔ علاوہ ازیں مؤلف خیر الکلام خود ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرد کوئی مضر نہیں ہوگا..... الخ ص ۲۸۸ اور اسحٰق ازرقؒ تو چوٹی کے ثقہ اور ثبت ہیں۔ پھر تفرد کا ناکام بہانہ کون سنتا ہے اور کون ان کی اس صحیح زیادت کو شاذ مانتا ہے؟

اور دوسرے مقام پر امام بیہقیؒ لکھتے ہیں:

وھکذا رواہ جماعۃ عن ابی حنیفۃؒ موصولاً۔ (سنن الکبریٰ ج ۲ ص ۱۵۹)

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے ایک بڑی تعداد نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے۔

اور نواب صدیق حسن خانؒ لکھتے ہیں کہ

وبالجملہ ایں حدیث بطرق متعددہ ارسالاً و رفعاً مروی شدہ ودروی دلالت است برآنکہ مؤتم در پس امام فاتحہ نخواند زیرا کہ قرأتِ امام قرأتِ مؤتم است اھ (ہدایت السائل ص ۲۰۷)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مرسلاً اور مرفوعاً مروی ہے اور اس میں دلیل ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے ... الخ

پہلے اس کی تحقیق گزر چکی ہے کہ ثقہ راوی کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے۔ خواہ وہ زیادت متنِ حدیث میں ہو۔ خواہ سند میں اور جب حدیث کے مرفوع اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو وہ حدیث جمہور علماء کے نزدیک مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ نیز مثبت کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ اگر بالفرض اس زیادت کو تنہا حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی بیان فرماتے۔ تب بھی حضرات محدثین کرامؒ کے طے شدہ اصول اور ضوابط کے تحت یہ روایت مرفوع اور موصول ہی ہوتی حالانکہ جریرؒ، سفیانؒ، شریکؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ سب ثقہ راوی اس کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک بڑی جماعت اس کو مرفوع اور موصول ہی روایت کرتی ہے۔ امام ابن مبارکؒ چونکہ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں اور دوسرے اس کو مرفوع

بیان کرتے ہیں۔ اس لیے قاعدہ کے مطابق مرفوع اور متصل ہی کو ترجیح ہے۔ نہ کہ اس کے مرسل ہونے کو علاوہ ازیں خود امام ابن مبارکؒ کا بیان ہے کہ جب امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میرا قول بھی وہی ہو گا (تبییض الصحیفہ ص۱۷) اور امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ دونوں اس روایت کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام حاکمؒ علامہ شمس الدین ابن قدامہؒ، علامہ ماردینیؒ، حافظ ابن ہمامؒ، ملا علی القاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ اس روایت کو مرفوع ہی نقل کرتے ہیں۔ اور یہ مثبت بھی ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں :

فقول ہؤلاء العارفین مقدم علیٰ من لم یعرف۔ (ابکار المنن ص۱۳۸) سو ان جاننے والوں کی بات نہ جاننے والوں کی بات سے بہرحال مقدم ہے۔

اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کے اعتراض کی یہ شق قطعاً باطل اور مردود ہے اور اسی طرح مؤلف خیر الکلام (ص ۴۷۳) کا اس کے جواب سے عاجز ہو کر اس کو مصادرہ علی المطلوب کہہ کر گلو خلاصی کرنا بے معنی بات ہے کیونکہ دعوے یہ ہے کہ عن جابرؓ کا جملہ مسند احمدؒ بن منیعؒ میں مذکور ہے اور دلیل یہ ہے کہ یہ مسلّم ثقات اس کو اسی طرح نقل کرتے ہیں۔ اگر مؤلف مذکور کا یہ خانہ ساز مصادرہ مضر ہے تو تمام کتبِ حدیث میں یہ جاری ہے کما لا یخفیٰ تو پھر کوئی روایت صحیح نہیں ہو سکتی بھلا ایسے ناکام بہانوں سے صحیح حدیث ضعیف قرار دی جا سکتی ہے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔

دوسری شق کا جواب : جمہور اہلِ اسلام کے پاس قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں موجود ہیں۔ لہٰذا اگر امام طحاویؒ وغیرہ ائمہ نے حضرت جابرؓ کی یہ روایت اپنے استدلال میں پیش نہیں کی۔ تو کیا بغیر اس روایت کے ان کی ضرورت اور حاجت پوری نہیں ہو سکتی تھی؟ اور کیا ان کے دعوے کی صرف یہی ایک حدیث دلیل رہ گئی تھی کہ بغیر اس کے بیان کرنے کے ان کا دعویٰ ناکام اور تشنہ رہتا؟ ہاں جہاں اور حدیثیں موجود ہیں۔ وہاں ان کی دلیل ایک یہ حدیث بھی ہے اور فرض کر لیجیے کہ ان حضرات کو مسند احمدؒ بن منیعؒ کی سند سے اس روایت کا علم ہی نہ تھا تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سرے سے یہ حدیث ہی نہ ہو؟ کسی حدیث کا کسی موقع پر بیان نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل کیسے بن گئی؟

علاوہ ازیں امام ابن قدامہؒ، ماردینیؒ، ابن ہمامؒ، مُلّا علی قاریؒ اور آلوسیؒ وغیرہ باقاعدہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو مرفوع اور موصول ہی سمجھتے ہیں اور اسی طرح اس کو نقل بھی کرتے ہیں۔

مؤلف خیر الکلام ص ۲۷۳ میں (وبنحوہ فی ص ۲۳۸) لکھتے ہیں کہ باقی رہا ارسال اور وصل کا اختلاف اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ راوی اسے مختلف حالات کی بنا پر کبھی متصل بیان کر دیتے ہیں اور کبھی مرسل۔ یہ اختلاف کوئی مضر نہیں۔ ثقہ کی زیادتی اس جگہ قابل قبول ہے۔ انتہٰی اور یہی ہم کہتے ہیں۔

تیسری شق کا جواب: اگر مسند احمدؒ بن منیعؒ کے نسخہ میں جو حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک متداول کتاب تھی۔ کاتب نے عن جابرؓ کے الفاظ زیادہ کر دیئے تھے تو نہ معلوم بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد اور دیگر حدیث کی کتابوں میں کاتبوں نے کیا کچھ شگوفے کھلائے ہوں گے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ انھوں نے حذف و اضافہ اور قطع و برید کر کے اصل مضمون کو کیا سے کیا کر دیا ہوگا؟ پھر حدیث کی کتابوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اور شاید اسی بداعتقادی کی وجہ سے بیشتر غیر مقلد حضرات (مثلاً عبد اللہ چکڑالوی، اسلم جیراجپوری، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر احمد الدین وغیرہ) انکار حدیث کے فتنہ میں گرفتار اور مبتلا ہوتے ہیں۔ اور شاید تصحیح حدیث کی یہ شرط ہو کہ اگر مبارکپوری صاحبؒ اور ان کی جماعت کسی حدیث کو صحیح قرار دیں تو صحیح ہوگی۔ ورنہ اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

محترم جب سند کے تمام راوی بالاتفاق ثقہ اور ثبت ہیں۔ اور بظاہر اس میں کوئی علت قادحہ بھی نہیں اور موصول بھی ہے تو بلاوجہ محض ہوائے نفسانی کے لیے کاتب بیچارے پر کیوں ایسا سنگین الزام عائد کیا جاتا ہے؟ اور کیوں طے شدہ قواعدؒ اور اصول سے انحراف کیا جاتا ہے؟ فتح الباری کے حوالہ سے

لہ مثلاً یہ کہ سند کے جملہ روات بالاتفاق ثقہ ہیں۔ سند موصول ہے۔ بظاہر اس میں کوئی علت قادحہ بھی نہیں پائی جاتی۔ ثقہ کی زیادت مقبول ہوتی ہے۔ موصول اور مرسل کے جھگڑے میں حدیث مرفوع ہی سمجھی جائیگی۔ مثبت کو نافی پر ترجیح ہوتی ہے، عدم علم عدم شے کی دلیل نہیں ہوتی۔ عارف کے قول کو جاہل کے قول پر ترجیح ہوتی ہے۔ اسقاط اور ادراج محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ یہ تمام اصول ایسے ہیں جو خود مبارکپوری صاحبؒ کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ مگر افسوس کہ عملی طور پر وہ سب سے گریز کرتے ہیں۔ فوا اسفا۔

یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ادراج و اسقاط محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ ادراج مجرد دعوے سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۵۱)

حضرات! یہ ہے مبارکپوری صاحب کا انصاف اور دیانت؟ اس سے بڑھ کر تعصب اور کیا ہو سکتا ہے؟

بصورت مرسل بھی یہ روایت حجت ہے:

اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ روایت مرسل ہے، تب بھی جمہور کا احتجاج اس روایت سے صحیح ہوگا۔ مرسل کی حجیت کے بارے میں ہم پہلے کچھ بحث باحوالہ کر چکے ہیں۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہائے کرامؒ کا یہ مسلک ہے کہ حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۱۷) علامہ جزائریؒ کا بیان ہے کہ علماء سابقین میں امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ مرسل حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے —— (توجیہ النظر ص ۲۴۵ والحطہ فی ذکر الصحاح الستۃ ص ۱۰۶ نواب صاحبؒ) اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں لیکن اعلال بارسال موجب ترک او نیست، زیراکہ قبول مراسیل مذہب جمعے از فحول علماء اصول است۔ (دلیل الطالب ص ۳۲۵) اور ایسے مرسل کے حجت ہونے میں جس کی تائید کسی اور حدیث سے ہوتی ہو۔ گو وہ مرسل ہی کیوں نہ ہو۔ سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، حافظ ابن القیمؒ اور مبارکپوری صاحبؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (کتاب القراۃ ص ۳۴۳، مقدمہ نووی ص ۱۷، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۰۵، ابکار المنن ص ۱۳۸) اور مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام میں لکھتے ہیں اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۱) اسی قاعدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ آلوسیؒ یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر حضرت جابرؓ کی یہ روایت مرسل بھی ہو تب بھی مرسل حدیث اکثر ائمہؒ کے نزدیک حجت ہے تو ہمیں عمل کے لیے یہی کافی اور بس ہے۔ (روح المعانی جلد ۱ ص ۹۱)

یہ حکم تو عام مراسیل کا تھا۔ لیکن اگر کسی دلیل سے حضرت عبداللہؓ بن شدادؒ کا صحابی ہونا ثابت ہو جائے تو ان کی روایت مراسیل صحابہؓ کے قسم کی ہوگی اور حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل

بالاتفاق قابل قبول ہیں۔ بعض محققین کا بیان ہے کہ عبداللہؓ بن شدادؓ صحابی تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو کتابیں صرف حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات اور سوانح بیان کرنے کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کا ذکر بھی ان کتابوں میں آتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۹۷) حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (جلد ۱ ص ۳۹۹) میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲ اور تقریب ص ۲۰۲) میں درج ہے۔ ولد علی عھد رسول اللہ علیہ وسلم کہ حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ کی ولادت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے عہد اور زمانہ میں ہوئی تھی۔ اور اسی طرح اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہؓ اور تجرید اسماء الصحابہؓ میں ان کا ذکر ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں عبد اللہؓ بن شدادؓ من صغار الصحابۃ۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۰۰، ۴ ص ۲۵۶) کہ عبداللہؓ بن شدادؓ نو عمر صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ جو صحابی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں کافی عرصہ رہا ہو یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنانِ اسلام سے جہاد کیا ہو یا جس نے آپ کے جھنڈے کے نیچے شہادت کا رتبہ پایا ہو۔ ایسے صحابی کا مرتبہ یقیناً اس صحابی سے زیادہ ہے جس نے آپ کی خدمت اقدس میں کافی وقت نہ گذارا ہو۔ یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنانِ اسلام سے جنگ نہ کی ہو، یا جس کو آپ کی معیت میں شہادت نصیب نہ ہوئی ہو، یا جس نے آپ سے معمولی گفت گو کی ہو یا تھوڑی مسافت آپکے ساتھ طے کی ہو۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

اوراٰہ علی بعد او حال الطفولیۃ وان کان شرف الصحبۃ حاصلاً للجمیع ومن لیس لہٗ منھم سماع منہ فحدیثہٗ مرسل من حیث الروایۃ وھم مع ذلک معدودون فی الصحابۃ لما نالوہ من شرف الرؤیۃ انتہیٰ۔

(شرح نخبۃ الفکر ص ۸۳)

اور اسی طرح ان کا درجہ اس صحابی سے زیادہ ہوگا جس نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دور سے دیکھا ہو یا جس نے بچپن میں آپؐ کو دیکھا ہو۔ اگرچہ صحابی ہونے کا شرف ان سب کو حاصل ہوگا۔ ان میں سے جس نے براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت نہیں کی۔ اس کی حدیث مرسل ہوگی لیکن شرفِ صحبت کی بنا پر ان کا شمار بھی بہر صورت حضرات صحابہ کرامؓ ہی میں کیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا دینی خدمات انجام دینے کی وجہ سے آپس میں یقیناً بہت تفاوت ہے، لیکن مع ہذا جنھوں نے عہد طفولیت اور بچپن کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے جناب رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ ان کا شمار بھی صحابہؓ میں ہے اور اور وہ صغار صحابہؓ میں شامل ہیں اور چونکہ ان کی روایتیں براہِ راست جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہیں ہوتیں بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ سے ہوتی ہیں۔ اس لیے بعض محدثین کرامؓ نے ایسے صغار صحابہؓ کو کبار تابعینؒ میں شمار کر دیا ہے۔ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ اور ایسے صغار صحابہؓ کی روایات مراسیل ہوں گی۔ مؤلف خیر الکلام صـ۴۷۸ میں لکھتے ہیں کہ صحابیؓ کی مرسل اگرچہ بالاتفاق حجت ہے، مگر اس جگہ صحابہؓ سے وہی لوگ مراد ہیں جنھوں نے سن تمیز میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا.... الخ مگر یہ محض فرار کا ایک ناکام بہانہ ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک پانچ سال کا بچہ سن تمیز کو پہنچ جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے۔ (جو عبد اللہؓ بن الزبیرؓ کے واقع سے ظاہر ہے) کہ چار سال سے کم عمر میں بھی تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ (شرح مسلم جلد۲ صـ۲۸۱) اور حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ جو صغار صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں تین چار سال سے کیا کم ہوں گے جب کہ انھوں نے آپ کی زیارت کی ہو گی۔

مراسیل حضرات صحابہ کرامؓ:

مراسیل صحابہؓ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مراسیل سے حجت صحیح نہیں ہے مگر حضرات صحابہ کرامؓ اور سعید بن المسیبؒ کے مراسیل حجت ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم صـ۳۴ عن الوجیز لابن برھانؒ) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حجت ہیں۔ (شرح مسلم جلد ص ۲۸۴ و مقدمہ صـ۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماءؒ کے نزدیک صحابی کا مرسل حجت ہے۔ (شرح مہذب جلد۴ صـ۳۸۱) اور علامہ سیوطیؒ تدریب الراوی ص ۶۶ میں تصریح کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حجت ہیں اور التوضیح (نول کشور ص ۴۶۸) میں لکھا ہے فمرسل الصحابي مقبول بالاجماع کہ صحابی کا مرسل اجماعاً مقبول ہے۔ علامہ نیمویؒ لکھتے ہیں کہ صحابی کا مرسل حجت ہے (تعلیق الحسن جلد۲ صـ۱۰۸) اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں ——

(نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۴۱) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ومراسیل صحابہؓ حجت است (دلیل الطالب ص ۳۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ مرسل صحابی محکوم بصحت است برمذہب صحیح۔ ایضاً ص ۸۹۶) اگر فریقِ ثانی اس قاعدہ کو تسلیم نہیں کرتا تو براہ کرم دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی مرسل روایات عموماً اور حضرت عائشہؓ کی بخاری شریف کی پہلی روایت (جس میں بدء الوحی کا ذکر ہے اور جو ان کی ولادت سے بھی تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے) خصوصاً اور نیز حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں جن میں ابتدائے اسلام کے احکام ہیں۔ کتابوں سے خارج کردیں اور اگر حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ کو تابعی ہی تسلیم کرلیا جیساکہ تقریب ص ۲۰۷ میں ہے کہ وہ کبار تابعینؒ اور ثقات وفقہائیں میں تھے۔ تب بھی کوئی ہرج نہیں ہے، چنانچہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ

وکذلك مراسیل کبار التابعین اذا انضم الیها مایؤکدها من عدالة رجال من ارسل منهم حدیثه وشهرتهم واجتنابه روایة الضعفاء والمجهولین۔ (کتاب القرأة ص ۱۴۳)

اور اسی طرح (جس طرح حضرات صحابہؓ کے مراسیل حجت ہیں) کبار تابعینؒ کے مراسیل بھی حجت ہیں جب کہ ان کے رواۃ میں عدالت اور شہرت موجود ہو اور کمزور اور مجہول رواۃ کی روایت سے اجتناب وغیرہ کی صفات شامل ہوں۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص غور وفکر اور قِلّتِ غفلت سے متصف ہوکر علمی دلائل پر نگاہ ڈالیگا تو وہ کبار تابعینؒ کے مراسیل کے علاوہ دیگر مراسیل سے منقبض ہوگا جس کے دلائل ظاہر ہیں۔ (الرسالۃ ص ۶۴ جو کتاب الام کی ساتویں جلد کے آخر منضم ہے)

الحاصل حضرت جابرؓ کی یہ روایت صحیح اور مرفوع ہے، اس کو مرسل بتلانے کی تمام دلیلیں بیکار اور لایعنی ہیں اور اگر بالفرض مرسل بھی ہو تب بھی جمہور کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ اور خاص طور پر کبار تابعینؒ کے مراسیل تو امام شافعیؒ اور امام بیہقیؒ کے نزدیک بھی حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح حجت ہیں اور حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ تو صغار صحابہؓ میں تھے جن کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں۔ خلاصہ امر یہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک کسی روایت کے صحیح اور حجت ہونے کے لیے کوئی قاعدہ اور ضابطہ ایسا نہیں ہے جو سو فیصدی اس روایت میں

نہ پایا جاتا ہو اگر باوجود اس کے یہ روایت مرفوع اور حجت نہیں ہے تو عالمِ اسباب میں صحتِ حدیث کے لیے کوئی اور معیار موجود نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

حدیث من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ من حدیث جابرؓ ولہ طرق عن جماعۃ من الصحابۃؓ وکلہا معلولۃ .... انتہی۔ (تلخیص الحبیر جلد ۱ ص ۸۵)

من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کے الفاظ سے حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے (جس کی متعدد اسانید بالکل صحیح ہیں) اور یہ حدیث حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی ایک کافی جماعت سے بھی مروی ہے، لیکن وہ سب طرق معلول ہیں۔

مبارکپوری صاحب نے یہ عبارت تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳ اور ابکار المنن ص ۱۵۶ میں نقل کی ہے اور اس پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے۔

جواب: یہ روایت متعدد اسانید کے ساتھ حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ امام حاکمؒ نے علم اصول حدیث کی مشہور کتاب معرفت علوم الحدیث میں تینتیسویں (۳۳) نوع اس موضوع پر قائم کی ہے۔ ھذا النوع من ھذا العلم معرفۃ المشہور من الاحادیث المرویۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ..... الخ پھر ان مشہور احادیث کے بعد یہ حدیث بھی بیان کی ہے ومنہم من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ اور دیگر متعدد احادیث بھی ذکر کی ہیں پھر فرماتے ہیں فکل ھذہ الاحادیث مشہورۃ باسانیدھا وطرقھا .... الخ (معرفت علوم الحدیث طبع قاہرہ ص ۹۶) اس سے بھی ثابت ہوا کہ من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کی حدیث نہ صرف یہ کہ مرفوع اور صحیح ہے بلکہ مشہور حدیث ہے محض تعصب مذہبی میں آکر اس کا انکار کرنا کس قدر ناانصافی ہے اور ایسے ٹھوس ثبوت اور علم ہی کی وجہ سے ہم حافظ ابن حجرؒ کی اس بات کو رد کرتے ہیں اور کم و بیش چالیس (۴۰) سندیں اس روایت کی تو اس ناکارہ اور کوتاہ علم کو بھی معلوم ہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور ان میں ستائیس کے قریب فی الجملہ معلول ہیں ایک صحیح اور مرفوع سند آپ سن اور پڑھ چکے ہیں اور عنقریب چند ایک دیگر صحیح اسانید بمع توثیق رواۃ ہم آپ سے عرض کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ باقی حافظ ابن حجرؒ کا یہ دعویٰ نہایت مجمل اور بے دلیل ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی تصحیح یا تضعیف

بلا دلیل کون سنتا ہے ؟ بعض علماء کرام نے حافظ صاحب موصوف سے انتہائی عقیدت اور حسنِ ظنی کرتے ہوئے اس کی توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ حافظ صاحب موصوفؒ کی عبارت میں دو چیزیں ہیں :

(۱) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔

(۲) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے بھی متعدد طرق کے ساتھ مروی ہے اور کلھا معلولۃ میں ھا کی ضمیر ان طرق کی طرف راجع ہے جو دیگر حضرات صحابہؓ کرام سے مروی ہیں اور ان کی عبارت لکنّہ حدیث ضعیف عند الحافظ سے بھی یہی طُرق مراد ہیں نہ کہ حضرت جابرؓ کی حدیث اور حضرت جابرؓ کی روایت مسکوت عنہا ہے اور یہ حافظ صاحبؒ کی عبارت کلھا معلولہ کی زد میں نہیں آتی اور گویا حافظ صاحب موصوفؒ نے ایک لطیف حیلہ کرتے ہوئے گول مول حکم صادر کرکے حضرت جابرؓ کی روایت سے گلو خلاصی کرنے کی کوشش فرمائی ہے، مگر ناکام۔ اگر حافظ صاحب موصوفؒ کی مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے من وعن روایت کے ایسے ہی الفاظ مروی ہیں جو حضرت جابرؓ سے مروی ہیں اور وہ طرق سب معلول ہیں۔ تو شاید بظاہر یہ صحیح ہو اور اس صورت میں اس عبارت کی اس سے بہتر توجیہہ اور نہیں ہو سکتی اور اگر مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے جو روایتیں مروی ہیں گو ان کی روایت کے الفاظ تو یہ نہیں لیکن ان کا مفہوم اور مضمون اس سے ملتا جلتا ہے اور وہ تمام طرق معلول ہیں تو یہ قطعاً باطل ہے۔ بطور نمونہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی بعض صحیح روایتیں نقل کرکے ان کے اس دعویٰ کے بطلان کو آشکارا کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اس لیے آپ ان صحیح روایات کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے حافظ صاحبؒ کے اُدھار سے نظر پھیر لیجئے اور یہ نقد وصول کر لیجئے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ یاخُذُ مَاصَفَا وَدَعْ مَاکَدَرْ۔

تیسرا اعتراض : امام بیہقیؒ اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی اس حدیث میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ظہر یا عصر کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى کی قرأت کی تھی تو آپؐ نے اس موقع پر مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا تھا۔ (کتاب القرأۃ صفحہ ۱۴۰ و تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۱۹۲)

جواب: یہ روایت حضرت جابر رض سے مروی ہے اور ان کی روایت میں قرأت کو مَازَادَ عَلَی الفَاتِحَہ کی قرأت پر حمل کرنا توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہے کیونکہ حضرت جابر رض راوی حدیث اس قرأت سے صرف سورہ فاتحہ کی قرأت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں[لہ]

مَنْ صَلّٰی رَکعۃً لَمْ یَقْرَأْ فِیْھَا بِاُمِّ القرآن فلم یصل اِلّا وراء الامام (موطا امام مالک ص۲۸ و ترمذی جلد ۱ ص۴۲) جس کسی نے نماز کی ایک رکعت بھی ایسی پڑھی جس میں اس نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ادا نہ ہوگی مگر ہاں امام کے پیچھے۔

اور یہ بات باقرار مبارکپوری صاحب اپنے مقام پر آئے گی کہ راوی حدیث (خصوصاً جب کہ صحابی ہو) اپنی مروی حدیث کی مراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے لہٰذا حضرت جابر کی اس صحیح روایت میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد لینا قطعاً اور یقیناً باطل ہے، یہ یاد رہے کہ یہ روایت حضرت جابر سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ در حدیث جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ کہ فرمودہ من صلّی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام رواہ الطحاوی فی معانی الآثار بسند متصل مرفوع ورواہ الترمذی موقوفاً وقال حسن صحیح ... اھ (ھدایۃ السائل ص۲۰۴) نواب صاحب نے جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص۱۰۷ میں متصل اور مرفوع سند سے مروی ہے۔ سند یوں ہے بحر بن نصر (امام ابوحاتم رح فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور ثقہ تھے۔ امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے مسلمہ بن قاسم فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ فاضل اور مشہور تھے۔ امانی الاحبار ج ۱ ص۳۷) قال حدثنا یحیٰی بن سلام (امام بیہقی فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم ہیں اور اس حدیث کے مرفوع بیان کرنے میں ان کا وہم ہے۔ (محصلہ کتاب القرأۃ ص ۱۱۰) بے شک ان پر بعض نے جرح کی ہے۔ امام دارقطنی ان کی

[لہ] امام مالک ابونعیم وہب بن کیسان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رض سے سنا۔ انہوں نے یہ ارشاد فرمایا ... الخ حضرت امام مالک کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور حضرت جابر رض جلیل القدر صحابی تھے۔ ابونعیم وہب بن کیسان کا ترجمہ سن لیجئے۔ امام نسائی اور ابن معین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعد ان کو ثقہ اور محدث کہتے ہیں۔ عجلی ان کو ثقہ اور تابعی کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام احمد بھی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۶۶) امام ترمذی لکھتے ہیں ھذا حدیث حسن صحیح (ا ص۴۲)

تضعیف کرتے ہیں اور امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ باوجود ان کے ضعیف ہونے کے ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے امام ابن حبان رحؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں ربما اخطأ امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں لا بأس به ربما یھم امام ابوحاتم رحؒ ان کو شیخ اور صدوق کہتے ہیں امام ابوالعربؒ ان کو من الحفاظ اور من خیار خلق اللہ کہتے ہیں لسان المیزان ج ۶ ص ۲۶۰ و ص ۲۶۱ الغرض ان کی یہ حدیث حسن درجہ سے کسی طرح کم نہیں ہے قال حدثنا مالکؒ عن وھبؒ بن کیسانؒ عن جابرؓ بن عبد اللہؓ عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم ـــ (الحدیث) لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۹۳ میں) یہ مطالبہ بھی پورا ہوگیا کہ حدیث قرأۃ الامام...الخ بصورت مرفوع زیر بحث ہے غرضیکہ یہ ارشاد مطلق اور صریح ہے اس کو محض لفظوں کی کرامت سے مقید کرنا اور مجمل قرار دینا جیساکہ مؤلف مذکور نے ص ۵۱۹ میں کیا ہے بالکل باطل ہے اور اسی طرح اس کو رکوع والی رکعت سے مقید کرنا بلادلیل ہے۔ نماز صرف وہی رکعت نہیں بلکہ تمام رکعات نماز اور صلوٰۃ ہے اور امام موفق الدین ابن قدامہؒ اور علامہ شمس الدین الحنبلیؒ بھی اس روایت کو مرفوع روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ رواہ الخلال عن جابرؓ ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قال کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج الا ان یکون وراء الامام (مغنی جلد ۱ ص ۶۰۶ واللفظ له وشرح مقنع جلد ۲ ص ۱۲) یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم نے فرمایا کہ جو نماز بھی سورۃ فاتحہ کے بغیر پڑھی جائے تو وہ ناقص ہوتی ہے مگر ہاں یہ کہ امام کے پیچھے ہو۔ باقی ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص کا سبح اسم ربک الاعلیٰ کی قرأت کرنا تو اس حدیث کا سیاق ہی بالکل الگ اور جدا ہے۔ وہاں ان بعضکم خالجنیھا کے الفاظ موجود ہیں (دیکھئے مسلم جلد ۱ ص ۱۷۲) اس لیے خارجی اور بیرونی قرائن ڈھونڈنے کی بجائے خود حضرت جابرؓ کا بیان اور تفسیر زیادہ قابل قبول ہے اور ان کی مرضی کے خلاف اس روایت میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ علاوہ بریں حدیث نمبر ۱۲ میں حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث میں ام القرآن کا خاص لفظ موجود ہے جیساکہ اپنے مقام پر آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

ـــــــ

چوتھا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضؓ کی حدیث سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح نہیں ہے۔ اور حضرت عبادۃؓ بن الصامت کی روایت سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح ہے لہٰذا حضرت عبادۃؓ کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۵)

جواب: حضرت عبادۃؓ الصامت کی روایت جو صحیح اور صریح ہے وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہے۔ اس کا مقتدی سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ بیان ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور جو روایت حضرت جابر رضؓ کی ہے، وہ مقتدی کے حق میں ہے۔ اور حضرت جابر رضؓ کی اپنی صریح اور صحیح روایت میں مذکور ہے کہ قرأت سے سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد ہے، علاوہ ازیں لفظ قرأۃ مصدر ہے جو مضاف ہے اور عربی کے طے شدہ قاعدہ کے لحاظ سے یہ سورۃ فاتحہ اور غیر فاتحہ ہر قسم کی قرأت کو شامل ہے۔ چنانچہ امیر یمانیؒ لکھتے ہیں کہ لان لفظ قرأۃ الامام اسم جنس مضاف یعم کل ما یقرأہ الامام (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۶۲) بے شک لفظ قرأۃ الامام اسم جنس ہے جو مضاف ہے اور یہ ہر اس قرأت کو عام ہے جو امام پڑھتا ہو۔ اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ زیرا کہ مصدر مضاف یکے از صیغ عموم باشد کما تقرر فی الاصول وقرأۃ الامام دریں جا مصدر مضاف واقع شدہ پس شامل جمیع قرأت امام باشد واین عموم مخصوص است باحادیث صحیحہ مثل حدیث عبادہ رضؓ ..... الخ (دلیل الطالب صفحہ ۲۹۲) لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ کے حوالہ سے آئے گا کہ حضرت عبادۃؓ کی خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں لہٰذا تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان آثار میں فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے اور قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۱۱۱) الخ اور حضرت جابر رضؓ کی روایت کو سورۃ فاتحہ کے بارے میں غیر صریح کہنا ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ رہی حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید اور مضمون سے روایت تو اپنے مقام پر پوری تفصیل آئیگی کہ ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اندریں حالات حضرت جابر رضؓ کی حدیث کا حضرت عبادہ رضؓ کی حدیث سے تعارض قائم کرکے ثانی کو اول پر ترجیح دینا صرف تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔

پانچواں اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام سے تو نفس کفایت ہی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ حنفیہ امام کے پیچھے قرأت کی ممنوعیت اور حرمت بھی ثابت کرتے ہیں۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۶)

جواب: قرأت خلف الامام کی ممنوعیت اور حرمت کے صرف حنفیہ ہی قائل نہیں، بلکہ جمہور اہلِ اسلام ان کے ساتھ ہیں خصوصاً جہری نمازوں میں جس کی پوری تحقیق گذر چکی ہے اور جمہور اہلِ اسلام عموماً اور حنفیہ نے خصوصاً یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ ہم نفس کفایت، حرمت اور ممنوعیت وغیرہ سب کچھ اس ایک روایت ہی سے ثابت کرتے ہیں؟ نفسِ کفایت اس روایت سے معلوم ہوگئی اور فریق ثانی کی یہ رٹ تو باطل ہوگئی کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیکار ہے اور باطل ہے۔ باقی رہی ممنوعیت اور حرمت وغیرہ تو دیگر احادیث سے اور قرآن کریم کی نص فاستمعوا وانصتوا اور حدیث واذا قرأ فانصتوا وغیرہ سے ثابت ہے کیونکہ صیغہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے امر کی مخالفت حرام بھی ہے اور ممنوع بھی جیسا کہ پہلے نواب صاحبؒ کے حوالہ سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے۔

چھٹا اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی حالانکہ احناف کہتے ہیں کہ اگر پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو۔ تو نماز جائز ہے۔ تو حنفیہ کا عمل بھی حدیث جابرؓ پر نہ ہوا۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۱۴)

جواب: مبارکپوری صاحبؒ نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے بعض فقہائے کرامؒ کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں لیکن کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں کہ جتنی حدیثیں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں ہر ہر حدیث آپ کی فرمودہ نہیں ہے۔ اور نہ عملی طور پر آپ سے ثابت ہے، بلکہ ان میں بہت حدیثیں جعلی، خانہ ساز، ضعیف، شاذ، منکر اور معلول وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نہ تو فقہ حنفی

کی ہر ہر جزئی امام ابو حنیفہ رح کی فرمودہ ہے اور نہ ہر ہر جزئی قابل عمل ہے اور مجتہد کا مصیب اور مخطی ہونا اس پر مستزاد ہے۔ پھر بعض فقہاء رح کی غیر معصوم آرا کو حتمی اور ضروری سمجھ کر تمام احناف کا مسلک بتانا اور پھر اس پر اعتراض کی بنیاد رکھنا محض باطل اور مردود ہے۔ اور اگر بعض نے ایسا لکھا ہے تو اس کو سہو و نسیان پر حمل کرنے کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا اور احکام عمد و سہو میں فرق مخفی نہیں ہے۔ (دیکھئے بدور الاہلہ ص۹۷ وغیرہ) لیکن مسئلہ زیر بحث میں تو حضرت امام ابو حنیفہ رح سے یہ روایت منقول ہے کہ پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۃ فاتحہ ضروری ہے اور اسی روایت کو حافظ ابن ہمام رح نے پسند کیا اور ترجیح دی ہے (فصل الخطاب ص۴) اور حضرت شاہ صاحب رح تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن ہمام رح اور علامہ بدر الدین عینی رح (وغیرہ) نے ثم افعل ذلك فی صلوتك کلها[1] کی حدیث سے پچھلی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۰۰) اور نیز علامہ سندھی حنفی رح (المتوفی ۱۱۴۰ھ) اسی حدیث سے ہر ایک رکعت میں وجوب سورۃ فاتحہ پر احتجاج کرتے ہیں (سندھی رح علی البخاری جلد ۱ ص۹۵) اور اسی طرح دیگر محققین علماء احناف بھی پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۃ فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مبارکپوری صاحب رح کا قیاس ساقط الاعتبار ہے جملہ علماء احناف پر یہ اعتراض تو ہرگز وارد نہیں ہو سکتا۔ البتہ مبارکپوری صاحب رح کا مقتدی کو اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ...... الآیۃ پڑھنے کا حکم دینا (دیکھئے ابکار المنن ص۱۱۶ وغیرہ) یقیناً حدیث لا تقرأوا بشیء من القرآن کے مخالف ہے۔

ساتواں اعتراض: مبارکپوری صاحب رح وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث فقرأۃ الامام لہ میں لہٗ کی ضمیر حرف مَن کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ یہ ضمیر امام کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں حدیث کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جس شخص نے امام کی اقتداء کی۔ تو امام کی قرأت صرف امام کے لیے ہے یعنی مقتدی کو اپنی الگ اور جدا قرأت کرنا ہوگی۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۱۶۸)

جواب: یہ اعتراض یا بزعم خود جواب محض بیہودہ اور لغو ہے: اولاً۔ اس لیے کہ سو فیصدی[2]

---

[1] یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۵ مسلم جلد ۱ ص۱۷۰ اور نسائی جلد ۱ ص۱۴۲ وغیرہ میں مروی ہے۔

[2] یہ قاعدہ ہدایت النحو ص۲۱ کافیہ ص۱۷ جامی ص۹۰ مفصل ص۱۸۱، رضی جلد ۱ ص۹۲۔ متن متین ص۹۱ سوال کابلی ص۱۲۲ اور سوال باسولی وغیرہ نحو کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔

نحاۃ کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جب جملہ خبر واقع ہو تو لابدی ہے کہ اس جملہ میں ربط پیدا کرنے والی کوئی چیز ہو مظہر ہو یا ضمیر جو مبتدا کی طرف راجع ہو، عام اس سے کہ مذکور ہو یا مقدر اس حدیث میں من کان لہ امام حرف من مبتدا ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اور جملہ فقراءۃ الامام لہ قراءۃ اس کی خبر ہے جو جزاء پر مشتمل ہے۔ اگر لہٗ کی ضمیر حرف من کی طرف راجع نہ ہو تو مولانا مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع ہی یہ ارشاد فرمائیں کہ من کی طرف کونسی ضمیر راجع ہوگی یا ربط پیدا کرنے والی یہاں کیا چیز ہے؟ کیا علم نحو فریق ثانی سے اتنا مرعوب یا ان کا اتنا خیر خواہ ہے کہ اس کو یہاں اپنا عمل کرنے کی توفیق ہی نہیں اور نہ اس میں اس کی ہمت اور جرأت ہے

قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیے کہ مبارکپوری صاحبؒ (مع اپنے اتباع کے) کیسے جگرا اور دل کے مالک ہیں کہ حضرات محدثین کرامؒ کے تمام طے شدہ اصول اور ضوابط کو روندتے آئے ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اور ابھی سے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اور ان کی یہ ستم ظریفی بھی دیکھئے کہ وہ کس بے جگری کے ساتھ گرامر اور نحو کے مسلمات کو بھی پامال کرتے جا رہے ہیں، جن کے تسلیم کرنے میں غیر مسلموں اور دہریوں کو بھی کبھی تامل نہیں ہوا۔ مؤلف خیر الکلام صـ۴۹۵ میں لکھتے ہیں کہ بلکہ ضمیر مقدر بھی ہو سکتی ہے جیسے اَلْبُرُّ مُنَوَانِ بِدِرْھَمٍ۔ الخ

الجواب: بے شک مقدر بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہاں جہاں ظاہر اور مذکور نہ ہو یہاں مقدر ماننے کا کون سا داعیہ ہے جبکہ ضمیر ظاہر موجود ہے؟ باقی علامہ ابو الحسن حنفی سندیؒ کے حاشیہ ابن ماجہ صـ۱۲۵ کے حوالہ سے جو عبارت مؤلف خیر الکلام نے صـ۴۹۴ میں اپنی تائید کے لیے نقل کی ہے۔ قِیْلَ یَحْتَمِلُ ... الخ تو لفظ قیل سے علامہ موصوفؒ نے اس کی تمریض اور تضعیف کر دی ہے کیونکہ عموماً یہ لفظ تمریض کے لیے آتا ہے نہ وہ اس تاویل پر راضی ہیں اور نہ یہ ان کا اپنا قول ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے صـ۴۹۴ میں یہ لکھ کر علامہ ابو الحسن حنفیؒ نے بھی ضمیر مقدر نکالی ہے راہ فرار اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صحیح بات سمجھنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔

وثانیاً۔ چونکہ فریق ثانی کا عامل بالحدیث ہونے کا دعویٰ ہے (اور ان کے زعم میں دوسرے لوگ جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں صرف فقہ اور اماموں کے قول سے احتجاج کیا کرتے

ہیں)، اس لیے بطور نمونہ صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس خود ساختہ قاعدہ کے تحت ان کا مطلب ہمیں سمجھا دیا جائے :

(۱) من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہٖ (بخاری وغیرہ) آپکے اس قاعدہ کے رُو سے اس کا معنیٰ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی حاجات پوری کرتا رہتا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(۲) من فرّج عن مسلم کربۃ فرّج اللہ عنہ (بخاری وغیرہ) آپ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے معنیٰ یہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے مصائب دور کرتا ہے (عیاذاً باللہ تعالیٰ)

(۳) من بنیٰ للہِ مسجداً بنی اللہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ (متفق علیہ) آپ کے گھریلو ضابطہ کے لحاظ سے معنیٰ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ) (من عادیٰ لی ولیا فقد بارزتہ بالحرب۔ (صحیحین) آپ کے خود ساختہ قانون کے لحاظ سے معنیٰ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنگ کرنے کا چیلنج کرتا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) اسی طرح من کان للہ کان اللہ لہٗ ، اور من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہٗ اور من کنت مولاہ فعلی رضی مولاہ وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حدیثیں ایسی ہیں جس میں اس خانہ ساز قاعدہ کو جاری کرنے کے بعد نہ توحید باقی رہ سکتی ہے۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ اور مبرا ثابت ہو سکتی ہے اور اسی طرح اسلام کے دیگر اہم مسائل کا ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس افصح العرب والعجم کی ذاتِ گرامی کی طرف ایسے مہمل احکام منسوب ہوتے ہیں جن کی فصاحت و بلاغت مسلّم چلی آتی ہے کہ نہ تو آج تک آپکے اس فن میں کوئی نظیر پیدا ہوا اور نہ ہو گا ۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آٹھواں اعتراض : بعض نہایت سطحی قسم کے دوست یہ کہدیا کرتے ہیں کہ اگر امام کی قرأت مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔ تو مقتدیوں کو رکوع، سجود اور تشہد وغیرہ امور ادا کرنے اور تسبیحات پڑھنے کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ امام ہی سب کچھ کرتا رہے گا بلکہ لوگوں کو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھا رہنا چاہیئے۔ امام خود سب کچھ ادا کرتا رہیگا۔ (ایک صاحب)

جواب : امام مقتدی کی طرف سے صرف قرأتِ قرآن میں کفایت کرتا ہے جیسا کہ آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ۔ اور حدیث واذا قرأ الامام فانصتوا وغیرہ دلائل بسط اور تفصیل کے ساتھ

پہلے نقل کئے جاچکے ہیں اور نواب صاحبؒ کے حوالہ سے عرض کیا جاچکا ہے کہ مقتدی کو ممانعت صرف قرآت کی ہے اور حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی کہو۔ جب وہ رکوع اور سجود وغیرہ کرے تو تم بھی کرو۔ ہاں مگر جب امام قرآت شروع کرے۔ تم خاموش رہو۔ اس لیے باقی امور کو قرآت پر قیاس کرنا مع الفارق ہونے کے ساتھ نص کے مقابلہ میں ہے جو ہر طرح سے مردود ہے۔ بہرحال حضرت جابرؓ کی یہ مرفوع حدیث سنداً و معنیً بالکل صحیح ہے اور جمہور کی دلیل اور حجت ہے البتہ حقائق سے چشم پوشی کرنے کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

نواں اعتراض: مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرآت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ مولانا عبدالحیؒ لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ امام کی قرآت کا مقتدی کے لیے حکمی قرآت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شارع نے مقتدی کو امام کی قرآت سے قاری کے حکم میں کیا ہے اور اس کو اس کا ثواب عطا کیا ہے (عمدۃ القاری جلد ۱ ص ۱۷۴) جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھ کر نماز کا منتظر ہو وہ نماز میں ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ یہ حدیث قرآت خلف الامام کے منافی نہیں۔ اھ (محصلہ ص ۴۹۱، ص ۴۹۲)

الجواب: یہ سب کچھ قلتِ فہم کا نتیجہ ہے، مولانا عبدالحی رحمہ نے بحوالہ علامہ عینیؒ اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ حسًا اور ظاہرًا تو امام قرآت کرتا ہے پھر اس کی قرآت کو مقتدی کی قرآت کیوں قرار دیا گیا ہے۔ جواب یہ دیا کہ جتنا ثواب امام کو ملے گا۔ شریعت نے اتنا ہی ثواب مقتدی کے لیے بیان کیا ہے کہ اگرچہ وہ خاموش بھی رہے گا۔ (جیسا کہ ما زاد علی الفاتحہ میں وہ خاموش رہتا ہے) تب بھی اس کو پورا ثواب ملے گا نہ یہ کہ وہ پیچھے پڑھتا بھی رہے جیسا کہ منتظرِ صلوٰۃ کو نماز کا ثواب ملتا ہے یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ وہ بیٹھا بھی رہے اور ساتھ ہی وہ رکوع و سجود وغیرہ کی حرکات بھی کرتا رہے یہ تو دو متضاد چیزیں ہیں یہ بھلا کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ ہاں جس طرح منتظرِ نماز کو اپنے وقت میں حکمی نماز کا ثواب ملتا ہے اور جب وہ دوسرے موقع پر نماز ادا کرے گا تو اس کو حقیقی نماز کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح نمازی کو بحالتِ اقتداء حکمی قرآت کا ثواب ملتا ہے اور فراغتِ امام کے بعد جب مسبوق اپنی قرآت کرے گا یا وہ منفرد ہو کر نماز پڑھیگا تو اس کو حقیقی قرآت کا ثواب ملے گا۔ اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو حکمی نماز کے

ساتھ تشبیہ اور تنظیر درست نہیں ہے کیونکہ حقیقی اور حکمی نماز دو الگ الگ حالتوں میں ہوتی ہے۔ کما لا یخفی۔

بارھویں حدیث :

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسودؒ[1] بن عامرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسنؒ[2] بن صالحؒ نے بیان کیا اور وہ ابوالزبیرؒ[3] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ[4] سے، وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ　　　یعنی جس آدمی نے امام اقتداء کرلی ہو تو امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے۔

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الاثبات لکھتے ہیں (تذکرۃ جلد ا ص ۳۲۵) امام ابن معینؒ ان کو لا باس بہ اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور صالح اور ابن سعدؒ ان کو صالح فی الحدیث کہتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ا صفحہ ۳۴۰) اور حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں تقریب ص ۳۹۔

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوۃ لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ حافظ اور متقن کہتے ہیں (تذکرہ جلد ص ۲۰۱) امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، امام ابو زرعہؒ ان کو متقن فقیہ عابد اور زاہد کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، ابن سعدؒ ان کو فقیہ، حجت، صحیح الحدیث اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور عابد کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ فقیہ اور عابد تھے (تقریب ص ۸۶)

[3] ابوالزبیر کا نام محمدؒ بن مسلم بن تدرسؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور المکثر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا ص ۱۱۹) امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور یحیی القطانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، یعقوبؒ بن شیبہؒ ان کو ثقہ اور صدوق اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ثبت اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث ساجیؒ کا بیان ہے کہ وہ احکام میں حجت تھے (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۱) عطاءؒ بن ابی رباحؒ کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابرؓ سے احادیث کی سماعت کرکے واپس آتے اور آپس میں مذاکرہ اور تکرار کرتے تو ابوالزبیرؒ حفظ روایات اور ان کی ادائیگی میں ہم سب سبقت لے جاتے تھے (ترمذی جلد ۲ ص ۲۴۰ و مسند دارمی ص ۶۹)

[4] یہ روایت مسند احمد جلد ۳ ص ۳۳۹، شرح مقنع الکبیر جلد ۲ ص ۱۱، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۴ اور بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۶ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے۔

اس حدیث کا مطلب اور مفہوم بھی بلکہ من وعن الفاظ بھی وہی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں اور یہ روایت سابق کی طرح اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس روایت کے جملہ رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس سند پر فریق ثانی کی طرف سے کوئی اعتراض راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابو الزبیرؒ مدلس تھے اور وہ اس روایت کو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوال باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جمہور محدثین ابو الزبیرؒ کی معنعن حدیثوں کو صحیح سمجھتے ہیں (زاد المعاد جلد ۴ ص ۹۵)

وثانیاً۔ پہلے توجیہ النظر کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ ابو الزبیرؒ کا شمار ان مدلسین میں ہے جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔ ایک سند یوں آتی ہے عن ابی الزبیر عن سعید بن جبیرؒ... الخ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں۔ ھذا اسناد صحیح (جلد ۱ ص ۱۳۲) امام دارقطنیؒ ان کی معنعن سند کو بھی صحیح کہتے ہیں۔

وثالثاً۔ حضرت عبد اللہؓ بن شدادؒ وغیرہ ان کے ثقہ متابع موجود ہیں۔ بہر حال یہ روایت متصل اور صحیح ہے، اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ شمس الدینؒ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں۔

وھذا اسناد صحیح متصل رجالہ کلھم ثقات۔ کہ یہ سند صحیح اور متصل ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۱۱ برحاشیہ مغنی)

حافظ شمس الدینؒ کا ترجمہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے اور علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص ۲۷۳) مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۷۹ و ص ۴۸۱ میں دارقطنیؒ اور بیہقیؒ کی روایتوں کا سہارا لے کر حسنؒ بن صالحؒ اور ابو الزبیرؒ کے درمیان جابر جعفی کا واسطہ بتایا ہے مگر مسند احمد کی سند میں کوئی واسطہ نہیں اور یہ روایت صحیح اور متصل ہے جیسا کہ ابھی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے عرض ہو چکا ہے۔

تیرھویں حدیث: امامؒ ابن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن اسمٰعیلؒ نے بیان کیا وہ حسنؒ

۱؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، عدیم النظیر، الثبت اور النحریر لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے
باقی حاشیہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ اگلے

بن صالحؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابوالزبیرؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کل من کان لہ امام فقرأتہ لہ قرأۃ۔

(الجوھر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۹)

ہر وہ شخص جس نے امام کی اقتداء کر لی ہو تو امام کا پڑھنا اس کا پڑھنا ہے۔ اس روایت کے بھی تمام راوی ثقہ ہیں، علامہ ماردینیؒ فرماتے ہیں ھٰذا اسناد صحیح (الجوھر النقی) کہ یہ سند بالکل صحیح ہے۔

چودھویں حدیث: امام عبدالرحمٰنؒ بن حمیدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابونعیمؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسنؒ بن صالحؒ نے بیان کیا وہ ابوالزبیرؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ — کہ جس کا امام قرأت کرتا ہو تو اس کے امام کی قرأت ہی اس مقتدی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی صحیح ہے، علامہ آلوسیؒ اس کو علی شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۱۳۴)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ نمبر ۲ مکمل) ہیں کہ وہ احد الاعلام ومن ائمۃ الاسلام تھے اور فرماتے ہیں کہ انہوں نے مصنف نامی ایک کتاب لکھی ہے نہ ان سے پہلے کسی نے ایسی کتاب لکھی ہے اور نہ بعد (البدایہ جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور حافظ لکھتے ہیں۔ (تقریب صفحہ ۲۱۳)

ؔ۲ (پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں (تذکرۃ جلد ۱ ص ۳۶۴) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور متقن لکھتے ہیں (تقریب صفحہ ۲۴۴) امام نسائیؒ، عجلیؒ، ابوحاتمؒ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمانؒ بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق، ثبت، متقن اور امام الائمۃ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴) باقی رواۃ کی توثیق گذر چکی ہے۔

ؔ۱ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کان من الائمۃ الثقات (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۴) ان کی وفات ۲۴۹ھ میں ہوئی ہے۔

ؔ۲ ان کا نام فضلؒ بن دکینؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۱ ص ۳۳۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب صفحہ ۳۰۱) باقی رواۃ کا ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

ؔ۳ یہ روایت الجوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۹، فتح القدیر جلد ۱ صفحہ ۲۳۹، شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳ اور روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۱۳۴ وغیرہ میں موجود ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مسند عبدؒ بن حمیدؒ کے قلمی نسخہ صف۲۲ میں (جو مولانا شمس الحقؒ کے کتب خانہ میں موجود ہے) حسنؒ بن صالحؒ کے بعد جابر جعفی کا نام موجود ہے۔ اور جابر مذکور ضعیف تھا۔ کیونکہ بعینہٖ یہ روایت دارقطنی جلد۱ صل۲۶ اور کتاب القرأۃ صن۱۰ میں مذکور ہے اور ان میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لہٰذا یہ روایت کمزور ہے۔ (تحقیق الکلام جلد۲ صد۱۶۱)

جواب: نہ معلوم مبارکپوری صاحبؒ اتنے زود فراموش کیوں واقع ہوتے ہیں؟ — ع:

تمہیں عادت ہے بھول جانے کی

اگر کاتب کا قلم مسند احمدؒ بن منیعؒ کے نسخہ میں عن جابرؓ کا جملہ زیادہ لکھ سکتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ عبدؒ بن حمیدؒ کے قلمی نسخہ میں جابر جعفی کا جملہ نہیں لکھ سکتا؟ وہ کوئی بڑا منطقی اور فلسفی قلم ہے۔ کہ بظاہر مطبوعہ نسخوں میں تو کام کرسکتا ہے لیکن زاویہ خمول میں پڑے ہوئے قلمی نسخہ میں مجبور ولاچار ہو کر رہ جاتا ہے؟ وہ قلم تھا یا کسی یونیورسٹی کا ماہر پروفیسر تھا؟ کیا بعید ہے کہ وہ قلم تقدیر ہی ہو جو مبارکپوری صاحبؒ کی بگڑی ہوئی قسمت کو سنوارنے کے لیے پھر ایک مرتبہ چل پڑا ہو؟

حافظ شمس الدین ابن قدامہؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جاچکا ہے کہ وہ حسنؒ بن صالحؒ کی ابوالزبیرؒ سے روایت کو متصل بیان کرتے ہیں اور اس کی تصریح کرتے ہیں والحسن بن صالح ادرك ابا الزبير (جلد۲ صلا) کہ حسنؒ بن صالحؒ نے ابوالزبیرؒ اور ان کے زمانہ کو پایا ہے۔ اور اصول حدیث کا یہ قاعدہ ہے (جیساکہ مسلم شریف کے مقدمہ وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے) کہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک اتصال سند کے لیے امکان لقاء کافی ہے۔

حسنؒ بن صالحؒ کی ولادت ۱۰۰ھ میں ہوئی ہے اور ابوالزبیرؒ کی وفات ۱۲۸ھ میں (دیکھئے تذکرۃ الحفاظ جلد۱ صد۱۱۹ وغیرہ) اگر اٹھائیس سال کے اس طویل عرصہ کے اندر بھی امکانِ لقاء ثابت نہیں ہوسکتا اور سند متصل نہیں ہوسکتی تو سرے سے فن روایت اور حدیث کا ہی انکار کردیجئے اور منکرین حدیث کی طرح یہ کہتے ہوئے حدیث سے سبکدوشی اختیار کرلیجئے کہ ؎

یہ اُمت روایات میں کھو گئی

حقیقت خُرافات میں کھو گئی

مؤلف خیر الکلام صد۴۸۱ میں لکھتے ہیں کہ مگر حدیث کے فن کی بنیاد ہر جگہ امکان پر نہیں ہوتی اس

میں وقوع کو بھی دیکھا جاتا ہے ..... الخ

الجواب : یہی وہ غیر صحیح نظریہ ہے جس کو امام مسلمؒ نے صحیح کے مقدمہ میں پُر زور الفاظ سے رد کیا ہے اور اتصال سند کے لئے غیر مدلس میں امکانِ لقار کو کافی سمجھا ہے اور یہی نظریہ جمہور محدثین کرامؒ نے اپنایا ہے۔ علاوہ ازیں خود مؤلف خیر الکلام صد ۲۲۳ میں لکھتے ہیں کہ کیونکہ صحتِ حدیث کے لیے صرف استاد اور شاگرد کی ملاقات کا ممکن ہونا کافی ہے۔ عدم ثبوت سے نفی لازم نہیں آتی۔ اھ بلفظہٖ اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں خوانخواہ دوسرے کی معقول بات کو توڑ مروڑ دینا کہاں کا انصاف ہے؟

علاوہ ازیں امام احمدؒ ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ۔ شمس الدینؒ بن قدامہؒ حافظ مزیؒ[1]۔ علامہ ماردینیؒ حافظ ابن ہمامؒ۔ ملا علی قاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ یہ سند اسی طرح نقل کرتے ہیں عن حسنؒ بن صالحؒ عن ابی الزبیرؒ... الخ اور اس میں جابر جعفی کا ذکر تک نہیں کرتے۔ مگر شومئ قسمت کا کیا کہنا کہ ان کو نہ تو قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے اور نہ مہربان قلم مل سکا ہے۔ ورنہ ذرا سی جنبش ان کے لیے بھی کر ہی گذرتا ۔۔۔ ع:

کلکِ ما نیز زبانے و بیانے دارد

رہا دار قطنی اور بیہقی کی سند میں حسنؒ بن صالحؒ اور ابو الزبیرؒ کے درمیان جابر جعفی کا واقع ہونا تو یہ اس پیش کردہ سند کے عدم اتصال کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ حسنؒ بن صالحؒ نے یہ روایت براہِ راست ابو الزبیرؒ سے بھی سُنی ہو۔ اور جابر جعفی سے بھی سنی ہو کسی وقت وہ ابو الزبیرؒ سے روایت بیان کرتے ہوں گے اور کسی وقت جابر جعفی سے یا یوں کہیئے کہ

---

[1] باقی حضرات کے حوالے اور ان کے تراجم آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، حافظ مزیؒ نے اپنی کتاب اطراف میں یہ سند یوں ہی نقل کی ہے اور اس میں جابر جعفی کا ذکر نہیں ہے۔ (دیکھئے الجوہر النقی جلد ۲ صد ۱۵۹) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ جمال الدین ابو الحجاج یوسفؒ بن الزکی المزیؒ (المتوفی ۷۴۲ ھ) العالم، الحبر، الحافظ، الاوحد، محدث الشام، ثقہ، حجت اور کثیر العلم تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ طبقات رجال اور معرفت رواۃ میں کبھی کسی آنکھ نے ان کا نظیر نہیں دیکھا ہو گا (تذکرہ جلد ۴ صد ۲۶۰) علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کو ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہے: ۔۔۔ ع

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

جب صحت حدیث کا خیال دامنگیر ہوتا ہوگا اس وقت ابوالزبیرؒ کا طریق بیان کر دیتے ہوں گے اور جب محض روایت پیش کرنا ہی مد نظر ہوتا ہوگا اس وقت وہ جابر جعفی کی سند روایت بیان کر دیتے ہوں گے اور فن حدیث میں اسکی بکثرت مثالیں موجود ہیں اور علماء اصول اسکو اپنی اصطلاح میں المزید فی متصل الاسانید سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اگر بعض طرق میں راوی اور مروی عنہ کے درمیان زائد راوی آجائے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ جس طریق میں زائد راوی کا تذکرہ نہیں ہوا۔ وہ منقطع ہو یا اس سے عدم لقاء ثابت ہو (دیکھئے شرح نخبۃ الفکر ص۴۵ وغیرہ) حضرت مولانا محدث محمد حسن صاحب فیض پوریؒ لکھتے ہیں کہ ابوالزبیرؒ سے ذیل کے حضرات روایت کرتے ہیں۔ الحسنؒ بن صالحؒ جیساکہ مسند احمد وغیرہ کا حوالہ ہم نے دیا اور ایوب السختیانیؒ بھی۔ (موطا امام محمد و کتاب القراۃ) اور عبداللہؒ بن لہیعہؒ بھی (کتاب القراۃ) اور الفضلؒ بن عطیہؒ (کتاب القراۃ) اور جابر جعفی اور لیثؒ بن ابی سلیمؒ بھی (طحاوی جلد ا ص۱۰ و دارقطنی جلد ا ص۱۲۶) (الدلیل المبین ص۲۲۹)

اگر مبارک پوری صاحبؒ اس پر بضد ہیں کہ کاتب صاحب کی غلطی ہی تسلیم کی جائے تو تب ہی دل کو تسکین ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ تو لیجئے ہم ان کی اس ضد کو بھی مان لیتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اصل عبارت یوں ہو:

عن الحسن بن صالح وعن جابر الجعفی ... الخ مطلب یہ ہوا کہ ابو نعیمؒ نے حسنؒ بن صالحؒ اور جابر جعفی دونوں سے روایت کی ہو، لیکن کاتب سے قلمی نسخہ میں صرف حرف واؤ چھوٹ گیا ہو، کیونکہ واو کا کتابت میں چھوٹ جانا بہت آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی دیانت دار کاتب کا قلم عن جابر زیادہ لکھدے۔ اگر کاتب کی غلطی کی توجیہ و تاویل ہی معتبر ہو سکتی ہے تو یوں کیوں نہ ہو جاتے؟ بلکہ ابن ماجہ ص۹۱ کے بعض نسخوں میں اصل عبارت ہی اسی طرح ہے جس طرح ہم نے تحریر کی ہے۔ عن الحسن بن صالح وعن جابر ... الخ اور مولف خیر الکلام نے ص۴۸۱ میں اس کو دبی زبان سے تسلیم کیا ہے۔

پندرھویں حدیث: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا۔ فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ نے بیان کیا۔ وہ عبداللہؓ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے، انھوں نے فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (موطاء امام محمد ص۹۸) کہ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کو کافی ہے اور بس، اس ج

آگے قرأت نہیں ہے۔ یہ روایت کتاب الآثار لابی یوسف ص ۲۳ اور طحاوی جلد ۱ ص ۱۰۶ اور کتاب الآثار لمحمد ص ۱۸ میں بھی ہے
مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۸۷ میں لکھا ہے کہ محدثین کہتے ہیں کہ اس میں امام ابو حنیفہ نے غلطی سے جابر کا لفظ بڑھا دیا ہے۔

الجواب: امام ابو حنیفہؒ ثقہ اور ثبت ہیں اور دیگر ثقہ راوی بھی اس حدیث کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، اس زیادت کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ہاں البتہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ سے تعصب اور عناد کا کوئی علاج نہیں ہے اور اس متعصبانہ انداز سے امام صاحبؒ کی جلالت اور حدیث کی صحت پر کوئی زد نہیں آتی۔

سولھویں حدیث: امام محمدؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے اسرائیلؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن ابی عائشہؒ نے بیان کیا۔ وہ عبد اللہ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں:

امّ رسول الله صلی الله علیه وسلم فی العصر۔ کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں

قال فقرأ رجل خلفه فغمزه الذی یلیه فلما ان صلی قال لم غمزتنی؟ قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد امك فکرهت ان تقرأ خلفه فسمعه النبی صلی الله علیه وسلم فقال من کان له امام فان قرأته له قرأة ......

(موطا امام محمدؒ ص ۹۸)

امامت کرائی اور ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی جو نمازی اس کے ساتھ کھڑا تھا، اس نے اس کا بدن دبا دیا تاکہ وہ قرأۃ سے باز آجائے۔ جب نماز ادا ہوچکی تو اس نے کہا تم نے مجھے کیوں ٹٹولا اور دبا دیا تھا؟ منع کرنے والے نے کہا کہ چونکہ حضور آگے قرأت کرتے تھے میں نے مناسب سمجھا کہ تم بھی قرأت کرو، آپ نے سنا تو ارشاد فرمایا کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔

اس روایت کے تمام روات کا ذکر پہلے ہوچکا ہے اور گو اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر نہیں لیکن اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اولاً اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن شدادؓ خود صغار صحابہؓ میں تھے۔ اور حضرات صحابہؓ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں۔ وثانیاً ویسے بھی کبار تابعینؒ کے مراسیل صحیح اور حجت ہیں جیسا کہ نقل کیا جاچکا ہے۔ وثالثاً ہم نے یہ روایت پہلی روایت کی تائید میں پیش کی ہے اور مرسل معتضد کے

---

[1] امام محمدؒ: مؤلف خیر الکلام ص ۲۵۴ میں لکھتے ہیں کہ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ وغیرہ نے امام محمدؒ کو حافظہ کی بنا پر کمزور قرار دیا ہے۔ (محصلہ)

الجواب: مؤلف خیر الکلام ص ۹ میں لکھتے ہیں کہ جرح کرنے والا اگر متعنت اور متشدد ہو تو اس کی توثیق تو معتبر ہے مگر جرح معتبر نہیں۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ متشددین میں ابو حاتمؒ، نسائیؒ، ابن معینؒ، ابن قطانؒ کو شمار کرتے ہیں۔ بلفظہٖ۔ لہٰذا امام نسائیؒ کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں اور امام محمدؒ ثقہ ہیں جیسا کہ ابتدائے کتاب میں باحوالہ ان کی توثیق نقل کردی گئی ہے۔

حجّت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

مؤلف خیر الکلام ص۴۸۹ میں لکھتے ہیں کہ محدثین کا خیال ہے کہ یہ حدیث مرسل ہونے
اور امام محمدؒ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

الجواب: ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل صحیح ہے اور
یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ امام محمدؒ ثقہ ہیں اور امام نسائیؒ متعنت ہیں۔ ان کی جرح کا اعتبار
نہیں، امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں کہ

ولنا ما رواه الامام احمد عن وکیع
عن سفیان عن موسیٰ بن ابی عائشة عن
عبد الله بن شدادؓ قال قال رسول الله صلی
الله علیه وسلم من کان له امام فان قرأة
الامام له قرأة۔

(مغنی ابن قدامة جلد ۱ ص۶۰۶)

اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے وکیعؒ سے
روایت کی ہے اور وہ سفیانؒ سے اور وہ موسیٰؒ بن
ابی عائشہؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ سے
روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا امام ہو تو بے شک اس کے
امام کی قرأت اسی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ
حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ صحابی ہیں، لہٰذا ان کی روایت مرسل صحابی ہونے کے اعتبار سے مرفوع ہے
اور اس میں امام محمدؒ بھی نہیں ہیں جن پر فریق ثانی ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ امام وکیعؒ بن الجراحؒ کو
علامہ ذہبیؒ الامام، الحافظ، الثبت محدث العراق اور احد الائمة الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ
جلد ۱ ص۲۸۲) اور سفیانؒ اس سند میں ثوری ہیں جن کا ترجمہ مقدمہ میں بیان ہو چکا ہے اور
بقیہ رواۃ کے تراجم بھی پہلے عرض کیے جا چکے ہیں۔

ایک شاہد: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو عمروؒ بن حسینؒ بن محمدؒ بن ہیثمؒ نے
بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسین عبد الواحدؒ بن حسن نیشاپوریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں
ہیں کہ ہم سے حسینؒ بن نہمان عسکریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہؒ بن حمادؒ نے بیان
کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے سلیمانؒ بن سلمہؒ نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن اسحاق اندلسیؒ سے روایت
کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن انسؒ نے بیان کیا، وہ یحییٰؒ بن سعید انصاریؒ سے اور

وہ سعیدؒ بن المسیبؒ سے اور وہ حضرت نواسؓ بن سمعان سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الظہر وکان عن یمینی رجل من الانصار فقرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی یساری رجل من مزینۃ یلعب بالحصٰی فلما قضٰی صلوٰتہٗ قال من قرأ خلفی؟ قال الانصاری انا یا رسول اللہ قال لا تفعل من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(کتاب القرأۃ ص۱۳۹)

میں نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھی میرے دائیں پہلو میں ایک انصاری آپ کے پیچھے قرأت کر رہا تھا اور میرے بائیں پہلو میں قبیلہ مزینہ کا ایک شخص سنگریزوں سے کھیل رہا تھا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کس نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟ انصاری نے کہا کہ میں نے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا پھر ایسا نہ کرنا جو شخص امام کی اقتدا اختیار کرلے تو امام کا پڑھنا ہی مقتدی کے لیے کافی ہے۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی سند میں محمدؒ بن اسحاق عکاشی ہے۔ تو وہ کذاب تھا ان کان ھو العکاشی ... الخ کہتے ہیں واقعی عکاشی کذاب ہے لیکن سند میں اندلسیؒ کا ذکر ہے اگرچہ بعض نے عکاشی اور اندلسی کو ایک کہا ہے لیکن محدث ابن عدیؒ ان کو دو بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں ھو رجل لا یعرف یعنی وہ مجہول اور مستور ہے اور حافظ ابن حجرؒ بھی دو ہی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ والراجح التفرقۃ (لسان جلد ۵ ص۶۷) کہ راجح بات یہ ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص۳۱۶) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مستور کی روایت کو متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص۲۲۵) اور یہ روایت ہم نے بھی صرف تائید اور شاہد کے لیے پیش کی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے؟ بہر حال ہمارا استدلال اس روایت سے نہیں بلکہ محض شاہد کے طور پر ہم نے اس کو نقل کیا ہے۔

ان سابق پیش کردہ روایات سے معلوم ہوا کہ ظہر اور عصر کی قید کو صرف امام ابو حنیفہؒ ہی نہیں بیان کرتے بلکہ دوسرے ثقہ راوی بھی اس کو بیان اور نقل کرتے ہیں۔ اس شاہد کے علاوہ تین روایتیں بسند صحیح نقل کی جا چکی ہیں۔ جن میں ظہر یا عصر کی قید موجود ہے۔ اس شاہد کو چھوڑ کر بھی امام ابو حنیفہؒ

کے علاوہ اسرائیلؒ اور طلحہؒ (جو دونوں ثقہ اور ثبت راوی ہیں) اپنی روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ لہٰذا جو حضرات ظہر وغیرہ کی قید بیان کرنے میں صرف امام ابو حنیفہؒ کو متفرد کہتے ہیں۔ ان کی تحقیق صحیح نہیں ہے۔

سترھویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہؒ[1] بن سلیمانؒ بن الاشعثؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الملکؒ[2] بن شعیبؒ بن لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہؒ[3] بن وہبؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ طلحہؒ[4] سے روایت کرتے ہیں وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے، وہ عبد اللہؒ بن شدادؒ بن الہاد سے، وہ

---

۱ امام بیہقیؒ کا ترجمہ ص۱۱۷ میں اور حافظ ابو عبد اللہؒ اور حافظ ابو علیؒ کا باب اول میں مجاہدؒ بن جبرؒ کے اثر کے ذیل میں اور لیثؒ بن سعدؒ کا مقدمہ میں اور موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ اور عبد اللہؒ بن شدادؒ کا عنقریب گذر چکا ہے۔ عبد اللہؒ بن اشعثؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقۃ (میزان جلد۲ ص۴۳) اور العلامۃ اور قدوۃ المحدثین اور الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد۲ ص۲۹۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ من کبار الحفاظ اور من ائمۃ الاعلام تھے (لسان جلد۳ ص۲۹۵) محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ حافظ اور امام وقت اور متفق علیہ تھے (ایضاً ص۲۹۶) اور وہ امام ابو داؤدؒ صاحب سنن کے فرزند ارجمند تھے۔

۲ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، صحیح مسلم میں ان کی پچاس حدیثیں ہیں (تہذیب التہذیب جلد۶ ص۳۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۲۴۵)

۳ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الفقیہ اور احد الائمۃ الاعلام تھے۔ ایک لاکھ حدیث ان سے مروی ہے (تذکرہ جلد۱ ص۲۸۰) خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ بالاتفاق ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب ج۶ ص۷۲)

۴ امام احمدؒ ان کو لاباس بہ، ابن مدینیؒ ان کو معروف ابو زرعہؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صالح کہتے ہیں۔ امام لیثؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد۵ ص۱۶) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۱۸۱) اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں تصریح ہے کہ لیثؒ بن سعدؒ نے اسی طلحہؒ سے روایت کی ہے روی عنہ اللیث ... الخ اور اس سند میں بھی لیثؒ بن سعدؒ، طلحہؒ سے روایت کرتے ہیں، یہ تک بندی نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص۲۸۵ میں یہ کہہ کر جان چھڑانے کی ناکام سعی کی ہے۔

ابو الولید سے اور وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان رجلاً صلی خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الظہر والعصر یعنی یقرأ فاومی الیہ رجل فنہاہ فابیٰ فلما انصرف قال اتنہانی ان اقرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتذاکرا حتی سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ علیہ وسلم من صلی خلف امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(کتاب القرأۃ ص ۱۰۲)

کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی۔ اثنایِ نماز میں ایک آدمی نے اشارہ سے اس کو قرأت سے منع کیا۔ لیکن وہ قرأت سے باز نہ آیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو قرأت کرنیوالے نے منع کرنے والے کو کہا کہ تم مجھے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت سے کیوں روکتے ہو؟ دونوں آپس میں تکرار کر رہے تھے کہ آپ نے ان کی گفتگو سن لی اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو اس کو (الگ قرأت نہیں کرنی چاہیے بلکہ) امام کی قرأت ہی اس کو کافی اور بس ہے۔

اور اس روایت کا ذکر اپنی سند کے ساتھ امام ابن قدامہؒ نے بھی کیا ہے مگر اس میں ظہر یا عصر کا ذکر نہیں اور آخر میں ہے:

فقال رسول صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان لک امام یقرأ فان قرأتہ لک قرأۃ۔ (مغنی ج ۱ ص ۶۰۹)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تیرا امام قرأۃ کر رہا ہو تو اس کی قرأت ہی تیرے لیے کافی ہے۔

اس صحیح روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر ہے جو بالاتفاق سرّی نمازیں ہیں۔ اور آپ کے پیچھے قرأۃ کرنیوالا صرف ایک شخص تھا حالانکہ حضرات صحابہ کرامؓ جس طرح نماز اور جماعت کی پابندی کرتے وہ اور کس سے ہوسکتی ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کی یہی دلی خواہش ہوتی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھی جائے مگر باوجود اتنی بڑی جماعت کے کثیر التعداد حضرات صحابہؓ میں سرّی نماز میں آپ کے پیچھے قرأۃ کرنیوالا صرف ایک ہی شخص ملتا ہے اور باقی سب خاموش رہتے ہیں۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اس ایک شخص کی قرأت کو بھی گوارا نہیں فرماتے اور اس کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ہوتی خصوصاً سرّی نمازوں میں تو یقیناً آپ اس کی تائید فرماتے اور قرأت سے روکنے والے کو تنبیہ فرماتے اور اگر

امام کے پیچھے قرأت کی گنجائش ہوتی خاص کر سرّی نمازوں میں تو عین نماز کی حالت میں احسانِ صلوٰۃ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے منع کرنے والے صحابی قرأت کرنے والے کو منع کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔ اور اگر سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کا استحباب یا جواز بھی ہوتا تو منع کرنیوالے کو آپ فرما دیتے کہ ایک جائز اور مستحب حکم کی وجہ سے تم نے نماز میں اپنی توجہ کیوں دوسری طرف مبذول کر دی تھی؟ اور دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ بھی منع کرنیوالے کو یہ نہیں کہتے کہ بھائی تم نے اثنائے نماز میں بلاوجہ اس سے الجھنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی تو اچھا کام ہی کر رہا تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو بغیر کسی خارجی قرینہ کے یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جہری نمازوں کا تو قصہ ہی چھوڑ دیئے ان میں بھلا امام کے پیچھے قرأت کی کب اجازت نکل سکتی ہے؟ سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأۃ کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ مستحب پھر ضروری کہاں سے ہوگا؟ اور چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مطلق قرأۃ سے منع کیا ہے۔ اس لیے اس کو محض اپنی رائے سے قرأۃ دون قرأۃ پر حمل کرنا باطل اور مردود ہوگا۔ اور یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے، جو قرأت کا اوّلین اطلاق سورۂ فاتحہ اور ام الکتاب میں منحصر سمجھتے ہیں۔ لہٰذا قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہوگا۔ جو محض بے بنیاد اور بیکار ہے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں لیثؒ سے اوپر کی سند میں عبدالملکؒ بن شعیبؒ نے غلطی کی ہے ..... الخ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۲ اور اسی کا ذکر مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۸۳ میں کیا ہے۔)

جواب: جب یہ راوی بالاتفاق ثقہ ہیں اور با دلائل پہلے یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ثقہ کی زیادت متن اور سند دونوں میں بالاجماع حجت ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ جب حدیث کے ارسال اور اتصال اور رفع و وقف کے بارے میں ثقہ رواۃ کا اختلاف ہو تو بالاتفاق وہ حدیث موصول اور مرفوع ہی متصور ہوگی اور ثقہ رواۃ کی تحدیث صحیح ہوتی ہے اس لیے امام بیہقیؒ وغیرہ کا یہ خلافِ اصول اعتراض قابلِ التفات نہیں ہو سکتا۔

یہ حدیث بھی بہر حال موصول اور مرفوع ہی ہوگی۔

دوسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور امام دارقطنیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابوالولید مجہول ہے تو یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ (کتاب القرأت ص۱۰۳ و دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۳ اور مؤلف خیر الکلام ص ۴۸۳ میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ابوالولید مجہول ہے۔ لہٰذا یہ قابل اعتبار نہیں)

جواب: واقعی یہ اعتراض قدرے معقول نما ہے لیکن درحقیقت یہ بھی نہایت ہی سطحی ہے اور غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ابوالولید کوئی الگ اور جداگانہ ہستی نہیں، بلکہ ابوالولید عبداللہؓ بن شدادؓ کی کنیت تھی۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں:

عبداللہؓ بن شدادؓ ھو بنفسہ ابوالولید ومن تھاون بمعرفۃ الاسامی اورثہ مثل ھذا الوھم۔

یعنی ابوالولید خود بعینہٖ عبداللہؓ بن شدادؓ تھے لیکن جن لوگوں نے رواۃ کے ناموں میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا ان کو ایسا وہم ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ

عبداللہؓ بن شدادؓ اصلہ مدینی وکنیتہ ابوالولید۔

عبداللہؓ بن شدادؓ در اصل مدنی تھے اور ابوالولید ان کی کنیت تھی۔

(معرفت علوم الحدیث، طبع قاہرہ ص۱۰۱)

۱؎ لطیفہ: امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ بعض نے ایک طریق سے یہ روایت نقل کی ہے اور اس میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور دوسرے طریق میں عبداللہؓ بن شدادؓ کا نام اڑا دیا ہے اور یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ابوالولید عبداللہؓ بن شدادؓ کی کنیت ہے، لیکن یہ انصاف سے بعید ہے۔ (کتاب القرأۃ ص۱۰۳) امام حاکمؒ وغیرہ نے امام بیہقیؒ کا مغالطہ تو ایسا نکالا کہ ان کو شاید لب کشائی کی ہمت ہی نہ رہے۔ مگر خود انھوں نے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۵۹ میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام بیہقیؒ نے امام مسلمؒ کی ایک عبارت میں مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے۔ فسامحہ اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔

علاوہ ازیں تاریخ بغدادی جلد ۹ ص ۴۷۳، جامع المسانید جلد ا ص ۳۳۸، کتاب الکنی دولابی جلد ۲ ص ۱۴۳، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۱، لسان المیزان جلد ۶ ص ۲۲۸، تقریب ص ۲۰۲ اور توجیہ النظر ص ۱۹۱ وغیرہ کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ابوالولید عبداللہ بن شداد کی کنیت تھی۔ گویا اس لحاظ سے سند کی اصلی عبارت یوں تھی: عن عبداللہ بن شداد ابی الولید ... الخ رواۃ میں سے کسی نے ابوالولید کو سابق سے الگ سمجھ کر ایک جدا ہستی اور مستقل راوی سمجھ لیا ہے اور اسی حقیقت کو امام بیہقیؒ اور دارقطنیؒ نہ پا سکے۔ عربی زبان میں کنیت نام سے پہلے بھی آتی ہے اور نام کے بعد بھی آسکتی ہے۔ مثلاً دیکھئے محمدؒ بن عبدالرحمٰنؒ ابوالاسود، محمدؒ بن المقاتلؒ ابوالحسن (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۹۱ وغیرہ) اور یحییٰؒ بن یحییٰ ابوزکریا (بخاری جلد ۲ ص ۹۴۶ وغیرہ) وغیرہ وغیرہ اور جملہ ابوالولید اعادہ جار کے ساتھ عبداللہ بن شدادؒ سے بدل بھی ہوسکتا ہے۔ (ہامش شرح نخبۃ ص ۱۱۲)

مؤلف خیر الکلام کا صریح بہتان: جب ان ٹھوس حوالوں سے مؤلف مذکور کا سر چکرایا تو انھوں نے یہ لکھ مارا کہ پھر امام حاکمؒ تو غلطی کی نسبت امام ابوحنیفہؒ کی طرف کر رہے ہیں کہ وہ ابوالولید کو الگ سمجھ کر سند میں بڑھا رہے ہیں کیونکہ ان کو رواۃ کے اسامی کی معرفت نہیں ... الخ ص ۲۸۴) حالانکہ یہ امام حاکمؒ پر خالص بہتان ہے۔ امام حاکمؒ نے اول سے آخر تک اس عبارت میں کہیں اس کی تصریح نہیں کی کہ اس میں امام ابوحنیفہؒ نے غلطی کی ہے وہ تو و من تھاون بمعرفۃ الاسامی اورثہ مثل ھذا الوھم کے عمومی الفاظ بول رہے ہیں کیونکہ مَنْ شرطیہ عموم کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ بیان ہوگا، لیکن غیر مقلدین کے شیخ الحدیث کے نزدیک اس حرف مَنْ سے صرف امام ابوحنیفہؒ ہی مراد ہیں۔ اور ص ۲۸۷ میں مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ اسی بنا پر حاکم نے امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کیا ہے — اور آگے لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کو مورد طعن قرار دیا ہے ..... الخ امام حاکمؒ نے اس وہم کی نسبت قطعاً امام ابوحنیفہؒ کی طرف نہیں کی۔ وہ تو حرف مَن استعمال کر رہے ہیں جو غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث کے نزدیک عموم کے لیے نص قطعی ہے جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ یہ ہے ان کی دیانت۔ فوا اسفا۔

اٹھارھویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمد بکرؒ بن محمدؒ بن حمدانؒ الصیرفیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الصمدؒ بن فضل البلخیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مکیؒ بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہؓ بن شدادؓ بن الہاد سے اور وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے۔

ان رجلا قرأ خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الظهر او العصر فاومأ الیہ رجل فنهاه فلما انصرف قال اتنهانی (الحدیث)

(بحوالہ روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۴)

وہ فرماتے ہیں کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کر رہا تھا۔ نماز ہی کی حالت میں ایک شخص نے اشارہ سے اسے قرأت کرنے سے منع کیا مگر وہ باز نہ آیا۔ نماز کے بعد کہنے لگا تم مجھے قرأت سے منع کرتے ہو؟

یہ روایت امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار ص ۲۳ میں بھی ہے اس کے آخر میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من صلیٰ خلف امام فان قرأة الامام له قرأة۔

آگے روایت کا بعینہٖ وہی مضمون ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ پہلی روایت میں اصل مضمون اور اس کی تشریح دیکھ لیں۔ امام حاکمؒ مستدرک جلد ۱ ص ۴۹۶، ۲ ص ۴۴ وغیرہ میں ایک سند اس طرح پیش کرتے ہیں۔ اخبرنا بکرؒ بن محمدؒ بن حمدانؒ الصیرفی نا عبد الصمدؒ بن الفضل البلخیؒ نا مکیؒ بن ابراهیمؒ .... الخ اور فرماتے ہیں۔ صحیح ہے علامہ ذہبیؒ تلخیص المستدرک میں اس کے بارے میں صحیحٌ کہتے ہوئے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور بقیہ رواۃ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۴۸۸ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے جملہ راوی سوائے امام ابو حنیفہؒ کے ثقہ ہیں اور جابرؓ کے ذکر میں امام ابو حنیفہؒ کی طرف غلطی کی نسبت کی گئی ہے ... الخ اور اس سے پہلے بحوالہ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح موصول بیان کی ہے اور عبد اللہؒ بن المبارکؒ نے ان سے مرسل بیان کی ہے۔ جابرؓ کا ذکر نہیں کیا اور یہی محفوظ ہے۔

الجواب: پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ثقہ اور ثبت تھے لہٰذا ان کی تضعیف بغیر تعصب کے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور حسب امام بیہقیؒ خود فرماتے ہیں کہ رواۃ کی ایک

خاص جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر ہے اور تنہا امام ابن مبارکؒ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں تو جماعت کی روایت موصول ہی کیوں نہ محفوظ ہو جب کہ حقیقتہً وہ ہے بھی صحیح محفوظ اور موصول۔

انیسویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ زکریاؒ بن الحارثؒ نے بیان کیا وہ فرماتے کہ ہم سے محمدؒ بن ازہر سجزیؒ[1] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے خلفؒ[2] بن ایوبؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو یوسفؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبداللہؓ بن شداد ابو الولیدؓ سے اور حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا:

من صلّٰی خلف امام فان قرأتہ لہ قراۃ۔ کہ جو آدمی امام کے پیچھے نماز پڑھے سو اس کے امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ (اس کو الگ قرأت کی ضرورت نہیں)

(معرفت علوم الحدیث ص ۱۲۸، طبع قاہرہ)

---

[1] علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ الامام المزکی الفقیہ احد مشائخ اصحاب ابی حنیفۃ فی عصرہ واحد العباد تھے۔ (الجواہر جلد ۱ ص ۲۴۵)

[2] علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ وہ من آئمۃ اصحابنا الخراسانیین اور اصحاب طبقہ عالیہ میں تھے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۳۱) اور فاضل لکھنویؒ نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ (فوائد بہیہ ص ۱۶۰)

[3] محدث ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ خلیلیؒ ان کو صدوق اور مشہور کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۴۸) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ وہ احد الفقہاء الاعلام، صاحب علم عامل اور بڑے خدا پرست تھے (میزان جلد ۱ ص ۳۱۱)

[4] قاضی ابو یوسفؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے اور دیگر رواۃ کے تراجم بھی بیان کئے گئے ہیں

فائدہ: محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں سند کے ایک راوی کے بدلنے سے روایت بدل جاتی ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر ہم نے ان حدیثوں کا الگ الگ شمار کیا ہے۔ اس امر کو بخوبی ملحوظ رکھیں تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

یہ روایت بھی سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں انا ابو یوسف القاضیؒ انا ابو حنیفۃؒ ... الخ آتا ہے لکھتے ہیں: ھٰذا اسناد متصل عال (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۱) کہ یہ سند متصل اور بلند پایہ ہے اور مضمون و مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ روایت واضح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ مؤلف خیر الکلام سے رہا نہیں گیا۔ صفحہ ۴۹۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بھی امام ابو حنیفہؒ کی ہے ... الخ

الجواب: ہاں یہ روایت امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے جو ثقہ اور ثبت ہیں بغیر کسی متعصب کے کون ان کی روایت کو رد کر سکتا ہے؟ جن کی علمی تحقیق سے امام یحییٰ القطانؒ اور ابن معینؒ وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل نے اپنے دامن بھرے اور ان کی تقلید کو اپنے گلے کا ہار بنایا ہے۔ دیکھئے طائفہ منصورہ اور مقام ابی حنیفہؒ وغیرہ۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا ص ۴۹۰ میں بحوالہ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۳۹ یہ لکھنا کہ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ وہ اہلحدیث کے ہاں سیئ الحفظ ہیں اور علیؒ بن المدینیؒ نے سخت ضعیف کہا ہے (محصلہ) تو یہ بے سود ہے خود مؤلف خیر الکلام ص ۴۸ الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ سیئ الحفظ جرح غیر مفسر ہے جو قابل اعتبار نہیں (محصلہ) اور اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ اگر تعدیل کرنے والے زیادہ ہوں تو ان کا اعتبار ہوگا۔ اور ہم مبسوط اور باحوالہ بحث عرض کر چکے ہیں کہ اکثر امت نے امام موصوفؒ کو ثقہ کہا ہے اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۱۰ میں لکھتے ہیں کہ اور مبہم جرح توثیق کے بعد مقبول نہیں ہوتی۔ اور ص ۲۲۲ میں لکھتے ہیں کہ توثیق کے بعد جرح غیر مفسر معتبر نہیں ہوتی پس وہ قطعاً ثقہ ہے ... الخ اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں اور ان صحیح روایات سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ، طلحہؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ اس روایت کو موصول بیان کرتے ہیں اور حضرت جابرؓ کا ہر روایت میں ذکر آتا ہے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے قاضی ابو یوسفؒ مکیؒ بن ابراہیمؒ اور محمدؒ بن الحسنؒ وغیرہ بلکہ بقول امام بیہقیؒ محدثین کی ایک خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور ظہر یا عصر کی قید بیان کرنے میں بھی امام ابو حنیفہؒ متفرد نہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور ہر ایک روایت کے ایک ایک راوی کی توثیق بھی عرض کر دی گئی ہے۔ اندریں حالات یہ دعویٰ کرنا کہ امام ابو حنیفہؒ اس میں متفرد ہیں یا ان کا کوئی شاگرد متفرد ہے، یا یہ روایتیں معلول ہیں۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ یہ

باحوالہ دلائل بھی دیکھیے اور مؤلف خیر الکلام کی ہوائی طفل تسلی بھی دیکھئے کہ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل ضعیف ہوتی ہے اور موصول بیان کرنے والے صرف امام ابو حنیفہ ہیں باقی رواۃ سب کے سب ضعیف یا مجہول ہیں ... الخ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

بیسویں روایت: امام دارقطنیؒ[۱] فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن مخلدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شعیبؒ[۲] بن ایوبؒ وغیرہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے زیدؒ بن حبابؒ[۳] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاویہؒ[۴] بن صالحؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الزاہریہؒ[۵] نے بیان کیا۔ وہ کثیرؒ[۶] بن مرہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو الدرداءؓ[۷] سے۔ وہ فرماتے ہیں:

---

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ زمان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ صـ۱۸۲)

[۲] حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ مشہور اور اعلم اھل عصرہ لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ صـ۳۷۴)

[۳] دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ ان کو ثقہ او رمامون کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۴۹)

[۴] علامہ ذہبیؒ ان کو العابد الثقہ اور الصدوق لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۱ صـ۳۶۲ و تذکرہ جلد ۱ صـ۳۲۰) علامہ خطیبؒ ان کو صاحب حدیث اور وانا محدث لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ صـ۴۴۳) امام ابن معینؒ علیؒ بن مدینیؒ، عجلیؒ، ابو جعفر بستیؒ، احمدؒ بن صالحؒ، دارقطنیؒ، ابن ماکولاؒ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن یونسؒ ان کو حسن الحدیث اور ابو حاتمؒ صدوق اور صالح کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ صـ۴۰۳)

[۵] ان کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

[۶] امام ابن معینؒ عجلیؒ، یعقوبؒ بن سفیانؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ اور دارقطنیؒ لا بأس به اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۲ صـ۲۱۸)

[۷] علامہ ابن سعدؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ اور ابن خراشؒ صدوق کہتے ہیں، نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۸ صـ۴۲۹) حافظ ذہبیؒ ان کو الفقیہ، امام عالم، عامل اور عالم اہل حمص لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۴۹)

سُئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افی کل صلوٰۃ قرأۃ قال نعم فقال رجل من الانصار وجبت ھٰذہ فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکنت اقرب القوم الیہ ما اری الامام اذا ام القوم الا کفاھم۔

(دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶)

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔ کیا ہر نماز میں قرأۃ ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ ایک انصاریؓ نے کہا پھر تو قرأت ضروری ہو گئی؟ ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں تمام اہل مجلس میں جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب تھا۔ آپ نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں یہی جانتا ہوں کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے۔

یہ روایت مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۴۴۸، نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۰۱، کتاب القرأۃ ص ۱۱۸ و سنن الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲، طحاوی جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ اور مجمع الزوائد جلد ۲ صفحہ ۱۱۰ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے۔ ہیثمیؒ فرماتے ہیں۔ (اسنادہ حسن) اس روایت میں حضرت ابوالدرداءؓ اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا۔ اور جواب بھی آپ ہی نے ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابوالدرداءؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اس لیے غیر رسول اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں یقیناً فرق اور تمیز کرتے ہوں گے۔ اور اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ آپ کے قریب تھا۔ اور آپ نے خطاب کرتے وقت اور جواب دیتے وقت خاص طور پر میری طرف توجہ فرمائی تھی۔ اگر اتنے قوی اور اندرونی قرائن کے ہوتے ہوئے بھی یہ روایت مرفوع نہیں تو کونسی روایت علم حدیث میں مرفوع ہوگی؟ چونکہ اس روایت میں سری اور جہری کی کوئی قید مذکور نہیں ہے اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ وہ ما زاد یا جہر پر محمول ہے۔ (صفحہ ۳۲۱) بالکل مردود ہے کیونکہ بقول مؤلف مذکور قرأت سورۂ فاتحہ سے ہی شروع ہوتی ہے (کما مر) پھر اس کو ما زاد پر کون حمل کرنے دیتا ہے؟ اور روایت میں لفظ قرأت ہے جہر نہیں قرأ کو جہر پر حمل بالکل بے بنیاد ہے۔ اور ایسی رکیک اور دور از کار توجیہات کون سنتا ہے؟

اعتراض: امام نسائیؒ، دارقطنیؒ اور بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت حضرت ابوالدرداءؓ پر موقوف ہے۔ زیدؒ بن حبابؒ نے اس حدیث کو مرفوع بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ (نسائی

جلد ا صـ۱۰ ، دار قطنی جلد ا صـ۱۲۶ ، کتاب القرأۃ صـ۱۱۸ اور یہی باتیں مؤلف خیر الکلام نے دہرائی ہیں۔ ملاحظہ ہو صـ۴۹۹ و صـ۵۰ و صـ۵۰۱) اور یہی کچھ ترجمان الحدیث ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء صـ۴۴ تا صـ۴۶ اور ماہ جنوری ۱۹۷ء صـ۲۲ تا صـ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ فلاں نے اس کو قوف کہا اور فلاں اور فلاں نے۔

جواب : یہ اعتراض قطعاً باطل ہے : **اولاً** — اس لیے کہ زیدؒ بن حبابؒ بالاتفاق ثقہ ہیں۔ اور ثقہ راوی کی متن اور سند میں زیادت بالاجماع مقبول ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل گذر چکی ہے۔ **وثانیاً** — یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حدیث کے موقوف اور مرفوع ہونے کی صورت میں تمام محدثین کے نزدیک روایت موصول اور مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ **وثالثاً** — اگر تنہا زیدؒ بن حبابؒ ہی اس کو مرفوع روایت کرتے تب بھی یہ حدیث مرفوع ہی ہوتی، کیونکہ زیدؒ بن حبابؒ ثقہ تھے۔ حالانکہ ان کے علاوہ ابو صالحؒ کاتب لیث رح (جن کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر میں نقل کیا جا چکا ہے) بھی اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد۲ ص ۱۶۲ وغیرہ اور اس کی سند بھی صحیح ہے) جب یہ دونوں راوی ثقہ ہیں۔ اور اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں تو یہ حدیث محدثین کے طے شدہ قاعدہ کی رو سے مرفوع ہی ہوگی اور امام بیہقی رح وغیرہ کی بلا دلیل اصول شکنی قابل التفات نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چونکہ یہ اکابر غلطی سے پہلے یہ نظریہ قائم کر چکے ہیں کہ قرأۃ خلف الامام کی اجازت ہے، اس لیے اس کے خلاف تمام روایات کو وہ خواہ مخواہ معلول ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر خالی الذہن ہو کر پہلے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو ملاحظہ کر لیتے تو یقیناً ایسی رکیک اور بعید از انصاف تاویلات سے ہرگز کام نہ لیتے، فسامحہم اللہ تعالیٰ اور مولانا مبارکپوری صاحبؒ صاحبؒ کا تو معاملہ ہی عجیب ہے وہ امام سفیان رح بن عُیَینہ رح اور حضرات صحابہ کرامؓ کے صحیح آثار سے تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو مقید کرنا گوارا نہیں کرتے، مگر اس مقام پر جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مطلق حدیث کو محض اپنی ناقص عقل اور فہم نارسا کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں (دیکھئے ابکار المنن صـ۱۶۷)،

اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ بلا دلیل کرتے ہیں :- ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

باقی جس روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو الدرداءؓ نے کثیر بن مُرّہؒ سے یہ کہا تھا جیسا کہ بعض کتابوں میں آتا ہے تو وہ اپنے مقام پر صحیح ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرفوعاً بھی یہ روایت آئی ہے اور موقوفاً بھی جب مسئلہ بیان کرنا مقصود ہوگا تو اپنا قول بیان کر دیتے ہوں گے۔ اور جب حدیث کا بیان کرنا ملحوظ ہوتا ہوگا تو مرفوعاً بیان کر دیتے ہوں گے کیونکہ ارسال اور رفع میں رواۃ کے حالات مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

احسن الکلام پر بلا وجہ محض تعصب کی وجہ سے تنقید کرنے والے بزرگ علامہ عراقیؒ کی ایک عبارت کا (جس کا ذکر ص۲۷ میں ہو چکا ہے) حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اختلاف ایک راوی کے تلامذہ میں ہے تو پھر ثقہ اور اوثق کے اصول پر اس کی تنقیح کی جائے گی۔ اگر دونوں اسناد ہمہ عیوب سے صاف ہوں گی تو پھر مزید قرائن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے گا جیسا کہ اس کی تفصیل ہم عرض کر آتے ہیں۔ (ترجمان الحدیث ص۲۷ ماہ جنوری ۱۹۷۵ء)۔

الجواب : پہلے بیان ہو چکا ہے کہ علامہ عراقیؒ کے حوالہ سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ ثقہ راوی جب کسی وقت روایت موصول اور کسی وقت مرسل بیان کرے یا کسی وقت مرفوع اور کسی وقت موقوف بیان کرے تو اس کے بارے میں صحیح تر فیصلہ یہ ہے کہ وہ روایت موصول اور مرفوع ہی قرار دی جائے گی نہ کہ مرسل و موقوف۔ علامہ عراقیؒ کی اس عبارت میں راوی کے تلامذہ میں ثقہ اور اوثق کی تنقیح کا کوئی تذکرہ نہیں اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اگر بعض ثقہ اور ضابطہ راوی حدیث کو متصل اور بعض مرسل بیان کرتے ہوں یا بعض مرفوع اور بعض موقوف بیان کرتے ہوں یا ایک ہی راوی کسی وقت مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا موقوف بیان کرتا ہے تو اس کے متعلق صحیح بات جو محققین محدثینؒ اور فقہاء اور ارباب اصول نے بیان کی ہے اور اسی کو علامہ خطیب بغدادیؒ نے صحیح قرار دیا ہے یہ ہے :

ان الحکم لمن وصله او رفعۂ سواء کان المخالف لۂ مثلۂ او اکثر او احفظ لانہ زیادۃ ثقۃ وھی مقبولۃ اھ (مقدمۂ شرح مسلم ص ۱۸)

کہ بے شک حکم اس کے موصول یا مرفوع ہونے کا دیا جائے گا۔ عام اس سے کہ اس کا مخالف اس جیسا ہو یا زیادہ ہو یا زیادہ حافظ ہو کیونکہ یہ زیادت ثقہ ہے جو بہر حال مقبول ہے۔

اس عبارت سے تین باتیں نمایاں طور پر ثابت ہیں:

(۱) اس صورت میں موصول اور مرفوع ہونے کا فیصلہ محقق محدثین رح فقہاء رح اور ارباب اصول کا ہے۔

(۲) ایک ہی ثقہ راوی سے یہ اختلاف ثابت ہو تب بھی یہی فیصلہ ہے یا ایک ہی راوی کے تلامذہ جدا جدا ہوں تب بھی یہی فیصلہ ہے۔

(۳) اس میں موصول اور مرفوع بیان کرنے والے کے مقابلہ میں اکثر یا احفظ یا اوثق کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ زیادت ثقہ ہے جو بہر حال مقبول ہے۔

اکیسویں[۲۱] حدیث: امام حاکم رح فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ سمرقندی رح نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن نصر رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن عبد الرحمٰنؒ بن وہبؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہمارے چچا (عبد اللہؒ بن وہبؒ) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ یعقوبؒ بن ابراہیم رح (امام ابو یوسفؒ) سے روایت کرتے ہیں اور وہ نعمانؒ بن ثابتؒ (امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) سے اور وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہؓ بن شداد ابو الولیدؓ[۱] سے اور وہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی خلف امام فان قرأۃ الامام لہٗ قرأۃ۔ (معرفت علوم الحدیث ص۱۲۷ و کتاب الآثار ص ۱۷)

کہ جو شخص امام کے پیچھے (اس کی اقتدا میں نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرآت ہی کافی اور بس ہے۔

---

[۱] چونکہ امام حاکمؒ نے اسی روایت کے سلسلے میں اسی صفحہ میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا ہے کہ ابو الولید عبد اللہؓ بن شدادؓ ہی کی کنیت ہے اس لیے ہم نے عبد اللہؓ بن شداد ابو الولید رض لکھا ہے جیسا کہ پہلے باحوالہ عرض کیا جا چکا ہے مؤلف خیر الکلام ص۱۱۵ میں اس کو مغالطہ کہنا انصاف پر مبنی نہیں ہے کیونکہ جب ابو الولید عبد اللہؓ بن شدادؓ ہی کی کنیت ہے تو ایک ہی شخصیت ہے۔

اس سند کے اکثر رواۃ کے تراجم پہلے نقل کئے جا چکے ہیں اور بعض جلیل القدر اور نامور محدث تھے البتہ احمدؒ بن عبدالرحمٰنؒ بن وہبؒ کا ترجمہ سن لیجئے اگرچہ ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ مصر کے اساتذہ اس کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں اور ابن یونسؒ فرماتے ہیں کہ اس سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ (میزان جلد ا ص۵۱ بحوالہ خیر الکلام ص۱۱۵) مگر جمہور محدثین کرامؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محمدؒ بن عبداللہؒ بن الحکمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے بارے میں کوئی کلام اور جرح نہیں سنی، عبدالملکؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابو زرعہؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث عبدانؒ ان کو مستقیم الامر کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ محدثین کے نزدیک ان کی حدیثیں قابلِ برداشت ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے پہلے ان میں کلام کیا تھا۔ لیکن بعد از تحقیق اس سے رجوع کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن خزیمہؒ متقدمین میں سے اور امام ابن قطانؒ متاخرین میں سے ان کو ثقہ سمجھتے ہوئے ان پر کلی اعتماد کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ا ص ۵۴، ۵۵، ۵۷) یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے صحیح اور مرفوع ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۱۱۵ میں اس کے جواب میں بھی وہی پرانا رونا رویا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ضعیف ہیں اور متفرد ہیں (محصلہ) جواب پہلے گذر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرات! ہم نے متابعات اور شواہد کے علاوہ بیس حدیثیں صحیح اور مرفوع (باسند اور سند کے ایک ایک راوی کی توثیق کے ساتھ آپ سے) باحوالہ عرض کی ہیں۔ اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے ہیں۔ اب ہم آخر میں آپکے سامنے چند اور حدیثیں بطور تائید عرض کرتے ہیں اور سند پوری نقل کر دیتے ہیں۔

بطور شاہد پہلی حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو سعید محمدؒ بن جعفرؒ بن خصیب ہرویؒ نے اپنی کتاب سے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن محمود سعدیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

اسمٰعیل سدیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن انسؒ نے بیان۔ وہ وہبؒ بن کیسانؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القراٰن فھی خداج الا وراء الامام۔ (کتاب القرأۃ ص۱۱۷)

ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو تو وہ نماز ناقص اور نامکمل ہوتی ہے۔ ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

یہ روایت صاف بتلاتی ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی گنجائش نہیں ہے اور اسی کو فریق ثانی ضروری سمجھتا ہے۔ ہاں البتہ امام اور منفرد کی کوئی نماز بغیر سورۃ فاتحہ کے مکمل نہیں ہوسکتی جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل سدیؒ کا دوسرا شاگرد سریؒ بن خزیمہؒ اس روایت کو حضرت جابرؓ سے موقوف روایت کرتا ہے۔ اس لیے یہ عبداللہؒ بن محمود سعدیؒ کی غلطی ہے کہ وہ اس کو مرفوع بیان کرتے ہیں اور یہی بات مؤلف خیر الکلام نے دہرائی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۵۰۴ و ۵۰۵)

الجواب: عبداللہؒ بن محمود سعدیؒ کو علامہ ذہبیؒ، الحافظ، الثقہ اور صوبہ مرو کا محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص۲۵۷) امام حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، محدث خلیلیؒ ان کو الحافظ اور عالم فن حدیث کہتے ہیں (ایضاً جلد ۲ ص۲۵۷) کیوں نہ ہو کہ حافظ اور ثقہ راوی کی زیادت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اور اصول شکنی کا ارتکاب نہ کیا جائے، کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، اور یہی امر قرین قیاس اور انصاف ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص۵۰۵ میں لکھا ہے کہ اس کے ثقہ ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا ضروری نہیں اھ یعنی محض اس لیے کہ مؤلف صاحب اور ان کی جماعت اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں محمدؒ بن اسحاقؒ جیسا کوئی ضعیف راوی ہوتا تو وہ ضرور مان لیتے اور پھر حدیث صحیح ہوجاتی، باقی امام مالکؒ کا یہ فرمانا کہ اس کی ٹانگ پکڑ دو یہ اس کے مرفوع ہونے کی نفی یا انکار کی قطعی دلیل نہیں۔ طحاوی کی شرح میں حذفاً بر جملہ

کا نسخہ بھی ہے (حاشیہ طحاوی جلد اص ۱۰۱) یعنی ان کی بات مان لو اور ان کے نقشِ قدم پر چلو اور اس کے پیش نظر خذوا بحبلہ کا مطلب بھی یہ ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امام مالکؒ کی تصدیق ہو گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دوسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو عبد اللہ حسینؒ بن محمدؒ ہروی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابوبکر احمدؒ بن محمدؒ بن عمرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عبد الرحمٰن محمدؒ بن احمد تمیمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو محمد سویدؒ بن سعیدؒ نے زبانی بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے علیؒ بن مسہرؒ نے بیان کیا۔ وہ عبید اللہؒ بن عمرؓ سے اور وہ نافعؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ (کتاب القرأۃ ص ۱۲۵) کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ یہ حدیث بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے واضح ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے موقوف مروی ہے یہ ابو محمد سویدؒ بن سعیدؒ کی غلطی ہے کہ اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں۔

جواب: علامہ ذہبیؒ سویدؒ بن سعیدؒ کو صاحبِ حدیث اور صاحب حفظ کہتے ہیں۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور کثیر التدلیس (لیکن اس روایت میں وہ حدثنا سے تحدیث کرتے ہیں) کہتے ہیں بغویؒ ان کا شمار حفاظِ حدیث میں کرتے ہیں۔ صالح جزرہؒ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (میزان جلد اص ۴۳۴) محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ مسلمہؒ بن قاسمؒ کا بیان ہے کہ وہ ڈبل ثقہ تھے۔ امام احمدؒ ان کو صالح یا ثقہ کہتے ہیں۔ میمونیؒ امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے ان میں کسی کا کلام اور جرح معلوم نہیں۔ امام ابوداودؒ ان کی صدوق ولا بأس بہ سے توثیق نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۷۵) جزریؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں اور امام مسلمؒ نے صحیح میں ان سے احتجاج کیا ہے۔ (حصن حصین ص ۱۱۴ باب ماء زمزم لما شرب لہ) اس لیے ضابطہ کے لحاظ سے یہ زیادت بھی صحیح ہو گی اور یہ امام مسلمؒ کی شرط پر صحیح ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص۵۰ میں بعض کتب رجال سے سوید بن سعید پر جرح کلمات نقل کر کے آگے لکھا ہے، پس نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حدیث قطعاً جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے جیسے کہ اوپر باحوالہ گزر چکی ہے وہ غلط ہے؟ اور کیا امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں جھوٹے راوی سے احتجاج کیا ہے؟ علاوہ ازیں علامہ خطیب بغدادیؒ اپنی سند کے ساتھ

انا محمد بن عبدۃ نا خارجۃ عن ایوب عن نافع عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ روایت کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو تاریخ جلد ا ص ۳۲۳)

جس کے راوی اس مذکور سند کے متابع ہیں اور بزعم مؤلف خیر الکلام وغیرہ اگر کچھ سقم بھی اس میں ہے تو دوسری سند سے پورا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس امر سے اختلاف تو نہیں کیا جا سکتا کہ بعض محدثینؒ نے اس پر جرح کی ہے اور جمہور اس کی توثیق کرتے ہیں اور مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث حسن تو ضرور ہے خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ مختلف فیہ آدمی حدیث حسن ہوتی ہے۔ (خیر الکلام ص۳۲۵) مگر اس حدیث کو قطعاً جھوٹ کہنا خالص اور سفید جھوٹ ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو العباس بالویہ بن محمدؒ بن بالویہ مرزبانیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرو بن زرارہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ علیؒ بن کیسانؒ سے اور وہ ابن ابی ملیکہؒ سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فلا صلوٰۃ لہ الا وراء الامام۔	یعنی ہر وہ نماز جس میں نمازی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز ادا نہ ہوگی۔ ہاں مگر امام کے پیچھے بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی نماز صحیح ہے۔
(کتاب القرأۃ ص ۱۳۷)	

یہ روایت بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل عیاں ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ اپنے استاد کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ علیؒ بن کیسانؒ کا نام

ہم نے صرف اسی سند میں سنا ہے۔

الجواب: حافظ ابن حجرؒ نے علیؒ بن کیسانؒ کا نہایت مختصر ترجمہ یوں قائم کیا ہے وھی علی بن سلیمان بن کیسان الکیسانی رح (تھذیب التھذیب جلد ۷ ص ۳۴۵) اور محدث فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم رح نے ان کو صالح الحدیث ما ادری بحدیثه بأسا کہا ہے (لسان ج ۴ ص ۲۳۲) لہذا ان کی حدیث حسن یا صحیح ہے (الدلیل المبین ص ۱۷۵) اور اگر بالفرض یہ مستور بھی ہو تب بھی مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ مستور بلکہ ضعیف کی روایت متابعت میں پیش کی جا سکتی ہے جیسا کہ باحوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

چوتھی حدیث: امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہ رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو حامد احمدؒ بن محمدؒ بن قاسم سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن عبدالرحمٰن سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ بن فضل رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عیسٰیؒ بن جعفر رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوریؒ نے بیان کیا۔ وہ اعمش رح سے اور وہ حکمؒ سے اور وہ عبدالرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰؒ سے اور وہ حضرت بلالؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا أقرأ خلف الامام۔ — کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں امام کے پیچھے قرأت نہ کروں۔

(کتاب القرأۃ ص ۱۳۹)

چونکہ قرأت خلف الامام کا مسئلہ اپنے ایجابی یا سلبی پہلو کے اعتبار سے کسی صحابیؓ سے مخصوص تھا اس لیے حضرت بلالؓ کو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر آپ نے خطاب کیا ہو گا۔ ورنہ حکم سب کے لیے عام ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ عیسٰیؒ بن جعفر رح تو ثقہ اور ثبت تھے۔ اس لیے اس میں غلطی اسماعیل رح بن فضل رح کی ہو گی کہ اس سند میں سفیان ثوریؒ کا ذکر ہے اور وہ اس سے بری ہیں اگر ان سے روایت ہوتی تو اس کے بارے میں اختلاف نہ ہوتا، اسمٰعیلؒ بن فضل رح اگر سچا ہے تو اس کی غلطی ہے۔ جھوٹا ہے تو اس کا افترا ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۹ بحوالہ خیر الکلام ص ۵۱ محصلہ)

الجواب: حدیث کو باطل ٹھہرانے کا یہ نرالا قاعدہ امام بیہقی رحمہ نے تجویز فرمایا ہے۔ کیا قرأت خلف الامام کی روایت کے امام ثوریؒ مجاز نہیں؟ یا ان کی کسی دیگر روایت میں اختلاف نہیں ہوا؟ اسے سند اور حدیث پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسمٰعیل رحمہ بن فضل رحمہ کا حال معلوم نہیں یہ اصول کی بات ہے، مگر مؤلف خیر الکلام کے بیان کے مطابق مستور اور ضعیف کی حدیث بطور تائید و متابعت پیش ہو سکتی ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور اصول کے لحاظ سے شاہد و متابع کا بھی کوئی فرق نہیں۔

قارئین کرام! اس مضمون کی کم و بیش ستائیس سندیں راقم الحروف کے بیاض میں ابھی اور موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں ہر ایک سند فریق ثانی کی اجازت یا وجوب قرأت سورۂ فاتحہ خلف الامام کی روایتوں سے اگر زیادہ قوی اور صحیح نہیں تو یقین کیجیے کہ ان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہمیں آپ سے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے سردست ان پیش کردہ احادیث پر ہی ہم اکتفا کرتے ہیں اور ان سے ایک حقیقت پسند انسان بخوبی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کیا بے دلیل ہیں؟ اور کیا ان کے پاس جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیثیں موجود نہیں؟ اور کیا جن کتابوں کے حوالے درج کیے گئے ہیں وہ اس دنیا میں موجود نہیں؟ اور کیا ان میں سورۂ فاتحہ اور ام القرآن وام الکتاب کی تصریح موجود نہیں؟ اور کیا یہ روایتیں صحاح ستہ وما وافق بہا میں نہیں پائی جاتیں؟ اور کیا یہ کتابیں دنیا کے اسلامی کتب خانوں میں موجود نہیں؟ اور کیا ان حدیثوں میں کوئی حدیث صحیح اور مرفوع نہیں؟ اور کیا ان تمام دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جمہور اہلِ اسلام (جو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ اور دیگر کسی قسم کی قرأت کے قائل نہیں ہیں) نماز جیسی اہم اور بنیادی عبادت سے سبکدوش ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی نماز بھی ناقص کالعدم بیکار اور محض باطل ہے؟ ان میں سے ایک ایک دعوے کا براہین کے ساتھ اثبات کیا جا چکا ہے اور فریق ثانی کے جملہ بے بنیاد دعاوی کا دلائل سے بطلان ثابت کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہ رضؓ، حضرت انس رضؓ بن مالک، حضرت عبداللہؓ بن بجینہؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت ابوبکرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہ رضؓ

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ، حضرت نواسؓ بن سمعانؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کی اکثر روایتیں صحیح اور مرفوع ہیں اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کی حدیث کے علاوہ حضرت ابوہریرۃؓ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایتوں میں سورۃ فاتحہ کا خاص لفظ موجود ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اور آپ یہ بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ فریق ثانی کے نزدیک بھی پیش کردہ احادیث کے تقریباً جملہ رواۃ کی ثقاہت، عدالت، امامت اور اتقان مسلّم ہے، محض کسی کے تفرد پر گرفت کی گئی ہے تو کسی کی تدلیس پر کسی کی تخلیط پر اور کسی کے تغیر یسیر پر اور کہیں مرفوع اور موصول روایت کو اصول شکنی کرتے ہوئے موقوف اور مرسل قرار دیا گیا ہے اور کہیں راویِ حدیث کی مرضی کے خلاف بلکہ خود مرفوع حدیث کے خلاف حدیث کا مطلب لیا گیا ہے اور ان تمام خلاف قاعدہ باتوں کے علاوہ محض اپنی مرضی سے مطلق قرأت کو مقید کرنے کی ناکام سعی کی گئی ہے اور ایسی ایسی کمزور اور رکیک وضعیف اور بعید از قیاس وانصاف تأویلات اور توجیہات اختیار کی گئی ہیں کہ فن اصول حدیث بھی ان سے نالاں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کے اس دعوے کی حقیقت بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ من کان لہٗ ...... الخ کے تمام طرق معلول ہیں۔

قارئین کرام! ذرا ان راویوں کا ان راویوں سے تقابل کر لینا جن کی روایتوں سے فریقِ ثانی نے استدلال کیا ہے کیونکہ ع: وبضدھا تتبین الاشیاء

ہم دوسرے باب کو یہاں ختم کرتے ہیں اور تیسرا باب شروع کرتے ہیں۔ واللہ المستعان وھو نعم المعین۔

اہلِ اسلام سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد دینی مسائل میں جن حضرات کی طرف نگاہیں اُٹھ سکتی ہیں۔ وہ شمع نبوت کے پروانے اور فیض رسالت سے مستفید حضرات صحابہ کرامؓ کی مخلص جماعت ہی ہو سکتی ہے اور ان کے بعد حضرات تابعینؒ کا دور ہے کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جو خیر القرون کے درخشندہ ستارے تھے، جن کی سعی بلیغ کی بدولت دنیا سے کفر و شرک میں روشنی پھیلی، بدعات و رسوم کا خاتمہ ہوا۔ جہالت و تاریکی دنیا سے مٹی اور علم و عرفان کی بارش سے دلوں کی دنیا میں ایمان و بصیرت کی شادابی پیدا ہوئی۔ نیز یہ بات بھی مخفی نہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ شرف صحبت کی برکت سے سب کے سب عادل، ثقہ، متقی، خدا پرست اور پاکباز تھے۔ لیکن فہم قرآن اور تدبر حدیث میں سب برابر نہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کے آپس میں مختلف درجات اور متفاوت مراتب تھے۔ چنانچہ امام مسروقؒ (المتوفی ۶۳ھ جو امام ماہر الفقیہ اور واحد الاعلام تھے تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۴۶) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرات صحابہ کرامؓ سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان سب کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت، پھر میں نے ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود پر ختم ہو گیا ہے (طبقات ابن سعد جلد ۲ ص۲۵، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴ و مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۶۲ مع شرح العراقیؒ) امام حاکمؒ نے بھی امام مسروقؒ سے یہ روایت نقل کی ہے، اس میں انھوں نے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابو الدرداؓ، اور حضرت ابو موسٰی الاشعریؓ کا نام لیا ہے (مستدرک جلد ۳ ص ۴۶۵ سکت عنہ الحاکمؒ والذہبیؒ) امام شعبیؒ (المتوفی ۱۰۳ھ جو امام حافظ، فقیہ، متقن اور علامۃ التابعین تھے۔ تذکرہ جلد ۱ ص۷۴) کا بیان ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہؓ میں دینی مسائل میں فیصلہ کرنیوالے چھ حضرات تھے۔ تین مدینہ طیبہ میں اور ان کے نام یہ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت اور تین کوفہ میں، ان کے اسماء یہ ہیں، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابو موسٰی الاشعریؓ (مستدرک جلد ۳ ص ۴۶۵ وسکتا عنہ)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل کی ترویج اور اشاعت کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات تھے، پہلا طبقہ وہ ہے جس سے مسائل تو رائج ہوئے ہیں مگر کم۔ اور دوسرا طبقہ متوسط رہا ہے اور تیسرا طبقہ وہ ہے جن سے دین کی بہت زیادہ اشاعت اور ترویج ہوتی ہے۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۱۱) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے دین، علم اور فقہ کی اشاعت ہوئی ہے ان میں حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ پیش پیش تھے۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص۵)۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ ان حضرات میں بیشتر وہ ہیں جو امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ ؎

وفاؤں کے ہزاروں شبے چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

حضرت ابو موسٰی الاشعریؓ وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں عرض کی جا چکی ہیں، اسی طرح

حضرت ابوالدرداءؓ کی صحیح اور مرفوع روایت بھی پیش کی جا چکی ہے اور اس کے موقوف تسلیم کرنے میں تو فریق ثانی کو بھی کسی طرح کا کوئی تامل نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا صـ۵۲۵ میں یہ کہنا کہ یہ ان کا اپنا خیال تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کے مقابلہ میں خیال پر اڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا، اس لیے انھوں نے اس پہلے قول سے رجوع کیا۔ بالکل ایک بے بنیاد دعوٰے ہے۔ کسی صحیح روایت سے ان کا رجوع ثابت نہیں۔ لفظوں کے ہوائی قلعہ سے کچھ نہیں بنتا اور اس کے خلاف جو روایت ان سے آتی ہے اس کا ذکر جلد دوم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔ اب اس کے بعد بعض حضرات صحابہ کرام رضؓ اور تابعین رحؒ و اتباع تابعینؒ کی بعض روایتیں اور آثار سُن لیجئے:

اثر حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ (المتوفی ۷۴ھجر) امام مالکؒ نافعؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عبد اللہؓ بن عمرؓ کان اذا سئل ھل یقرأ احد خلف الامام قال اذا صلّٰی احدکم خلف الامام فحسبہ قرأۃ الامام واذا صلّٰی وحدہ فلیقرأ وکان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام۔ (موطا امام مالکؒ صـ۲۹ و دارقطنی صـ۱۵۲ وغیرہ)

کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے جب یہ سوال کیا جاتا تھا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی نمازی قرأت کر سکتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی آدمی امام کی اقتداء کر چکے تو اس کو امام کی قرأت ہی کافی ہے اور جب کوئی اکیلا نماز پڑھے تو اس کو قرأت کرنی چاہیئے اور ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے

امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ نافعؒ الامام اور العلم تھے۔ (تذکرہ، جلد ۱ صـ۹۴) امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ اصح الاسانید یہ ہے مالکؒ عن نافعؒ ابن عمرؓ (ایضاً) اس سے زیادہ قوی سند فن حدیث میں تقریباً محال ہے، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور احد الاعلام فی العلم والعمل تھے۔ وہ اپنی علمی اور عملی قابلیت کی بنا پر خلافت اور حکومت کے

مستحق تھے۔ (ایضاً جلد ا ص ۳۵) بہر حال یہ روایت صحیح ہے اور قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ
کان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام جہر   عبداللہؓ بن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے
اولم یجہر۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۶)   تھے۔ امام جہر سے پڑھتا یا آہستہ (وہ خاموش رہتے تھے)

اور میر صاحبؒ کو بھی اقرار ہے کہ موطا کی مسند روایت صحیح ہوتی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۲ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے۔

اِعتراض: مُبارکپُوری صاحبؒ سے جب اس کی سند پر کلام کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکی اور چونکہ حضرت ابن عمرؓ حدیث رفع یدین کے راوی تھے۔ اِس لیے اس روایت کو اپنے حال پر چھوڑ کر آگے نکلنا بھی گوارا نہ ہو سکا۔ تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کے اس اثر کا حضرت عمرؓ کے اثر سے (جو دارقطنی جلد ا ص ۱۲۰ وغیرہ میں ہے) تعارض ہے کہ انھوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت دی تھی اور چونکہ حضرت عمرؓ اپنے بیٹے ابن عمرؓ سے سنت کے زیادہ بڑے عالم تھے، (کاش کہ مبارکپوری صاحبؒ اپنے اس خود ساختہ قاعدہ پر ہی قائم رہتے تو بھی ایک بات تھی۔ صفدر) اس لیے حضرت عمرؓ کے اثر کو ابن عمرؓ کے اثر پر ترجیح ہو گی۔ (ابکار المنن ص ۱۹۵)

جواب: اگر تعارض کا یہی مفہوم ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں درجے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سنت کے زیادہ عالم تھے۔ اس لئے جب آپ نے امام کے پیچھے قرأت سے منع کیا ہے، تو حضرت عمرؓ کے اثر پر آپ کے ارشاد کو بہر حال ترجیح ہو گی، حضرت عمرؓ کا ایک اثر عنقریب ترک قرأت خلف الامام پر ذکر ہو گا اور جس اثر کا مُبارک پوری صاحبؒ نے حوالہ دیا ہے تو اس کی حقیقت بھی اپنے مقام پر واضح ہو گی۔ تعجب ہے کہ مبارکپوری صاحبؒ کا وجود بھی اجتماع نقیضین سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ یہاں تو یہ لکھ کر وقت پاس کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اپنے بیٹے ابن عمرؓ سے مجرد اعلم بالسنۃ ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ حضرت عمرؓ کے اثر کو ابن عمرؓ کے اثر پر ترجیح دی جا سکے۔ (ابکار المنن ص ۲۲۴)

شاید مولانا مُبارک پوری صاحبؒ کو جلدی سے پینترا بدلنے کا خاص لطف محسوس ہوتا

ہوگا۔ اور وہ ایسی رکیک اور بعید از قیاس توجیہ کرکے دل میں خوشی مناتے ہوں گے کہ

ع: کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مؤلف خیر الکلام نے اس صحیح اثر کا تقابل ان آثار سے کیا ہے جو کتاب القراۃ صلا اور صلا میں حضرت ابن عمرؓ سے اس کے خلاف آئے ہیں اور مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی صحیح ہے اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے (صلا) اور یہ بحث انھوں نے صلا ۳۷ میں کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان آثار میں سے ایک اثر کی سند میں ابو جعفرؒ رازی عیسٰی بن ماہان ہے جو متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے صدوق ہے اور ایک کا راوی یحیٰی بکاءؒ ہے وہ ضعیف ہے مگر ابن سعدؒ نے کہا ہے انشاء اللہ ثقہ ہے۔ الخ

الجواب: جب ہمارا پیش کردہ اثر آپ کے اقرار سے بھی صحیح ہے تو اس کے مقابلہ میں ضعیف راویوں کی روایتیں لے کر تنکوں کا پل بنانا کہاں کا انصاف ہے؟ بس صحیح لے لیں اور ضعیف کو چھوڑ دیں یہ دونوں راوی نرے متکلم فیہ نہیں بلکہ بہت زیادہ کمزور ہیں پھر کس قدر افسوس ہے کہ آپ ان کے اثر کو بھی صحیح کہہ رہے ہیں پھر صراحت و ابہام وغیرہ کی وجہ سے ترجیح دینا نری شعبدہ بازی ہے۔ صحیح اثر اور ضعیف کا کیا تقابل؟

اثر حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ (المتوفی ۷۸ھ) ان کا اثر بسند صحیح حدیث نمبر ۱۱ کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت کے قائل نہ تھے۔ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے (صلا ۵۱۹) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ صرف رکوع والی رکعت کو بدون فاتحہ صحیح سمجھتے تھے اور یہ روایت اسی پر محمول ہے اور اصول فقہ حنفیہ کی رُو سے مستثنٰی میں کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا لہٰذا مقتدی کے لیے اس سے وہ کوئی حکم ثابت نہیں کر سکتے (محصلہ صلا ۳۱)

الجواب: حرف مَنْ مؤلف مذکور کے نزدیک ویسے عام ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہاں شرطیہ ہونے کی وجہ سے عام ہے اور رکعۃً نکرہ ہے اور ساتھ موصوفہ اور خود مؤلف مذکور کے نزدیک نکرہ موصوفہ عام ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۸۳) پھر اس تخصیص کو کون مانتا ہے؟ غرضیکہ حضرت جابرؓ ہر رکعت میں اور ہر ایسے نمازی کے لیے جو مقتدی ہو یہ حکم بیان

فرماتے ہیں اور مؤلف مذکور کا یہ لکھنا کہ اصول فقہ حنفیہ میں مستثنیٰ میں کوئی حکم نہیں ہوتا بالکل بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ یہ بعض اصولیوں کا مسلک ہے۔ توضیح صہ ۲۹۵ سے صہ ۲۹۸ تک اس پر مبسوط بحث موجود ہے کہ استثناء میں حکم نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی ہوتا ہے لہٰذا یہاں مقتدی کے لیے نفی فاتحہ کا حکم بطریق منطوق ثابت ہے جیسے کلمۂ توحید میں الا اللہ ثابت ہے۔ مبارکپوری صاحبؒ نے یزید فقیرؒ کے اثر سے اس کا معارضہ کیا ہے مگر اس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ بلند پایہ فقیہ اور مدینہ طیبہ کے مفتی تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے انھوں نے بہت سے مفید علوم حاصل کیے تھے۔ (تذکرہ ۱ ص ۴۰) اگر سورۃ فاتحہ کے بغیر مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی، تو حضرت جابرؓ کو مرکز توحید و سنت کا مفتی کیسے انتخاب کر لیا گیا تھا، جو اس کے مخالف اور منکر تھے۔

اثر حضرت زیدؓ بن ثابت (المتوفی ۴۵ھ) امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے علیؒ[۱] بن حجرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ[۲] بن جعفرؒ نے بیان کیا۔ وہ یزیدؒ[۳] بن خصیفہؒ سے اور وہ یزیدؒ[۴] بن عبد اللہؒ بن قسیطؒ سے اور وہ عطاءؒ[۵] بن یسارؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت زیدؓ بن ثابت سے دریافت کیا؟ کیا امام کے ساتھ قرأت کی جاسکتی ہے؟

---

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر اور نسائیؒ ثقہ و مامون اور حافظ اور خطیبؒ ان کو صادق، متقن اور حافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ صہ ۳۳)

[۲] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، العالم اور الثقہ لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱ صہ ۲۳۱)

[۳] امام احمدؒ، ابو حاتمؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ، ابن معینؒ ان کو ثقہ اور حجت۔ ابن سعدؒ ان کو ثبت اور کثیر الحدیث اور حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۴۰)

[۴] ابن معینؒ ان کو لا بأس بہ، نسائیؒ ان کو ثقہ ابن عدیؒ ان کو مشہور ابراہیمؒ بن سعدؒ ان کو فقیہ اور ثقہ اور کثیر الحدیث اور ابن عبد البرؒ ان کو ثقۃ من الثقات کہتے ہیں (ایضاً صہ ۳۴۲)

[۵] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الربانی اور الفقیہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور جلیل اور علم کا ظرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۷۹)

قال لا قرأة مع الامام فی شیئ۔ انھوں نے جواب ارشاد فرمایا کہ امام کے ساتھ کسی نماز میں کوئی قرأت نہیں کی جا سکتی۔

(نسائی جلد ۱ ص ۱۱۱، مسلم جلد ۱ ص ۲۱۵، ابو عوانہ جلد ۲ ص ۲۰۶، طحاوی ۱ ص ۱۲۴)

حضرت زیدؓ بن ثابت کا یہ بسند صحیح اثر اس امر کی واضح دلیل ہے کہ امام کے ساتھ مقتدی کو کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کرنے کا حق نہیں ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے: من قرأ خلف الامام فلا صلوٰۃ لہ (موطا امام محمدؒ ص ۱۰۰ و کتاب القرأۃ ص ۱۴۷) کہ جس نے امام کے پیچھے قرأۃ کی تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ امام طحاویؒ رح فرماتے ہیں کہ ہم سے یونس بن رح عبد الاعلیٰ رح نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن وہبؒ نے بیان کیا وہ حیوۃؒ بن شریحؒ سے اور وہ بکرؒ بن عمروؒ سے اور وہ عبید اللہؒ بن مقسم رح سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے قرأت خلف الامام کے بارے میں:

انہ سال عبد اللہ رض بن عمر رض و زید رض بن ثابت و جابر رض بن عبد اللہ رض فقالوا لا تقرؤا خلف الامام فی شیئ من الصلوٰۃ۔ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۱۲ و اسنادہ صحیح) حضرت عبداللہؓ بن عمر رض، حضرت زید رض بن ثابت اور حضرت جابر رض سے سوال کیا۔ ان سب نے فرمایا کہ امام کے پیچھے تمام نمازوں میں کوئی قرأت نہ کرو۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ و زید رض بن ثابت گفتہ لا قرأۃ مع الامام فی شیئ رواہ مسلم و عن جابر رض بمعناہ و ھو قول علی رض و ابن مسعود رض وکثیر من الصحابۃؓ (ھدایۃ السائل ص ۱۹۳) اور امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رض، حضرت زید رض بن ثابت اور حضرت ابن عمر رض امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ (جزء القرأۃ ص ۳) علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ حضرت زید رض بن ثابت کاتبِ وحی تھے۔ اور قرآن کریم کے جمع

لہ امام طحاوی رح کا ذکر آئے گا، ابن وہبؒ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱ میں گذر چکا ہے۔ یونسؒ بن عبد الاعلیٰ رح کو امام ابو حاتم رح اور نسائی رح ثقہ کہتے ہیں۔ علیؒ بن الحسن رح اور مسلمہ رح بن قاسم رح ان کو حافظ حدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان رح ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۴۱) حیوۃؒ بن شریح رح الامام القدوۃ شیخ دیار المصریۃ اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۱) بکرؒ بن عمرو رح کو ابو حاتم رح شیخ اور ابن یونس رح صاحب عبادت (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی، حضرت عمر رضؓ جب حج وغیرہ کے لیے تشریف لے جاتے تو ان کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کر کے جاتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صد ۲۹) اور نواب صاحبؒ کے بیان سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ترک قرأت بعض یا چند حضرات صحابہ کرام رضؓ کا عمل اور فتویٰ نہ تھا بلکہ اس مسلک پر حضرات صحابہ کرام رضؓ کی بھاری اکثریت تھی۔ وکثیر من الصحابۃ رضی اللہ عنہم۔

اعتراض : امام بیہقی رحؒ، امام نووی رحؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ نے اس اثر کی یہ تاویل کی ہے کہ اس اثر میں قرأت سے مراد ماذاد علی الفاتحۃ کی قرأت ہے یا قرأت سے جہر مراد ہے (بیہقی جلد ۲ صد ۱۶۳، شرح مسلم جلد ۱ صد ۲۱۵ وابکار المنن صد ۱۹۶)

جواب : یہ تاویل قطعاً باطل ہے کیونکہ اگر قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث سے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ثابت ہوتی تو تطبیق کے لیے یہ تاویل اختیار کی جا سکتی تھی۔ حالانکہ قرآن کریم اور صحیح ومرفوع حدیثوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام کے پیچھے عام قرأت تو کیا جائز ہوتی سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، باقی حضرت عبادہ رضؓ بن الصامت وغیرہ کی روایتوں کا ذکر بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر آئے گا۔ کہ خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور جو حدیثیں صحیح ہیں۔ وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہیں، فریق ثانی کی یہ ستم ظریفی بھی قابل داد ہے کہ ایک طرف تو لا صلوٰۃ الخ کی روایتوں میں نکرہ پر لائے نفی جنس کو داخل سمجھ کر کے اتنی تعمیم مراد لی جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں کی کسی کتاب سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی اور دوسری طرف لا قرأۃ مع الامام فی شئ اور لا یقرأ خلف الامام فی شئ من الصلوٰۃ کو ایسا مقید کیا جاتا ہے کہ باوجودیکہ سورۃ فاتحہ ام القرآن اور قرآن عظیم ہے، مگر اس کی قرأت پر نہ تو لا نفی جنس اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اور نہ لفظ شئ اور یہ عجیب تر بات ہے کہ لا صلوٰۃ الخ میں نفی کمال تو مراد نہیں لی جا سکتی مگر یہاں لا قرأۃ مع الامام فی شئ میں نفس قرأت سے جہر مراد ہو سکتی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! اور ان تینوں حضرات رضؓ سے بیک وقت سوال ہوتا ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں

(بقیہ پچھلا صفحہ) وفضیلت اور دار قطنی رحؒ معتبر کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں اور یہ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ صد ۴۸۶) اور عبید اللہؒ بن مقسمؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب صد ۲۵۳)

دیتے کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرآت کی جا سکے۔ اور ان میں حضرت جابرؓ بھی ہیں، جو ببانگ دُہل قرآت سے ام القرآن کی قرآت مراد لیتے ہیں، بہر حال ان حضرات کی یہ تاویل قواعد اور اصول کے نیز صحیح احادیث کے خلاف ہوتے ہوئے۔ بعید از انصاف ہے، جو کسی طرح توجہ کی مستحق نہیں ہے اور صحیح اور مرفوع حدیثوں اور خود حضرت جابرؓ کے قول صریح کے مقابلہ میں یہ تاویل اس کی زیادہ مستحق ہے کہ ــــ ع:

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

اثر حضرت عبداللہؓ بن مسعود: امام ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الاحوصؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ منصورؒ سے اور وہ ابو وائلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے دریافت کیا:

اقرأ خلف الامام فقال ان فی الصلوٰة شغلا وسیکفیک قرأة الامام (الجوہر النقی جلد ۱ ص ۱۷۰)

کیا میں امام کے پیچھے قرآت کر سکتا ہوں، حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ نماز میں امام قرآت میں مشغول ہے اور تجھے امام کی قرآت ہی کافی ہو جائے گی۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں چنانچہ علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں و رجالہٗ موثقون ـــ (مجمع الزوائد جلد ۲ صلا) کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ص ۵۲۱ میں لکھتے ہیں کہ صحیح ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اثر مطلق ہے۔ اس میں فاتحہ کا بالخصوص ذکر نہیں ... الخ

الجواب: مطلق کی نفی سے مقید کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں نہ تو ان کا کوئی اثر صحیح ہے اور نہ ام الکتاب کی تصریح ہے پھر کیوں اس صحیح اثر کو رد کیا جاتا ہے؟ اس کے صحیح نہ ہونے کی بحث جلد دوم میں آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ ازیں اس کو مطلق (کہ فاتحہ کو نہ شامل نہ ہو) کہنا بھی درست نہیں کیونکہ ایک روایت

---

[1] امام ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱۳ میں اور منصورؒ و ابو وائلؒ کا باب اوّل میں حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ابو الاحوصؒ کا نام سلامؒ بن سلیمؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الثقات لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ ۲۳۰)

میں یوں تصریح آتی ہے جو بطور تائید پیش کی جا رہی ہے۔

ان ابن مسعود رضؓ کان لا یقرأ خلف الامام فیما یجھر فیہ وفیما یخافت فیہ فی الاولیین ولا فی الاخریین و اذا صلّٰی وحدہ قرأ فی الاولیین بفاتحۃ الکتاب وسورۃ ... الخ

(موطا امام محمد ص ۹۶)

کہ عبد اللہ ابن مسعودؓ امام کے پیچھے نہ جہری نماز میں قرأۃ کرتے تھے اور نہ سری نماز میں نہ پہلی دو رکعتوں میں اور نہ پچھلی دو رکعتوں میں اور جب اکیلے نماز پڑھتے تھے تو پہلی دو نوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ بھی پڑھتے اور دیگر کوئی اور سورت بھی۔

ان کی اس مفصل روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت میں فاتحہ خصوصیت سے شامل ہے۔

اس کی سند یوں ہے: محمدؒ بن ابانؒ بن صالح القرشیؒ (اس پر محدثین کرام رح نے کلام کیا ہے، مگر مؤلف خیر الکلام وغیرہ کی صریح عبارات عرض کی جا چکی ہیں کہ تائید اور متابعت میں ضعیف حدیث بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس کو تائید اور متابعت میں پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)

عن حماد رح عن ابراھیم رح عن علقمۃ بن قیس رضؓ ان عبد اللہ بن مسعود رضؓ ... الخ

باقی تمام راوی ثقہ ہیں اور علقمہ بن قیسؒ کے اثر میں ان کے تراجم آرہے ہیں۔ امام بیہقیؒ نے حضرت ابن مسعود رضؓ کا ایک اثر یوں نقل کیا ہے

لان اعضّ علٰی جمر الغضا احبّ الیّ من ان اقرأ خلف الامام۔

(کتاب القرأۃ ص ۱۱۶)

یعنی یہ کہ میں جنڈ درخت کے جلتے کوئلوں کو منہ میں پکڑوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کروں اور پڑھوں — (اور ظاہر ہے کہ قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے)

دوسری سند: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رح اور ابو سعید رح بن ابی عمروؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو العباس محمدؒ[1] بن یعقوبؒ نے بیان

---

[1] حافظ ابو عبد اللہ رح اور شعبہ رح کا ترجمہ باب اول میں حضرت مجاہد رح کے اثر کے ذیل اور ابن مہدی رح کا سعیدؒ بن المسیبؒ کے اثر کے تحت اور ثوریؒ کا مقدمہ میں گذر چکا ہے۔ ابو العباسؒ کو علامہ ذہبی الامام الثقۃ محدث المشرق لکھتے ہیں (ایضاً ۳ ص ۷۳)

کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارونؒ رح بن سلیمان رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمٰن رح بن مہدیؒ نے بیان کیا وہ سفیان (ثوریؒ) سے اور شعبہ رح سے روایت کرتے ہیں وہ دونوں منصورؒ سے اور وہ ابو وائل رح سے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود سے سوال کیا:

عن القرأة خلف الامام فقال انصت للقرآن فان فی الصلوٰة شغلا وسیکفیک ذلک الامام۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۰)

کہ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جاسکتی ہے؟ حضرت عبداللہ رضؓ نے فرمایا کہ قرآن کے لیے خاموش رہو۔ امام نماز کے اندر قرأت میں مشغول ہے۔ اور تجھے امام کی قرأت کافی ہے۔

حضرت ابن مسعود رضؓ کے ان صحیح آثار سے معلوم ہوا کہ وہ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے، ان کا ترجمہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ان پر کلی اعتماد باب اوّل میں وضاحت اور صراحت سے گذر چکا ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ کہتے ہیں: (۱) حضرت ابن مسعود رضؓ نے انصات کا حکم دیا ہے اور انصات جہری نمازوں میں ہوسکتا ہے۔

(۲) علقمہؒ کا بیان ہے کہ میں نے نماز میں حضرت ابن مسعود رضؓ کو قُل رَّبِّ زِدۡنِی عِلۡمًا پڑھتے سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت کے قائل تھے۔

(۳) عبداللہؒ بن زیاد اسدیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ظہر اور عصر کی نماز میں ابن مسعود رضؓ سے قرأت سنی ہے۔ (سنن الکبریٰ وکتاب القرأۃ)

جواب: امام بیہقی رح کے اعتراض کی جملہ شقیں مردود ہیں علی الترتیب جواب سن لیجئے

(۱) حضرت ابن مسعود رضؓ تمام سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہ تمام حضرات فقہاءؒ اور محدثین رح کے نزدیک مشہور و معروف ہے۔ (تعلیق الحسن جلد اص ۸۳) انصات کی پوری تحقیق باب اوّل میں آیت کے ذیل میں عرض کی جاچکی ہے اور فریقِ ثانی کا

---

[۱] یہ امام ابوالعباس رح کے جلیل القدر شیخ اور مشہور محدث تھے (دیکھئے تذکرہ جلد ۳ صہ ۴۳) علامہ ذہبیؒ ان کی سند کو صحیح سمجھتے ہیں (ایضاً جلد ا صہ ۳۰۳)

شبہ اور مغالطہ بھی نکال دیا گیا ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) امام بیہقی رح نے اس قول کی کوئی سند نقل نہیں کی اور خود امام بیہقی رح کا ارشاد ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ہرگز مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین، مجہول نامعتبر اور غیر معلوم راویوں سے اخذ کریں۔ (کتاب القرأۃ ص۱۲۷ طبع دہلی) علاوہ بریں اس روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ابن مسعود رح نے امام کے پیچھے یہ آیت پڑھی تھی۔ اور اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کہ قیام کی حالت میں پڑھی تھی۔ کیوں یہ ممکن نہیں کہ سجدہ یا تشہد وغیرہ میں بطور دعا یہ آیت پڑھی ہو۔ اور مزید برآں اس آیت سے اُم القرآن اور فاتحۃ الکتاب کے خاص لفظ پر استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

(۳) عبد اللہ رح بن زیاد اسدی رح کی روایت پر روایۃً اور درایۃً کلام اپنے موقع پر عرض کیا جائیگا۔ انشاء اللہ العزیز۔

تیسری سند: حضرت ابن مسعود رض سے تیسری سند کے ساتھ یہ الفاظ مروی ہیں:

قال انصت للقرأۃ فان فی الصلوۃ شغلا و سیکفیك ذلك الامام (طحاوی جلد ۱ ص۱۲۹ مجمع الزوائد جلد ۲ ص۱۸۵، کتاب القرأۃ ص۱۰۱، موطا امام محمد ص۹۶، فتاوی ابن تیمیۃ ۲ ص۱۳۵ و آثار السنن جلد ۱ ص۸۹ وغیرہ۔

فرمایا قرأت کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں امام قرأۃ میں مشغول ہوتا ہے اور وہی امام تمہارے لیے کافی ہے۔ (تمہیں الگ قرأت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

اعتراض: مبارک پوری صاحب رح لکھتے ہیں: (۱) سند میں وہیب رح بن خالد رح ہے، حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھا۔ لکنہ تغیر قلیلا باٰخرہ (تقریب ص۳۸۸) آخر عمر میں تھوڑا سا تغیر ان کے حافظہ میں آچکا تھا۔

(۲) اس اثر کی سند میں نصر رح بن مرزوق رح ہے اور مجھے اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔

(۳) اس میں خصیب رح واقع ہے نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ (ابکار المنن ص ۱۹۵)

جواب: یہ تمام شقیں باطل ہیں: (۱) ثقہ اور ثبت راوی کا تغیر یسیر اور قلیل مضر نہیں ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(۲) خصیبؒ سے خصیبؒ بن ناصح رح مراد ہیں۔ امام ابوزرعہ رح فرماتے ہیں ما بہ بأس ان شاء اللہ اور ابن حبان رح ان کو ثقات ہیں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۳ صہ ۱۴۳)

(۳) نصرؒ بن مرزوق رح کا ترجمہ اگر مبارکپوری صاحبؒ کو نہیں ملا تو کیا ہرج ہے۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں رجالہٗ موثقون (مجمع الزوائد جلد ص ۱۸۵) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور علامہ نیموی رح لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (آثار السنن جلد ا ص ۸۹) اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ نہ جاننے والوں پر جاننے والوں کو ترجیح ہوا کرتی ہے۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں ومن علم حجۃ علی من لم یعلم (نیل الاوطار جلد ا ص ۳۴۲) کہ جاننے والا نہ جاننے والے پر حجت ہے، یعنی جاننے والے کی بات نہ جاننے والے کی بات پر راجح ہوگی۔ حضرت عبد اللہؓ بن مسعودؓ کی بعض صحیح روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں اور متعدد سندیں ان سے اور بھی مروی ہیں۔ مگر ہمارا مقصد تمام روایات و آثار کا استیعاب نہیں صرف اپنے دعوای کو روشن کرنا ہے۔

اثر حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ: امام طحاویؒ رح فرماتے ہیں کہ ہم سے

لہ امام طحاویؒ ابو جعفر احمد بن محمدؒ بن سلامہ الحنفیؒ (المتوفی ۳۲۱ھ) علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ وہ الامام العلامہ اور الحافظ تھے اور انھوں نے بہترین کتابیں لکھی ہیں، محدث ابن یونسؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، ثبت فقیہہ اور بڑے عقلمند تھے۔ اور انھوں نے اپنے بعد کوئی اپنا نظیر نہیں چھوڑا۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۸) مسلمہؒ بن قاسم رح کا بیان ہے کہ وہ ثقہ جلیل القدر، فقیہہ البدن اور علماء کے اختلافات کے جاننے میں بڑی مہارت رکھتے تھے (لسان المیزان جلد ا ص ۲۷۶) حافظ ابو عمر رح بن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ وہ تمام فقہاء کے مذاہب پر گہری نگاہ رکھنے والے تھے۔ (الجواہر المضیہ جلد ا ص ۱۰۵) امام ابن ندیم رح فرماتے ہیں کہ وکان اوحد اھل زمانہ علماً و زھداً (الفہرست لابن ندیمؒ ص ۳۰۶) کہ وہ اپنے زمانہ میں علم و زہد میں یکتا تھے اور حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں: امام الحنفیۃ فی وقتہ فی الحدیث والفقہ ومعرفۃ اقوال السلف۔ اھ (اجتماع جیوش الاسلامیۃ ص ۹۶) کہ وہ اپنے وقت میں حدیث فقہ اور معرفت اقوال سلفؒ میں احناف کے امام تھے۔

ابراہیمؒ بن ابی داؤدؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو صالح[1] عبد الغفارؒ بن داؤد الحرانیؒ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حماد[2] بن سلمہؒ نے بیان کیا۔ وہ ابو جمرہ[3] سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ سے سوال کیا۔

اقرأ والامام بین یدی قال لا۔ یعنی کیا امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا۔ ہرگز نہیں۔

(طحاوی جلد۱ ص ۱۲۹ والجوہر النقی جلد۲ ص۱۷۰ وآثار السنن جلد۱ ص۸۹ وغیرہ)

اس صحیح روایت میں سرّی اور جہری کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ کا مسلک تھا۔

اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

(۱) حمادؒ بن سلمہؒ کا آخر عمر میں حافظہ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

(۲) غیرؒ از حضرت ابن عباسؓ سے اجازت قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرتے ہیں اور اس کی سند بالکل بے غبار ہے۔ (ابکار المنن ص۱۲۶)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے: (۱) تغیر یسیر کا محقق حکم پہلے لکھا جا چکا ہے اور حمادؒ بن سلمہ کا ترجمہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ امام احمدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حماد بن

---

[1] حافظ ابن حجرؒ ان کو من الحفاظ المکثرین لکھتے ہیں (لسان المیزان جلد۱ ص۲۷۵) کہ وہ حفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ علامہ یاقوت حمویؒ فرماتے ہیں کہ ۲۲۷ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے اور وہ ثقہ اور حفاظ حدیث میں تھے۔ محدث ابن یونسؒ ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث کہتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ بھی ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث کہتے ہیں اور امام ابن عساکرؒ بھی ان کو ثقہ من حفاظ الحدیث کی صفت سے یاد کرتے ہیں۔ (امانی الاحبار جلد۱ ص۷)

[2] وہ ثقہ اور فقیہ تھے۔ (تقریب ص۲۴۳)

[3] ان کی توثیق باب اول میں سعیدؒ بن المسیبؒ کے اثر کے تحت نقل ہو چکی ہے۔

[4] ان کا نام نصرؒ بن عمرانؒ تھا جو ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص۳۷۳) حضرت ابن عباسؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔

سلمہؒ پر اعتراض کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کے اسلام میں متہم سمجھو۔ اصل الفاظ یہ ہیں فاتھمہ علی الاسلام اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ گو یم حمادؒ بن سلمہؒ امام است تفردِ شِ ما دام کہ در مرویش مانعی از اصول نبود مضر نیست۔ (بدور الاہلہ ص ۳۳)

(۲) یہ اپنے مقام پر عرض کیا جائے گا کہ عیزارؒ کی روایت میں کوئی غبار ہے یا نہیں؟ علاوہ بریں حضرت ابن عباسؓ کی بسند صحیح دو روایتیں باب اوّل میں نقل کی جا چکی ہیں۔

ایک اور روایت: حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رضؓ بن عباسؓ سے سوال کیا گیا۔

قیل لہ ان ناسا یقرؤن فی الظھر والعصر فقال لو کان لی علیھم سبیل لقلعت السنتھم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ فکانت قرأتہ لنا قرأۃ وسکوتہ لنا سکوتا۔

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۱)

کہ کچھ لوگ ظہر اور عصر کی نماز میں قرأت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ اگر میرا ان پر بس چلتا تو میں ان کی زبانیں کھینچ لیتا۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرأت کی ہمیں بھی قرأت کرنی چاہیئے اور آپ نے سکوت اختیار کیا، ہمیں بھی سکوت کرنا چاہیئے۔

اس اثر میں اگرچہ خلف الامام کی قید مذکور نہیں ہے۔ لیکن بادنیٰ تامل یہ بات بخوبی معلوم ہو سکتی ہے کہ امام اور منفرد کو تو بالاتفاق قرأت کرنا ضروری ہے۔ پھر نہ معلوم حضرت ابن عباسؓ جیسے

لہ اس اثر کی سند کے راوی یہ ہیں: (۱) امام طحاویؒ (۲) ابن مرزوقؒ، ان کا نام ابراہیمؒ بن مرزوقؒ تھا۔ امام نسائیؒ ان کو صالح اور لا بأس بہ کہتے ہیں دارقطنیؒ ان کو ثقہ یخطئ کہتے ہیں۔ ابن یونسؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ ابن ابی حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور سعیدؒ بن عثمانؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۳ محصلہ)

(۳) وہبؒ بن جریرؒ ثقہ تھے (تقریب ص ۲۸۸) (۴) جریرؒ بن حازمؒ ثقہ تھے۔ (ایضاً ص ۶۶)

(۵) ابو یزید مدنی، ابو حاتمؒ، امام احمدؒ اور ابو داؤدؒ ان پر اعتماد کرتے تھے، ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص ۲۸۰) حافظ ابن حجرؒ ان کو مقبول کہتے ہیں (تقریب ص ۴۴۲) (۶) عکرمہؒ ثقہ تھے (ایضاً ص ۲۴۸) (۷) حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ صحابی ہیں۔

ترجمان القرآن اور حبر الامتہ ان لوگوں کی زبانیں کھینچنے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئے تھے؟ اگر ان کے بس اور قدرت میں ہوتا تو ضرور اپنا ارادہ پورا کر گذرتے، ناچار یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ لوگ امام کے پیچھے قرآت کرتے تھے اور حضرت ابن عباسؓ نے ان کی اس مذموم حرکت سے انتہائی نفرت کی اور یہ بھی مت بھولئے کہ پڑھنے والے ظہر اور عصر کی نماز میں پڑھتے تھے جو بالاجماع سری نمازیں ہیں اور یہ ممکن تھا کہ قرآت مازاد علی الفاتحہ کی قرآت پر حمل کر لیا جاتا، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ امام کے پیچھے مطلقاً قرآت کے قائل نہ تھے، اور گذر چکا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت میں امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحۃ الکتاب کے پڑھنے کی ممانعت آئی ہے۔ اور یہ بھی درست نہیں ہو سکتا کہ قرآت کو جہر پر حمل کر لیا جائے، اس لیے کہ قرآت کا تقابل سکوت سے کیا گیا ہے اور سکوت کے معنی آپ پہلے وضاحت کے ساتھ پڑھ چکے ہیں، بہرکیف خود اس اثر کے اندر ایسے قرائن موجود ہیں، جو اس امر کو متعین کر دیتے ہیں کہ یہ بحالتِ اقتدا امام کے پیچھے قرآت کرتے تھے۔ جس پر حضرت ابن عباسؓ طیش میں آکر یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ باقی اثر کے اس حصہ کا مطلب کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآت کی اور ہمارے لیے آپ کی اقتدا ضروری ہے اور آپ نے سکوت بھی کیا۔ اور ہمارے لیے سکوت میں بھی آپ کی پیروی لازمی ہے۔ تو اس کی پوری بحث سکوت کے ذیل میں کی جا چکی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بحالتِ امامت قرآت کی اور بحالتِ اقتدا سکوت اختیار کیا۔ یا یہ مطلب ہو کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے امام تھے۔ اور آپ کی قرآت ہم سب مقتدیوں کی قرآت تھی۔ اور آپ کا پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد کی قرآت کو ترک کر کے اس سے سکوت اختیار کرنا ہمارے لیے کافی ہوتا تھا تو اس لحاظ سے حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کی گویا یہ اثر تفسیر اور تشریح ہو گا۔ اس حصہ کا یہ مطلب ہو یا کوئی اور ہو ہمارا استدلال واضح ہے اور اس پر موقوف نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے ص۱۳۵ میں ہمارے اس مطلب کو "ایک قسم کی تحریف معنوی ہے" سے تعبیر کیا ہے اور دلیل یہ بیان

کی کہ بخاری ج ا صنا کی روایت میں ابن عباسؓ سے آتا ہے قرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما امر وسکت فیما امر... الخ امام بخاریؒ نے اس سے جہر مراد لی ہے اور اس پر باب الجھر بقرأۃ صلوٰۃ الصبح قائم کیا ہے اور پھر ص۳۱۹ اور ص۳۲۰ میں لکھتے ہیں کہ امام اسمٰعیلیؒ اور حافظ ابن حجرؒ یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن عباسؓ کو سرّی نمازوں میں قرأت کا شک تھا اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ نفی کرتے تھے مگر آخر میں قائل ہو گئے تھے لہٰذا اس سے مراد یا تو جہر ہے یا ان کا پہلا نظریہ ہے اور بعض حنفیہ کا مطلب قطعاً غلط ہے (محصلہ)

الجواب: مگر ہم نے استدلال بخاری کی روایت سے نہیں کیا بلکہ طحاوی کی روایت سے کیا ہے جس کے الفاظ اور ہیں اور اس میں تفصیل ہے اور ظہر اور عصر کی قید موجود ہے وہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پہلے قرأت میں شک یا انکار کرتے تھے تو بات قدرے معقول ہے مگر اس کا صحیح ثبوت درکار ہے اور درصورت صحت امام بخاریؒ کی روایت کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے مگر ان سے سرّی نمازوں میں قرأت اور ترک القرأۃ خلف الامام کی روایتیں بالکل صحیح ہیں اور دوسری روایتیں اس پایہ کی نہیں ہیں اس لیے ان کے آئینہ میں ان صحیح روایات کا مطلب لینا غلط ہے۔

اثر حضرات خلفاءِ راشدینؓ: امام عبدالرزاق رح فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن عقبہؒ[1] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں:

ان ابا بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ کانوا ینھون عن القرأۃ خلف الامام	کہ حضرت ابوبکرؓ (المتوفی ۱۳ھ) اور حضرت عمرؓ (المتوفی ۲۳ھ) اور حضرت عثمانؓ (المتوفی ۳۵ھ) امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔
(بحوالہ عمدۃ القاری جلد ۳ ص۶۷ واعلاء السنن جلد ۴ ص۵۸)	

امام عبدالرزاق رح اپنے مصنف میں داؤد بن قیسؒ[2] سے روایت کرتے ہیں اور وہ

---

[1] ثقہ اور حافظ تھے۔ (تقریب ص ۲۴۰)

[2] ثقہ اور فقیہ تھے (تقریب ۳۶۸) ثبت اور کثیر الحدیث تھے (تہذیب التہذیب ج۳ ص۱۹۶) حجت اور صغار تابعینؒ میں تھے (میزان الاعتدال جلد ۳ ص۱۴ ۲)

[3] امام شافعیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں امام احمد رح، ابوزرعہ رح، نسائی رح، ابوحاتم رح (باقی اگلے صفحہ پر)

محمدؒ بن عجلانؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

قال علیؓ من قرأ مع الامام فلیس علی الفطرۃ۔

(بحوالہ الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹)

کہ حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) نے فرمایا کہ جس شخص نے امام کے ساتھ قرآت کی تو وہ فطرت پر نہیں ہے۔

اور دارقطنی جلد اص ۱۲۶ کی روایت یوں ہے:

من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرۃ۔

کہ جس نے امام کے پیچھے قرآت کی اس نے فطرت کو کھو دیا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے داؤدؒ بن قیسؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن عجلانؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عمرؓ بن الخطاب قال لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرًا

(موطا امام محمد ص ۹۸)

کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا۔ کاش جو شخص امام کے پیچھے قرآت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالے جائیں۔

اور حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ:

ثبت عن علیؓ وسعدؓ وزیدؓ بن ثابت انہ قال لا قرأۃ مع الامام لا فیما اسر ولا فیما جھر

(بحوالہ الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹)

حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ امام کے ساتھ نہ سری نمازوں میں قرآت کیجا سکتی ہے اور نہ جہری نمازوں میں۔

حضرت علیؓ سے ایک دوسری روایت یوں مروی ہے، جو صرف متابعت کے طور پر نقل کی جاتی ہے:

من قرأ خلف الامام فلیس علی الفطرۃ۔

کہ جس شخص نے امام کے پیچھے قرآت کی وہ فطرت پر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ابن سعدؒ، ابن مدینیؒ اور ساجیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۹۸)

٭ اس کا ترجمہ باب دوم حدیث نمبر ۲ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ و منتخب کنز العمال[ص۱۸۷]) ہیں۔

اور گو موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن عجلان کی روایتیں مرسل ہیں لیکن جمہور ائمہ کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے جس کی تحقیق پہلے گذر چکی ہے۔ یہی اعتراض مؤلف خیر الکلام نے ص۵۱۴ میں کیا ہے کہ یہ دونوں اثر ضعیف ہیں کیونکہ یہ دونوں مذکور راوی صغار تابعین میں ہیں۔ حضرت عمرؓ سے ان کی لقار ثابت نہیں ہے۔ (محصلہ) ہم بھی ان کو مرسل مانتے ہیں، مگر معتضد ہے جو حجت ہے اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور یہ ایک دوسرے کے اعتضاد کے لیے کافی ہیں اور دوسری حدیثیں اس پر مستزاد ہیں، حضرت علیؓ کی دوسری روایت میں ابن ابی لیلیٰ رح اور مختار بن ابی لیلیٰ رح کمزور اور ضعیف ہیں۔ اور اسی وجہ سے مبارکپوری صاحبؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص۲۰۹) مگر ہم نے اس سے استدلال نہیں کیا۔ بلکہ اس کو محض متابعت میں نقل کیا ہے، اور بقول مؤلف خیر الکلام ان میں بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ ص۳۱۶) حضرات خلفاء راشدین رضا اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، ایسے جلیل القدر اور بلند مرتبہ صحابہؓ کی دینی خدمات اور دیگر علمی اور عملی فضائل کا کون انکار کر سکتا ہے؟ ہاں البتہ کوڑ مغز اور خیرہ چشم کی بات ہی الگ ہے۔ یہ وہی اکابر ہیں جن کو دنیا میں حضرت محمد رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے جنتی ہونے کی بشارت اور خوشخبری مل چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مومن کا خطاب عنایت فرما کر ابدی رضا کا پروانہ دے دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضا (المتوفی ۵۸ھ) اور حضرت عائشہ رضا (المتوفاۃ ۵۷ھ) کا اثر:

امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو یحییٰ سمرقندی[۱] رح نے بالمشافہ بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد رح بن[۲] نصر رح نے بیان کیا، وہ فرماتے

---

۱ ان کا نام محمدؒ بن اسحاق سمرقندیؒ ہے، جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے۔ علامہ ذہبیؒ نے (تذکرہ جلد ۲ میں ص ۲۰۱) ان کا نام ذکر کیا ہے

۲ علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ وہ الامام شیخ الاسلام اور الفقیہ تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص۲۰۱) حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور الحافظ تھے۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص۴۸۹) ابن حبانؒ ان کو احد الائمۃ فی الدنیا کہتے ہیں (ایضاً ص۴۹۰)

ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن یحییٰؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن یوسفؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ نے بیان کیا، وہ ابو صالح ذکوانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں:

انهما كانا يامران بالقرأة وراء الامام اذا لم يجهر (سنن الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۷۱)

کہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ دونوں اس بات کا حکم دیتے تھے کہ جب امام جہر سے قرأت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے قرأت کرنی چاہیے۔

دوسری سند: امام بیہقی رحؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن محمدؒ بن الحارث رحؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو محمدؒ بن حیانؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن عبداللہؒ بن رستہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شیبانؒ بن فروخ رحؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

۱؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ ۲ صفحہ ۱۸۱) ابو حاتم رحؒ ان کو امام اہل زمانہ اور ابوبکرؒ بن زیادؒ ان کو امیر المومنین فی الحدیث کہتے ہیں (ایضاً صفحہ ۱۰۲) حافظ ابن حجر رحؒ ان کو الحافظ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۵۱۱)

۲؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العابد اور شیخ الشام لکھتے ہیں، امام بخاریؒ ان کو افضل اہلِ زمانہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۱) امام عجلیؒ اور نسائی رحؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتم رحؒ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ صفحہ ۵۳۶)

۳؎ عاصم رحؒ بن بہدلہ رحؒ اگرچہ بعض محدثین نے خطار، اضطراب اور وہم کی وجہ سے ان میں کلام کیا ہے لیکن جمہور ان کو ثقہ کہتے ہیں چنانچہ امام احمدؒ، علامہ ابن سعدؒ عجلیؒ اور ابو زرعہ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن معینؒ ثقہ اور لا بأس به نسائیؒ ليس به بأس اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم رحؒ ان کو صداقت شعار اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ بزارؒ کا بیان ہے کہ مجھے کوئی ایسا محدث معلوم نہیں جو ان سے روایت نہ کرتا ہو۔ امام یحییٰؒ ان کو امام اعمشؒ کا ہم پایہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۹) علامہ ذہبیؒ ان کو حسن الحدیث لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ صفحہ ۵) حافظ ابن کثیرؒ عاصمؒ بن بہدلہ کی سند کو جید اور قوی کہتے ہیں (ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۵۳۶) امام حاکم رحؒ اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

عکرمہؒ بن زہیرؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ بن بہدلہ نے بیان کیا۔ وہ ابوصالحؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں:

انهما کانا یأمران بالقرأة خلف الامام فی الظهر والعصر فی الرکعتین الاولیین بفاتحة الکتاب وشیٔ من القرآن وکانت عائشہؓ تقرأ فی الاخریین بفاتحة الکتاب۔

(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۱)

کہ وہ دونوں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیتے تھے اور دونوں فرماتے تھے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا چاہیے اور حضرت عائشہؓ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ صرف ظہر اور عصر کی سرّی نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل اور اس پر عامل تھے۔ اور وہ دونوں پہلی رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ وشیٔ من القرآن کی قرأت کے بھی قائل تھے۔ اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اور اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے حضرت ابوہریرہ رضؓ قرأۃ سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ ہاں حضرت عائشہؓ صدیقہ کا اس پر عمل تھا، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کا حضرات صحابہ کرام رضؓ میں اور خاص طور پر فن روایت میں جو مقام اور رتبہ ہے اور دین کی جتنی خدمات ان سے سرانجام ہوتی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟

مبارکپوری صاحبؒ نے عاصم رحؒ بن بہدلہ رحؒ کی وجہ سے اس روایت پر کلام کیا ہے۔ (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ صد ۹۸) لیکن مولانا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ان کا موازنہ ذرہ محمدؒ بن

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ عاصمؒ بن بہدلہؒ کی روایت کو صحیح کہتے ہیں۔ (مستدرک جلد ۳ صفحہ ۴۱۶)

؎ امام احمد رحؒ ان کو ثقہ اور علامہ ذہبیؒ ان کو من اجل الناس وا وثقهم لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ا ص ۸۳) اصول حدیث اور محدثین کی تصریح کے مطابق یہ حدیث حسن، جید قوی اور صحیح ہے۔

اسحاق رحہ وغیرہ سے کر دیکھیں ۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۱۸ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی بظاہر صحیح ہے مگر اس میں ممانعت کا ذکر نہیں اور یہ اثر جہری نماز کی نفی میں صریح نہیں ۔

الجواب : ممانعت کا نہ سہی جہری نمازوں میں ترکِ قرآت کا ذکر تو ہے اور اذالم یجہر شرط اور قید ہے اور صراحت کیا ہوتی ہے ؟ اور ترکِ قرآت خلف الامام کی وجہ سے بطلانِ نماز کی رٹ تو باطل ہوتی ۔

حضرات ! قارئین کرام ! ابھی حضرات صحابہ رضہ کرام کے بہت سے آثار پیش کیے[ل]

ل امام ابن قدامہ رحہ نے کئی سندات کے ساتھ حضرت علی رضہ، حضرت ابن عباس رضہ، حضرت ابن مسعود رضہ، حضرت ابو سعید رضہ، حضرت زید رضہ بن ثابت، حضرت عقبہ رضہ بن عامر، حضرت جابر رضہ، حضرت ابن عمر رضہ اور حذیفہ رضہ کی روایتیں نقل کی ہیں (مغنی ابن قدامہ رحہ جلد ۱ ص ۶۰۵) اور حافظ ابو عمر رحہ بن عبد البر رحہ کے حوالے سے حضرت علی رضہ، حضرت سعد رضہ اور حضرت زید رضہ بن ثابت کے نام نقل کیے جا چکے ہیں ۔ اور امام بخاری رحہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضہ، حضرت زید رضہ بن ثابت اور حضرت ابن عمر رضہ امام کے پیچھے قرآۃ کے قائل نہ تھے (جزء القرآۃ ص ۳) اور علامہ عینی رحہ نے مانعین قرآت خلف الامام میں حضرت ابو بکر رضہ، حضرت عمر رضہ، حضرت عثمان رضہ، حضرت علی رضہ، حضرت عبد الرحمٰن رضہ بن عوف، حضرت سعد رضہ بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ رضہ بن مسعود، حضرت زید رضہ بن ثابت اور حضرت ابن عباس رضہ کا ذکر بھی کیا ہے اور اس پر ایک روایت بھی وہ نقل کرتے ہیں (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷) نیز علامہ عینی رحہ اور ملا علی القاری رحہ لکھتے ہیں کہ اسی ۸۰ حضرات صحابہ کرام رضہ سے امام کے پیچھے قرآت کی ممانعت کا ثبوت ملتا ہے ۔ (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷ اور شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳) بلکہ امام شعبی رحہ نے تو یہاں تک فرمایا ہے : قال ادرکت سبعین بدریا کلھم یمنعون المقتدی عن القرأۃ خلف الامام (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵) کہ میں نے ستر ۷۰ عدد بدری حضرات صحابہ کرام رضہ کو دیکھا ہے کہ وہ سب مقتدی کو امام کے پیچھے قرآت کرنے سے منع کرتے تھے اور صاحبِ ہدایہ نے جلد ۱ ص ۱۰۱ میں تو اجماع صحابہ رضہ کا دعوی کیا ہے ، حافظ ابن عبد البر رحہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحہ وغیرہ کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں (کہ آیت کا شان نزول بالاجماع خلف الامام کا مسئلہ ہے ، اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآت کرنا منکر شاذ اور مخالف اجماع ہے) (باقی اگلے صفحہ پر

جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارا مقصد ان کا استیعاب نہیں ہے بلکہ ہم نے عمداً صرف ان حضرات صحابہ کرامؓ کے جن پر زیادہ تر علم حدیث فقہ اور دین موقوف ہے۔ (مثلاً حضرات خلفائے راشدینؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عائشہؓ وغیرہم) صحیح آثار صرف بطور نمونہ عرض کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جمہور اہل اسلام کا دامن قرآن کریم صحیح اور مرفوع احادیث کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ کی کیسی باعظمت جماعت سے وابستہ ہے اور آخر میں ہم صرف ایک ہی اثر نقل کر کے حضرات صحابہ کرامؓ کے ان پیش کردہ آثار پر اکتفا کرتے ہیں۔ وفیہا کفایۃ لمن لہٗ ھدایۃ۔

اثر حضرت سعد رضؓ (المتوفی ۵۵ھ) امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ داؤدؒ بن قیسؒ نے ابن نجادؒ سے روایت کی ہے جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں تھے اور وہ حضرت سعدؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ جمرۃ (جزء القرأۃ ص۱۱ و موطا امام محمد ص۹۸) کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو، اس کے منہ میں آگ کی چنگاری[1] ڈال دوں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) صاحب ہدایہؒ کا یہ دعویٰ مبنی بر انصاف معلوم ہوتا ہے اور محض تعصب ہی پر اس کو حمل کر لینا قرین قیاس نہیں ہے (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

[1] یہ سخت الفاظ صرف حضرت سعدؓ ہی سے منقول نہیں بلکہ دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے بھی اسی طرح کے تہدیدی الفاظ مروی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالنا چاہیے (موطا امام محمد ص۹۸ منتخب کنز ص۱۸۷ والجوہر النقی ۲ ص۱۶۹، طحاوی ج۱ ص۱۲۹) اور ایک روایت میں نتن (بدبودار چیز) اور ایک میں رضف (گرم پتھر) کے الفاظ آئے ہیں (جزء القرأۃ ص۱۱ وغیرہ) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأۃ کرنیوالے کے منہ میں آگ بھر دی جائے (زیلعی جلد ۲ ص۱۶) اور حضرت اسودؒ تابعی کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے، اس کے منہ میں مٹی ڈالی جائے (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹) اور حضرت علقمہؒ تابعی سے مٹی اور رضف دونوں الفاظ منقول ہیں (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹) اور حضرت زیدؓ بن ثابت فرماتے ہیں کہ امام (باقی اگلے صفحہ پر)

اعتراض: امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے: (۱) ابنِ بجادؒ مجہول ہے۔ (۲) آگ کی چنگاری اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور انسانوں کو ایسی سزا دینے کی صحیح حدیث میں نہی آتی ہے (بخاری جلد ۱ ص ۴۲۳ وغیرہ) (۳) حمادؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنیوالے کا منہ شکر سے بھر دیا جاتے۔

جواب: حضرت امام بخاریؒ کا یہ اعتراض تمام شقوں کے ساتھ مخدوش ہے ؟ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ کریں: (۱) ابن بجادؒ کی جہالت کا دعویٰ کر کے اس اثر سے اغماض کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وولد سعدؓ بن ابی وقاص الی سنۃِ خمسین ومأتین فیھم فقھاء وائمہ وثقات و حفاظ۔ (معرفت علوم الحدیث ص۳۱)	کہ حضرت سعد رضؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں ۲۵۰ھ تک بڑے بڑے فقیہ، امام ثقہ اور حافظ پیدا ہوتے رہے ہیں۔

اور امام بخاریؒ کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس لیے ابن بجادؒ (جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں تھے) کی جہالت کو بہانہ بنا کر اس اثر کو رد کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ کی عبارت کے پیشِ نظر ابن بجادؒ ثقہ حافظ اور امام تھے۔ علامہ عینیؒ عبد الرزاقؒ بن ہمامؒ کے طریق سے روایت نقل کرتے ہیں:

عن داؤدؒ بن قیسؒ عن محمدؒ بن بجادؒ (بکسر الباء الموحدۃ وتخفیف الجیم) عن موسیٰؒ بن سعدؓ	کہ داؤدؒ بن قیسؒ محمدؒ بن بجادؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰؒ بن سعدؓ سے روایت کرتے ہیں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے پیچھے قرأت کرنیوالے کی نماز ہی سرے سے نہیں ہوتی (موطا امام محمد ص۱۰۱) اگرچہ ان میں بعض آثار کمزور ہیں، مگر کچھ صحیح بھی ہیں اور یہ سب مل ملا کر اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کی بھی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے، اگر نص قرآنی اور صحیح و مرفوع احادیث اور جمہور ائمہؒ کا اس بات پر اتفاق نہ ہوتا کہ امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے تو یہ الفاظ یقیناً غلو اور زیادتی پر محمول ہو سکتے تھے مگر سابق ابواب کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد قرآن کریم اور صحیح حدیث کی مخالفت کرنیوالے کے حق میں یہ الفاظ زیادہ سنگین نہیں ہیں۔ ہاں البتہ ان دلائل سے جو شخص ناواقف ہو اور یہ ناواقفی بھی محض دیانت پر مبنی ہو تو اس کے لیے مزید احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً وہ حضرات جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور جن کی نگاہوں سے اس طرح یکجا جمع کیے ہوئے دلائل نہیں گذر سکے مگر یہ سب دلائل دیکھ کر ضد کرنیوالے کے لیے یہ الفاظ بالکل مناسب ہیں۔

بن ابی وقاص قال ذکر لی ان سعدؓ بن وقاص قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ حجر (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷)	کہ انھوں نے حضرت سعدؓ سے روایت کی انھوں نے فرمایا کہ میں پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأۃ کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض وُلد سعدؓ سے مراد موسیٰؒ بن سعدؓ ہیں۔ محدث مولانا محمد حسن صاحب فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ

رجال اسنادہ ثقات (الدلیل المبین ص ۳۴۲)	اس روایت کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔

لہٰذا مولف خیر الکلام کا عثمانؒ بن عبد الرحمٰن وقاصیؒ کے متروک اور جھوٹا ہونے سے اس مذکور سند کے ضعف پر استدلال کرنا (ملاحظہ ہو ص ۵۲۳) باطل ہے کیونکہ یہ مذکورہ روایت صحیح اور اس کی سند کے روات ثقہ ہیں جن میں ابن بجادؒ بھی ہیں اور اغلب ہے کہ جزء القرآۃ میں ابن بجادؒ ہی کا ابن نجادؒ بنا ہوا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس مسئلہ میں جمہور صحابہ کرامؓ کے دو یا تین قول ہوں تو ان سب پر اہلِ علم کے کسی نہ کسی طائفہ نے عمل کیا ہے۔

وآیۃ ذٰلک ان تظھر فی مثل الموطاء وجامع عبد الرزاقؒ روایا تھو اھ (حجۃ اللہ جلد ۱ ص ۱۴۱ طبع مصر)	اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان کی روایتیں، موطا اور جامع عبد الرزاقؒ میں بیان ہوئی ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اقوال صحابہ کرامؓ جو موطاؔ اور جامع عبد الرزاق میں ہوں وہ مستند اور قابل اعتبار ہیں۔

(۲) قلعوں، سواری کے جانوروں اور انسانوں کو جلانے کے بارے حضرات صحابہ کرامؓ میں خاصا اختلاف ہے ایک گروہ جواز کا اور دوسرا عدمِ جواز کا قائل ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۱۵۱) حافظ ابن حجرؒ نے جلانے کی حدیثوں کے منسوخ ہونے کا دعوی بھی کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۲ ص ۱۲۶ وج ۶ ص ۱۵۱) لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضراتِ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں باغیوں کو آگ میں جلایا تھا اور حضرت خالدؓ بن الولید نے بھی مرتدین

کو جلایا تھا اور آگے لکھا: واکثر علماء المدینۃ یجیزون الخ (فتح الباری ص۱۵۱ ج۲) اس سے معلوم ہوا کہ نسخ کا مسئلہ اتفاقی نہیں اغلب ہے کہ حضرت سعدؓ بھی جواز کے قائل تھے ان حضرات کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں وددت سے بڑھ کر لقد ھممت (کہ میں البتہ قصد اور ارادہ کر چکا ہوں) کے الفاظ آئے ہیں مثلاً آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں پختہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔ ان کو گھروں کے اندر بند کر کے آگ میں جلادوں (بخاری ص۸۶ ج۱ و مسلم ص۲۳۲ ج۱) نیز آپ نے فرمایا کہ جو لوگ جمعہ کی نماز میں شریک نہیں ہوتے ہیں ان کو گھروں میں بند کر کے آگ میں جلانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ (مسلم ص۲۳۲ ج۱ و مشکوٰۃ ص۱۲۱) اور آپ نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے، تو میں اپنا ارادہ پورا کر چکتا (مسند احمد ص۔۔ و ابوداؤد طیالسی ص۳۰۵) حضرت سعدؓ نے تو خلافِ شرع کام کرنے والوں کے لیے صرف آگ کے عذاب کی آرزو کی ہے لیکن جناب رحمۃ للعلمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم تو مجرموں کو آگ میں جلانے کا قصد تک فرما چکے تھے اور اگر عورتوں اور بچوں کا سوال سامنے نہ آتا تو آپ یقیناً اپنا ارادہ پورا کر گزرتے کیا یہ روایتیں امام بخاریؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں؟ اور کیا یہ حدیثیں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے لا تعذبوا بعذاب اللہ۔ کی حدیث کے خلاف ہیں؟ اگر نہیں تو امید قوی ہے کہ حضرت سعدؓ کا اثر بھی مخالف نہ ہوگا، بلکہ اس کو بطریقِ اولیٰ مخالف نہ ہونا چاہیئے۔

ع:۔ "مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے وہاں"

(۳) امام بخاریؒ نے حمادؒ کے قول کی سند بیان نہیں کی تو ایسی بے سند بات کا کیا اعتبار ہے؟ علاوہ ازیں اگر حمادؒ کے قول کی سند بھی مل جائے، تب بھی قرآن کریم صحیح احادیث اور آثار صحابہؓ کے مقابلہ میں حمادؒ کے قول کی کیا وقعت ہے؟ خود امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ جب ایک چیز آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو جائے تو اسود رحؒ وغیرہ کی بات کیسے حجت ہو سکتی ہے؟ (جزأ القرآۃ، ص۱۱) سچ ہے نگار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے آپ کی تمنا نہی سے پہلے کی ہے اس کے بعد آپ نے منع کیا قرآن کریم میں ہے: لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ ... الخ ص۵۲۴

الجواب: بے شک جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے لیکن

جن حضرات کے نزدیک آگ میں جلانا جائز ہے ان کے نزدیک اس کی تمنا بھی جائز ہے۔ باقی قرآنِ کریم میں تمنائے عذاب کی نہی نہیں ہے اس میں حسد سے منع کیا گیا ہے وآں چیزے دیگر است۔

لطیفہ: اگر حضرت حمادؒ کے اس قول کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا ——— (ملئی فوہ سکرا) منہ شکر سے بھر دیا جائے تو بھی اس سے حضرت امام بخاریؒ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اگر عین نماز کی حالت میں قاری کا منہ شکر سے بھر نا مراد ہے تو بیچارہ قرأت تو کیا کرے گا۔ جہر کے ساتھ آمین بھی نہیں کہہ سکیگا یک نہ شد دو شد، بلکہ وہ تو آہستہ آمین کہنے سے بھی رہا اور شکر بھی حضرت حمادؒ نے تھوڑی تجویز نہیں کی بلکہ اچھی خاصی تجویز کی ہے جس سے (ملئی فوہ سکرا) اس کا منہ خوب بھر سکے، کیا بعید ہے کہ حمادؒ نے امام کے پیچھے قرأت کی بندش کا یہ طریقہ ایجاد کیا ہو مگر امام بخاریؒ اس کی سطحی مٹھاس کو دیکھ کر ان کو اپنا ہمنوا سمجھ بیٹھے ہوں، مشہور ہے کہ گڑ سے مخالف کو جلدی قابو کیا جا سکتا ہے اور اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا خارج از نماز شکر سے منہ بھرنا مراد ہے تو اس نازک دور میں دوسری اشیاء خوردنی کی طرح شکر کے لیے بھی لوگ سرگرداں پھر رہے ہیں۔ فریق ثانی حضرت حمادؒ کے اس قول کا اعلان کر دے، پھر قدرت خدا کا تماشا دیکھیے کہ جماعت کی تعداد کیسے بڑھتی اور اس کو کیسے ترقی حاصل ہوتی ہے؟ بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ عوام تو کیا اچھے خاصے محدث بھی حضرت

ابو سعید الخدریؓ کی مرفوع حدیث ان احق ما اخذ تم علیہ اجرا کتاب اللہ (او کما قال) سے اس شکر خوری پر استدلال کرتے نظر آئیں گے اور حمادؒ کے زمانہ کی شکر سے اس ترقی یافتہ دور کی شکر بدرجہا زیادہ سفید اور عمدہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ فریق ثانی سے فرعی مسائل میں قدرے دور ہیں (مثلاً پٹھان وغیرہ) اور چائے کے اشد عادی ہیں اور کھانڈ اور شکر نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اس شکری اعلان کے بعد فریق ثانی کے حلقہ بگوش ہو جائیں اور بیماروں کو تو یونانی قدحوں پر قدحے پینے کے لیے شکر مل جائیگی۔ غرضیکہ اس اعلان کے بعد سورۃ فاتحہ کی برکت سے ہر کس و ناکس کو اس کا سورۃ الشفاء اور سورۃ

السوال وغیرہ ہونا آسانی سے سمجھ آسکتا ہے اور اس کی برکت سے ہمیں تو فتح حاصل ہے ہی، فریق ثانی کو بھی بڑی فتح اور کامرانی حاصل ہو گی۔ الغرض امام بخاریؒ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے لیے شگفتہ تجویز فرمائی اور عین نماز کی حالت میں جیسا کہ ان ظاہری الفاظ سے متبادر ہوتا ہے مگر یہ خیال نہ کیا کہ گھر کس کا پورا ہو رہا ہے؟ سچ ہے ـــ

ع :- میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

حضرات! حضرات صحابہ کرامؓ کے ان مختصر سے آثار کے بعد مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بعض حضرات تابعینؒ و اتباعِ تابعینؒ وغیرہم کے کچھ آثار آپ کے سامنے عرض کیے جاتے ہیں تاکہ آپ کو حضرات تابعینؒ وغیرہم کا نظریہ بھی بسلسلۂ قرآت خلف الامام معلوم ہو سکے اور اختصاراً نقل سند کے بعد ہم رواۃ کی توثیق بھی عرض کریں گے اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں گے۔

اثر علقمہؒ[1] بن قیسؒ (المتوفی سنہ ۶۸ھ) امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حمادؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ ابراہیم[3] نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو امام بارع لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۱) امام نوویؒ ان کو صاحب کمال فقیہ لکھتے ہیں (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۳۴۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۹۲) ابوظبیانؒ کا بیان ہے کہ میں نے متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کو علقمہؒ سے مسائل پوچھتے اور استفسار کرتے دیکھا ہے (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۷۸)

[2] حمادؒ بن ابی سلیمانؒ، امام مسلمؒ اور دیگر محدثینؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (الجواہر المضیہ جلد ۱ ص ۲۲۶) امام احمدؒ ان کی تعریف کرتے تھے اور ان کو قابل اعتبار سمجھتے تھے۔ امام معمرؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام زہریؒ، حمادؒ اور قتادہؒ سے بڑھ کر دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ امام ابن معینؒ، عجلیؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور مستقیم کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ لا بأس بہ کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۶ و ۱۷)

[3] ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

ماقرأ علقمة بن قیس قط فیما یجهر فیه ولا فیما لا یجهر فیه ولا الرکعتین الاخیرتین ام القرآن ولا غیرها خلف الامام۔

(بحوالہ تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰)

علقمہؒ بن قیسؒ نے امام کے پیچھے کبھی کسی نماز میں قراۃ نہیں کی نہ جہری نمازوں میں اور نہ ستری میں (نہ پہلی رکعتوں میں اور نہ پچھلی رکعتوں میں، نہ سورۂ فاتحہ اور نہ کوئی سورت امام کے پیچھے وہ کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے۔

اور یہ اثر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ حضرت علقمہؒ امام کے پیچھے کسی نماز میں کوئی قراۃ نہیں کیا کرتے تھے۔

اعتراض: مُبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً۔ اگرچہ حمادؒ ثقہ تھے مگر مدلس اور مختلط تھے۔ وثانیاً۔ ابراہیم نخعیؒ کی علقمہؒ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۹)

جواب: جب حمادؒ ثقہ ہیں تو اس روایت میں اختلاط سے کوئی فرق نہیں پڑیگا کیونکہ محدثینؒ نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ انکو اختلاط کا عارضہ آخر میں لاحق ہوا تھا اور ابراہیم نخعیؒ کی روایتیں میں وہ خطا نہیں کرتے تھے (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۶) خود مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ اور سفیانؒ اور ان کے طبقہ کے مدلسین کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمہ سے سماعت کی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۷۷) اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمہؒ سے ملاقات نہیں کی مردود ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ابراہیم نخعیؒ کی ملاقات علقمہؒ سے نہیں ہوئی تو یہ روایت مرسل ہو گی۔ اور امام دارقطنیؒ، امام طحاویؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کی مرسل روایتیں بھی حجت اور صحیح ہیں۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳۶۱، طحاوی جلد ۱ ص ۱۳۳، زاد المعاد جلد ۴ ص ۲۵۴ و درایہ ص ۱۶۱) اور امام بیہقیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مرسلات ابراہیم صحیحۃ الا حدیث تاجر البحرین[۱]۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۴۸)

---

[۱] یاد رہے کہ یہ روایت صرف مرسل ہی نہیں بلکہ مسند اور مرفوع بھی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا کہ حضرت! میں بحرین کے علاقہ میں تجارت کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ آپنے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھو۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر و رجالہ موثقون مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲۸۳)

کہ تاجر بحرین کے مضمون والی روایت کے علاوہ ابراہیمؒ کی تمام مرسل روایتیں صحیح ہیں، بہر حال یہ روایت فن روایت اور محدثین کے اصول کے ماتحت بالکل صحیح اور حجت ہے۔

اثر عمروؒ[1] بن میمونؒ (المتوفی ۷۴ھ) وغیرہ ابوبکرؒ[2] بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے یزیدؒ[3] بن ہارونؒ نے بیان کیا، وہ اشعثؒ[4] سے اور وہ مالکؒ[5] بن عمارہؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے اصحاب[6] اور تلامذہ سے جن میں خصوصیت سے عمروؒ بن میمونؒ قابل ذکر ہیں۔ امام کے پیچھے قرأۃ کرنے سے متعلق سوال کیا۔ کلھم یقولون لا یقرأ خلف الامام (تعلیق الحسن جلد ۱ ص۹) تو ان سب نے جواب یہ دیا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیئے، محقق نیمویؒ نے فرمایا تھا کہ مجھے مالکؒ بن عمارہؒ کا ترجمہ نہیں مل سکا، مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تو اس اثر کا پیش کرنا بے سود ہے۔ (ابکار المنن ص۱۶۸) مگر ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ مالکؒ بن عامرؒ ہیں جو ثقہ اور ثبت تھے اور یہ اثر بھی صحیح ہے، حضرت علیؓ جب کوفہ تشریف لے گئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۶۱)

[2] ان کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ [3] وہ ثقہ متقن اور عابد تھے (تقریب ص۴۰۰)

[4] اشعثؒ بن ابی الشعثاءؒ، امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ نسائیؒ ابوداؤدؒ اور بزارؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، عجلیؒ ان کو شیوخ کوفہ اور ثقات میں لکھتے ہیں اور ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۳۵۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص۴۱)

[5] یہ مالکؒ بن عمارہؒ نہیں بلکہ مالکؒ بن عامرؒ ہیں جو اشعثؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵ وغیرہ) علامہ ذہبیؒ ان کو صاحب ابن مسعودؓ قدیم الموت اور ثقہ لکھتے ہیں، (میزان جلد ۱ ص۳) امام ابن معینؒ، ابوداؤدؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص۱۶۹) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (تقریب ص۴۲۵) ابو عطیہؒ ان کی کنیت تھی بخاری ۲ ص۶۵ اور ترمذی جلد ۱ ص ۸۸ میں ان کا ذکر ہے۔

[6] نواب صاحبؒ نے اصحاب علیؓ اور عبداللہؓ میں سے اٹھائیس کے نام بتلائے ہیں جو جلیل القدر محدث اور امام تھے۔ (الجنہ ص۶)

اصحاب عبد اللہ سرج هذه القرية (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص۲) عبد اللہؓ بن مسعودؓ کے اصحاب اس شہر کے روشن چراغ ہیں اور آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اصحاب عبد اللہؓ سب کے سب امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی فتویٰ دیا کرتے تھے۔

اثر اسودؒ بن یزیدؒ[1] (المتوفی ۷۵ھ) ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے ابن علیہؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ ایوبؒ[3] اور ابن ابی عروبہؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ دونوں ابو معشرؒ[4] سے وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسودؒ بن یزیدؒ سے۔

قال لان اعض جمرة احب الی من ان اقرأ خلف الامام اعلم انه یقرأ۔ (آثار السنن جلد ۱ ص۹)

انھوں نے فرمایا کہ میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ اپنے منہ میں آگ کی چنگاری ڈال لوں بجائے اس کے کہ میں امام کے پیچھے قرأت کروں جبکہ مجھے علم ہے کہ وہ پڑھتا ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مدلول میں واضح ہے۔ مبارکپوری صاحبؒ نے ابراہیم نخعیؒ کی تدلیس کا بہانہ کیا ہے۔ (ابکار وغیرہ) مگر بے سود ہے کیونکہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو امام فقیہ، زاہد، عابد اور کوفہ کا امام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۴۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالتِ شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۲۲) محدث ابن حبانؒ ان کو فقیہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۳۴۲) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من کبار التابعین اور من اعیان اصحاب ابن مسعودؓ اور من کبار اهل الکوفة لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۱۲)

[2] ان کا نام اسمٰعیل بن ابراہیمؒ بن مقسمؒ تھا، جو ثقہ اور حافظ تھے۔

[3] ایوبؒ کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے تحت اور ابن ابی عروبہ کا باب دوم حدیث ۱۰ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

[4] ابو معشرؒ کا نام زیادؒ بن کلیبؒ تھا۔ محدث عجلیؒ، نسائیؒ، ابن مدینیؒ اور ابو جعفر بستیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو حفاظ متقنین میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۳۸۳)

ابراہیم نخعیؒ اس طبقہ کے مدلس تھے جن کی تدلیس مضر نہیں ہے اور ان کی جملہ روایتیں (علاوہ ایک روایت تاجر بحرین کے) حجت ہیں، چنانچہ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: قلت استقر الامر علی ان ابراھیم حجۃ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص۳۵) میں کہتا ہوں یہ طے شدہ بات ہے کہ ابراہیم حجت تھے۔

دوسری سند: ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ، ہیثمؒ[1] سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ[2] بن ابی خالدؒ نے بیان کیا۔ وہ وبرہؒ[3] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت اسودؒ بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملیٔ فاہ ترابا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰) کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

تیسری سند: عبدالرزاقؒ[4] بن ہمامؒ اپنے مصنف میں سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ امام اعمشؒ سے اور وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسودؒ بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملیٔ فوہ ترابا (الجوھر النقی جلد ۲ ص۱۶۹)	میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأۃ کرتا ہے اس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

---

[1] ہیثم بن بشیرؒ ثقہ اور ثبت لیکن کثیر التدلیس تھے (تقریب ص۳۸۱) مگر اس روایت میں وہ تحدیث کرتے ہیں۔

[2] امام ابن مہدیؒ، ابن معینؒ، نسائیؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن عمار موصلیؒ ان کو حجت اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابوحاتمؒ، یعقوبؒ بن شیبہؒ، ابن حبانؒ اور ابن عیینہؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۲۹۱)

[3] وبرہ بن عبدالرحمٰنؒ امام ابوزرعہؒ، ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۱۱ ص۱۱۱)

[4] عبدالرزاقؒ بن ہمامؒ کا ترجمہ اثر حضرت علیؓ میں اور سفیان ثوریؒ کا مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ بقیہ رواۃ کا ترجمہ بھی گذر چکا ہے۔ امام اعمشؒ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص۱۶۰) البتہ مدلس تھے، لیکن حضرت قتادہؒ کی بحث ملاحظہ کر لیجئے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے۔

غالباً حضرت اسودؒ کے یہی وہ الفاظ ہیں، جن پر حضرت امام بخاریؒ بہت ناراض ہوئے ہیں (دیکھئے جزء القراۃ ص۱۱)

اثر سویدؓ بن غفلہ (المتوفی سنہ ھ) ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے فضلؒ بن دکینؒ نے بیان کیا۔ وہ زہیرؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ ولیدؒ بن قیسؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سویدؓ بن غفلہ سے سوال کیا۔ اقرأ خلف الامام فی الظہر والعصر قال لا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص۹) کیا میں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ فرمایا نہیں، اس اثر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائل کو دوسری نمازوں کے بارے میں تو یہ علم تھا کہ ان میں امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کو صرف ظہر اور عصر کی نماز میں قرأۃ خلف الامام کے بارے میں تردد تھا۔ سو حضرت سویدؓ نے اس کا یہ مغالطہ بھی نکال دیا ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ سند میں ولیدؒ بن قیس تجیبی ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ انکو مقبول لکھتے ہیں (تقریب ص۳۸۷) اور علامہ نیموئیؒ نے حبل المتین میں لکھا ہے کہ جس راوی کے متعلق حافظ ابن حجرؒ مقبول لکھتے ہیں وہ کمزور ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ اثر کمزور ہے (ابکار المنن ص۱۱۶) جواب: حبل المتین ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ نہ معلوم محقق

۱؎ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ بلند مرتبہ عابد، زاہد، قانع بالیسیر اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۵۰) امام ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، محدث ابن قانعؒ تو ان کو صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں (تہذیب التہذیب ۴ ص۲۷۸) حافظ ابن کثیرؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت سویدؓ بن غفلہ نے فرمایا کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ہم عمر ہوں کیونکہ میری ولادت بھی عام فیل میں ہوئی ہے اور امام بیہقیؒ ان سے یہ نقل کرتے ہیں کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے صرف دو سال عمر میں چھوٹا ہوں (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۶۲)

۲؎ ابوبکر بن ابی شیبہؒ اور فضلؒ بن دکینؒ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔

۳؎ زہیرؒ بن معاویہؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص۱۲۳)

۴؎ ولیدؒ بن قیس سکونی امام ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام نسائیؒ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۱۴۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۳۸۷)

نیموی[1] ہی یہ کس راوی اور کس موقع اور محل پر لکھا ہے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس راوی کے متعلق لکھا ہو، جس کو دیگر محدثین کمزور بتاتے ہوں اور صرف حافظ ابن حجرؒ ہی اس کو مقبول کہتے ہوں اور ولیدؒ بن قیسؒ کو تو دیگر محدثینؒ بھی ثقہ کہتے ہیں۔ علاوہ بریں مبارکپوری صاحبؒ کو یہ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ راوی ولیدؒ بن قیس تجیبیؒ نہیں جن کو حافظ ابن حجرؒ مقبول لکھتے ہیں (اور محدث عجلیؒ تابعی اور ثقہ لکھتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۴۶) بلکہ یہ ولیدؒ بن قیس سکونی ہیں جو زہیرؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ۱۱ ص ۱۴۶)

ع ؎ "میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

اثر نافع[2] بن جبیرؒ (المتوفی ۹۳ھ) امام مالکؒ یزیدؒ[3] بن رومانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ نافعؒ بن جبیرؒ سے کان یقرأ خلف الامام فیما لا یجھر فیہ الامام (موطا امام مالک ص ۲۹)

---

[1] محقق نیمویؒ کا نام ظہیر احسن ابوالخیر کنیت اور شوق تخلص تھا۔ آپ مولانا علامہ محمد عبدالحیؒ لکھنوی (المتوفی ۱۳۰۴ھ) کے شاگرد رشید تھے، بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے، فن اسماء الرجال پر گہری نظر رکھتے تھے، اور خداداد ذہانت اور فطانت میں قاضی شوکانیؒ سے بھی انکا پایہ بہت بلند تھا۔ مگر افسوس کہ ناپائیدار زندگی نے ساتھ نہ دیا اور ان کی قابلیت کے پورے جوہر ابھی اچھی طرح اجاگر نہ ہوئے تھے کہ ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی مشہور کتاب آثار السنن (مع حاشیہ تعلیق الحسن) کو علماء بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور فریق ثانی کی نگاہوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، مولانا مبارکپوری صاحبؒ نے ابکار المنن لکھ کر اپنی جماعت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ آثار السنن کا جواب ہے، مگر وہ بری طرح اس میں ناکام رہے ہیں، فریق ثانی کے چیدہ چیدہ علماء کو بلکہ خود مبارکپوری صاحبؒ کو بھی اس کا گہرا احساس تھا اور ہر سلیم الطبع آدمی اس ٹھوس نظریہ کا یقیناً احساس کر سکتا ہے ولیس الخبر کالمعاینۃ۔

[2] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نافعؒ بن جبیرؒ امام اور فاضل تھے۔ ان کی توثیق اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۲۲) ابن خراشؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، مشہور اور امام تھے۔ وہ مدینہ طیبہ کے صاحب افتاء علماء میں تھے اور ان کے فتاوی معتبر سمجھے جاتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۴۰۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من الثقات النبلاء اور من ائمۃ الاجلاء لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۴۰۵)

[3] حضرت امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گذر چکا ہے، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ اگر ہر نماز اور ہر رکعت میں امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ ضروری ہوتی۔ تو حضرت نافعؒ بن جبیرؒ سب نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کیا کرتے، مگر وہ صرف سرّی نمازوں میں قرأت کرتے تھے۔ اور کیا بعید ہے کہ امام مالکؒ وغیرہ کی طرح وہ بھی استحباب کے قائل ہوں اگر وہ وجوب کے بھی قائل ہوں۔ تب بھی فریق ثانی کی جہری نمازوں میں بطلان نماز کی رٹ تو غلط ہو جائیگی۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس ہم جتنے آثار نقل کریں گے، جن میں صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے ترک قرأت کا ثبوت ہوگا۔ ان سے ہمارا مدعا بھی محض یہ ہے کہ فریق ثانی کا عمومی نظریہ صحیح نہیں ہے اور بس گو ان میں سرّی نمازوں کے اندر قرأت کا ثبوت بھی ہوگا، استحبابی طور پر ہو یا وجوبی طور پر بہر حال ہمارا مطلب اور مدعا واضح ہے۔

اثر سعیدؒ بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ) الوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؒ نے بیان کیا۔ وہ ہشامؒ[۱] دستوائیؒ سے اور وہ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: انصت للامام (آثار السنن جلد ۱ ص۹۰) یعنی امام کے پیچھے بالکل خاموشی اختیار کرو، اور قرأت نہ کیا کرو۔ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کا ایک اثر باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے اور یہ اثر بھی اپنے معنوی اعتبار سے واضح ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً ـــ اس اثر کی سند میں قتادہؒ مدلس ہیں، جو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ثانیاً ـــ امام بخاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سعیدؒ بن المسیبؒ، عروہؒ، شعبیؒ، عبید اللہؒ بن عبد اللہؒ نافعؒ بن جبیرؒ، ابو الملیحؒ، قاسمؒ بن محمدؒ، ابو مجلزؒ، مکحولؒ، مالکؒ بن عونؒ اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ قرأت خلف الامام کے قائل تھے۔ (جزء القرأۃ ص۱۱) لہٰذا یہ اثر حجت نہیں ہو سکتا (ابکار المنن وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) یزیدؒ بن رومانؒ کو امام نسائیؒ اور ابن معینؒ ثقہ کہتے ہیں۔ علامہ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو عالم، کثیر الحدیث اور ثقہ کہتے ہیں (تہذیب ۱۱ ص۳۲۵)

[۱] ہشام دستوائیؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص۳۸۰) حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کا ترجمہ باب اول میں اور قتادہؒ وکیعؒ اور ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ کا باب ثانی میں نقل ہو چکا ہے۔ وہاں ہی ملاحظہ کر لیں۔

جواب: حضرت قتادہؒ کی تدلیس کا مفصل جواب پہلے دیا جا چکا ہے اور حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کے بسند صحیح وہ اثر ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور امام بخاریؒ نے اپنے استدلال میں ان کے اثر کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بے سند بات حجت نہیں ہو سکتی۔ اور حضرت عروہؒ بن زبیرؒ نافعؒ بن جبیرؓ اور قاسمؒ بن محمدؒ وغیرہ کو مطلقاً مجوزین قرأت خلف الامام میں شمار کرنا باطل ہے بعض کے آثار اس کے خلاف نقل کیے جا چکے ہیں اور بعض کے عرض کر دیے جائیں گے۔ اور بقیہ آثار کی اسانید پر آثار خصوم میں بحث کی جائیگی۔ انشاءاللہ العزیز

اثر سعیدؒ[1] بن جبیرؓ (المتوفی ۹۴ھ) ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہیثمؒ نے بیان کیا۔ وہ ابوبشرؒ[2] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سے سوال کیا۔

عن القرأۃ خلف الامام قال لیس خلف الامام قرأۃ۔ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جا سکتی ہے؟ فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت نہیں کی جا سکتی۔

(تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹)

اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً ۔۔۔ ہیثمؒ مدلس تھے۔ اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں وثانیاً ۔۔۔ حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سکتات امام میں قرأت کے قائل تھے (جزء القرأۃ ص ۵۷) اس لیے یہ اثر قابل احتجاج نہیں ہو سکتا ۔۔۔ (ابکار المنن ص ۱۹۷ وغیرہ)

جواب: یہ بالکل صحیح ہے کہ ہیثمؒ کثیر التدلیس تھے، لیکن حضرت امام بخاریؒ اور علامہ ذہبیؒ ان کی معنعن حدیث سے استدلال کرتے ہیں (دیکھیے صحیح بخاریؒ جلد ۱ ص ۱۰۸ و تذکرہ ج ۱ ص ۲۴۷ وغیرہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے، مزید تائید کے لیے

---

[1] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علماء اعلام میں تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۵) امام نوویؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعینؒ کے ائمہ کبار میں تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عبادت اور زہد و ورع اور جملہ کمالات میں وہ کبار ائمہ اور سرگروہ تابعینؒ میں تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۱۶)

[2] ابوبشرؒ کا نام جعفرؒ بن ایاسؒ تھا اور وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۵۶) ہیثمؒ کا ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

ایک اور روایت سُن لیجئے امام ابن جریرؒ عبداللہؒ بن مبارکؒ کے طریق سے روایت کرتے ہیں اور وہ بقیہؒ بن ولیدؒ سے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ثابتؒ بن عجلانؒ سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سے سنا۔ انھوں نے فرمایا کہ آیت واذا قرئ القرآن ... الآیہ خطبہ، جمعہ اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۳) اور سعیدؒ بن جبیرؒ کے سکتات والے اثر کا جواب باب اوّل اعتراض ۱۱ کے جواب میں دیکھ لیں کہ نہایت کمزور اور ضعیف ہے۔

اثر عروہؒ[۱] بن زبیرؓ (المتوفی سنہ ۹۴ھ) امام مالکؒ ہشامؒ[۲] بن عروہؒ اور وہ اپنے والد عروہؒ بن زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں:

انہ کان یقرأ خلف الامام اذا لم یجھر فیہ الامام بالقرأۃ (موطا امام مالک ص ۲۹ وکتاب القرأۃ ص ۱۰۱)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کیا کرتا تھا۔

اثر ابراہیم نخعیؒ (المتوفی سنہ ۹۶ھ) ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو خالد الاحمرؒ نے بیان کیا وہ اعمشؒ سے اور وہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

۱؎ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب بیشمار ہیں، ان کی جلالت علمی مرتبت اور وفور علم پر سب کا اتفاق ہے فقہ میں ان کو اتنا کمال حاصل تھا کہ مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک فقیہ مانے جاتے تھے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۳۳۱) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور عالم مدینہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۸) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ ثبت کثیر الحدیث فقیہ اور بلند قدر لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۳۳) ان کا علمی کمال اس قدر مسلّم تھا کہ بڑے بڑے حضرات صحابہ کرامؓ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے (البدایہ والنہایہ ۹ ص ۱۰۱) اس کمال کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ کوئی مسئلہ محض اپنی رائے سے نہ بیان کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۸۳)

۲؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الحجۃ الفقیہ لکھتے ہیں (تذکرہ ۱ ص ۱۳۶)

خالد الاحمر کا ترجمہ باب دوم حدیث ۲ میں اور ابراہیم نخعیؒ کا مقدمہ میں اور امام اعمشؒ کا حضرت اسودؒ ...

اول ما احدثوا القرأة خلف الامام وكانوا لا يقرأون (الجوهر النقی جلد ۲ صـ۱۶۹)

یعنی لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت ایجاد کی ہے۔ اور وہ (یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ) امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔

اور یہی مضمون بعینہٖ شمس الدین ابن قدامہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (شرح مقنع جلد ۲ صـ۱۲)

امام ابن قدامہؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت مختار کے زمانے میں نکالی، کیونکہ وہ لوگوں کو دن کی نمازیں تو پڑھا دیا کرتا تھا۔ مگر رات کی نمازیں نہیں پڑھاتا تھا (اور حاکم ہونے کے باعث ناچار لوگوں کو اس کے پیچھے نمازیں پڑھنی پڑتی تھیں اس لیے) اس سے بدظن ہو کر لوگوں نے اس کے پیچھے قرأت شروع کر دی (مغنی ابن قدامہ جلد ۱ صـ۶۰۶) اگر یہ نقل صحیح ہے تو امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بدعت ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا ہے؟ تسلیم کرنے والے کے لیے یہ دلائل بڑے مضبوط اور ٹھوس ہیں البتہ نہ ماننے والے کا کوئی علاج نہیں۔

اثر قاسمؒ بن محمدؒ[۱] (المتوفی ۱۰۶ھ) امام مالکؒ یحییٰؒ[۲] بن سعیدؒ اور امام ربیعہؒ[۳] بن عبدالرحمنؒ

[۱] علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ قاسمؒ بن محمدؒ الامام القدوہ اور الفقیہ تھے (تذکرہ جلد ۱ صـ۹۰) علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ رفیع المنزلت و عالی مرتبت فقیہہ امام اور بڑے حافظ حدیث تھے اور متورع تھے (طبقات جلد ۵ صـ۱۴۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کی جلالت توثیق اور امامت پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ صـ۵۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الفقہاء المشہورین اور افضل اہل مدینہ اور اعلم اہل زمانہ تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صـ۲۵) امام مالکؒ فرماتے تھے کہ قاسمؒ اس امت کے فقہاء میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۸ صـ۳۳۵) ابوالزنادؒ کہتے ہیں کہ میں نے قاسمؒ سے زیادہ سنت کا عالم اور فقیہہ نہیں دیکھا (تذکرہ ۱ صـ۹۱)

[۲] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، شیخ الاسلام، عالم اور قاضی المدینہ لکھتے ہیں (ایضاً ۱ صـ۱۲۸)

[۳] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، فقیہہ اور مجتہد تھے۔ علامہ خطیبؒ کا بیان ہے کہ وہ فقیہہ، عالم اور حافظ فقہ اور حدیث تھے (ایضاً جلد ۱ صـ۱۴۸)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت قاسمؒ بن محمدؒ سے کہ وہ کان یقرأ خلف الامام فیما لا یجھر فیہ الامام بالقرأۃ (موطا امام مالک ص۲۹) صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ یہ اثر بھی جہری نمازوں میں ترک القرأت خلف الامام کے بارے میں بالکل روشن اور واضح ہے۔

امام اوزاعیؒ (المتوفی ۱۵۷ھ) بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ جیسا کہ امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتاوٰی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل تھے لیکن صرف استحباب کے طور پر چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ومذھب طائفۃ کالاوزاعیؒ وغیرہ من الشامیین یقرأھا استحبابا وھو اختیار جدنا انتھٰی (فتاوی جلد ۲ ص۱۴۶)

اور ایک گروہ کا یہ مسلک ہے جیسے امام اوزاعیؒ اور ان کے علاوہ دوسرے شام میں رہنے والے علماء کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا صرف استحباب کے درجے میں ہے اور اسی مسلک کو ہمارے دادا صاحب[۱] نے اختیار کیا۔

کیا بعید ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت اور حضرت مکحولؒ وغیرہ شامی علماء اور ائمہ وغیرہ من الشامیین کی مد میں شامل ہوں اور امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کے صرف استحباب کے قائل ہوں، آخر شیخ الاسلامؒ کی بات ہے اور اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ امام اوزاعیؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

امام سفیان ثوریؒ (المتوفی ۱۶۱ھ) بھی سری اور جہری کسی نماز میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے (جیسا کہ تفسیر معالم التنزیل جلد ۳ ص۴۲۶ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے) اور امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

---

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام المجتہد شیخ الاسلام اور احد الاعلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص۲۷۸) مجد الدین لقب، عبد السلام نام اور ابو البرکات کنیت تھی (دیکھئے الجنۃ ص۳۸ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ)

امام لیثؒ بن سعدؒ (المتوفی ۱۷۵ھ) کا مسلک بھی ترک القرأۃ خلف الامام تھا جیسا کہ مغنی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے حضرت مولانا السید العلامہ، بحر العلوم، سید الحفاظ محمد انور شاہؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ ان کا مسلک بھی امام کے پیچھے ترکِ قرأۃ ہی تھا جیسا کہ حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ نے استذکار میں لکھا ہے اور وجوب کا مسلک تو ہرگز نہ تھا جیسا کہ شیخ الاسلامؒ نے (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۲) میں لکھا ہے (فصل الخطاب ص۸) امام ابن سعدؒ لیث کا ترجمہ بھی مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

امام عبد اللہؒ بن المبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ) امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ابو وائلؒ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کیا کرو، بلکہ خاموش رہا کرو۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنی چاہیئے، کیونکہ انصات جہری نمازوں میں ہی ہو سکتا ہے (جزء القرأۃ ص۸) اور جہری نمازوں میں ان کا محقق مسلک امام کے پیچھے ترک القرأۃ ہی تھا (معالم التنزیل جلد ۳ ص ۲۶۶، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے) اور تبییض الصحیفہ مصنفہ علامہ سیوطیؒ جو اپنے وقت کے سب سے بڑے حافظ تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۱۴) کے حوالہ سے یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ امام عبد اللہؒ بن المبارکؒ نے فرمایا کہ جس مسئلہ پر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ مجتمع ہو جائیں تو وہی میرا مسلک ہو گا اور چونکہ یہ دونوں بزرگ سرّی نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے یہی مذہب امام ابن مبارکؒ کا ہوگا۔

امام عبد اللہؒ بن وہبؒ (المتوفی ۱۹۷ھ) حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن وہبؒ کا مسلک بھی امام ابن عیینہؒ کی طرح امام کے پیچھے ترکِ قرأت ہی ہے (فصل الخطاب ص۸) اور محدث مولانا محمد زکریا صاحب اس کی تصریح کرتے ہیں کہ امام ابن وہبؒ اور علامہ اشہبؒ وغیرہ مالکی علماء کا یہی مسلک تھا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیئے (اوجز المسالک جلد ۱ ص ۲۳۹) اور امام ابن وہبؒ کا ترجمہ حدیث ۱۷ کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے۔

امام سفیانؒ بن عیینہ (المتوفی ۱۹۸ھ) امام ابوداؤدؒ [1] فرماتے ہیں کہ ہم سے قتیبہ [2] بن سعیدؒ اور ابن ابی السرحؒ نے بیان کیا، وہ دونوں حضرت سفیانؒ بن عیینہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبادہؓ بن الصامت کی مرفوع حدیث (لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعداً او کما قال) کا یہ مطلب بیان کیا لمن یصلی وحدہ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹) یعنی جو شخص تنہا نماز پڑھتا ہو تو اس کو سورۂ فاتحہ کی قرأت کرنی ہوگی، اور یہ حدیث مقتدی کو شامل نہیں ہے، مطلب ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جاسکتی امام ابن عیینہؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے اور ابن ابی السرحؒ کا ترجمہ باب دوم حدیث ۲ میں نقل ہوچکا ہے۔

امام اسحاقؒ بن راہویہؒ (المتوفی ۲۳۶ھ) امام بغویؒ علامہ آلوسیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام موصوف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے (معالم التنزیل جلد ۲ ص ۲۲۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) امام موصوفؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

قارئین کرام! ہم نے بعض حضرات تابعینؒ واتباع تابعینؒ کے آثار باب اول میں (مثلاً حضرت محمدؒ بن کعبؒ، مجاہدؒ بن جبرؒ، حسن بصریؒ، ابوعالیہ الریاحیؒ اور امام زہریؒ وغیرہ کے آثار) اور بعض دیگر اکابر علماءِ امت اور حضرات ائمہ اربعہؒ کے اقوال مقدمہ میں پوری تفصیل کے ساتھ عرض کر دیے ہیں اور گو ان کے علاوہ ابھی بہت سے آثار اور اقوال اس مضمون کے موجود ہیں۔ لیکن چونکہ ان حضرات کے مسلک کے سمجھنے میں فریق ثانی کو ایک نمایاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان کے نام پیش کیے ہیں۔ ورنہ مقدمہ میں اجماع نقل کیا جاچکا ہے اور اس کے بعد مزید کسی اور صراحت اور وضاحت اور تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وفیہ کفایۃ لمن لہٗ ھدایۃ۔

---

[1] امام ابوداؤدؒ صاحب سنن (المتوفی ۲۷۵ھ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الثبت اور سید الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲)

[2] قتیبہؒ بن سعیدؒ کو علامہ ذہبیؒ الشیخ، الحافظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۳)

حضرات! آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ کا شانِ نزول صحیح روایات اور اجماع امت سے قرأۃ خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اکیس ۲۱ عدد صحیح اور مرفوع روایات سے امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت اس کتاب میں ثابت کی جاچکی ہے۔ اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے اور متعدد صحیح اور مرفوع حدیثوں سے خاص فاتحہ کا لفظ بھی نقل کیا جاچکا ہے اور فریقِ ثانی کی ہر طرح سے منہ مانگی مُرادیں بھی پوری کی جاچکی ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کی وہ جماعت جن سے باقرار فریقِ ثانی، دین، علم فقہ اور حدیث مروی اور منقول ہے۔ وہ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہیں تھے۔ اور جلیل القدر حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ اور دیگر بڑے بڑے حضرات محدثینؒ اور فقہاءؒ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأۃ کو مخالف قرآن شاذ منکر اور اجماع کے خلاف سمجھتے تھے، جیسا کہ شیخ الاسلامؒ کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے اور جو سری نمازوں میں امام کے پیچھے قائل بھی تھے۔ وہ بھی صرف استحباب کے درجہ میں اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مانعین قرأۃ خلف الامام صرف احناف ہی نہیں ——— (جس طرح کہ فریقِ ثانی نے تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دے کر یہ مغالطہ دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ صرف احناف کا قول اور ان کا مسلک ہے) بلکہ جمہور اہلِ اسلام اور فقہاءؒ و محدثینؒ کا یہ محقق مسلک ہے اور فریقِ ثانی نے غلطی کی وجہ سے صرف احناف کے مقتدر علماء مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، اور مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی خدمت میں چیلنج پیش کر کے یہ سمجھنے یا سمجھانے کی بالکل ناکام سعی کی ہے کہ یہ مسئلہ صرف ان کا ہے اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ پیش کردہ روایات میں کم و بیش پچانوے ۹۵ فی صدی روات وہ ہیں، جو ثقہ، ثبت، حافظ اور حجت ہونے کے علاوہ بخاری اور مسلم کے مرکزی روات ہیں اور تقریباً پانچ فی صدی وہ راوی ہیں جن میں بعض حضرات محدثین کرامؒ نے کلام کیا ہے، لیکن ان کو بھی نوے ۹۰ فی صدی اور جمہور محدثینؒ ثقہ کہتے ہیں اور ان کی روایتوں کو صحیح، حسن، صالح، جید اور قوی کہتے ہیں، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان روات کی (بغیر تین چار کے حالانکہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک وہ بھی ثقہ ہیں) ثقاہت اور عدالت فریقِ ثانی کے

نزدیک بھی مُسلّم ہے۔ صرف ان پر تدلیس، تخلیط، تغیر یسیر وہم اور تفرد وغیرہ کے معمولی الزامات لگائے گئے ہیں یا مرفوع کو موقوف اور موصول کو مرسل کہنے کی بے جا سعی کی گئی ہے اور یا محض اپنی مرضی یا معمولی سے شبہ کی بنا پر مطلق قرأت کو مقید کرنے کی بعید از انصاف کاوش کی گئی ہے، اب ذرا فریق ثانی کی پیش کردہ روایات اور ان کے رواۃ اور رجال کا حال بھی دیکھ لینا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ فریق ثانی کتنے پانی میں ہے۔ ان تمام پیش کردہ دلائل کو سامنے رکھ کر میں فریق ثانی کے اہلِ علم طبقہ سے نہایت مؤدبانہ اور مبنی بر انصاف مطالبہ بلکہ دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ حق کا ساتھ دے اور تعصب اور غلو سے کام نہ لے اور اگر وہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی پارٹی کا ساتھ نہ چھوڑ سکے یا نہ چھوڑنا چاہے تو اس چیلنج بازی سے باز آجائے اور یہ الفاظ اور نظریہ واپس لے لے کہ

جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (انتہٰی بلفظہٖ دیکھئے فصل الخطاب ص ۱ جس میں تمام دنیا کے علمائے احناف کو کھلا چیلنج دیا گیا ہے)

اس سے قبل کہ باب چہارم شروع کیا جائے یہ کہ دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں (اور سخن ہائے گفتنی میں بھی عرض کیا جا چکا ہے) کہ ہر مقام پر حضرات محدثین کرامؒ اور فقہائے عظامؒ کے ناموں کے قبل، امام، علامہ، محدث، فقیہہ یا حضرت وغیرہ کے توصیفی القاب نہیں لکھے جا سکے۔ اس لیے کہ ان کے نام بار بار آتے رہے ہیں، ورنہ نہ صرف یہ کہ مجھے ان سے عشق اور محبت ہے، بلکہ ان کے نام لینے کو موجبِ نزولِ رحمتِ خداوندی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انہیں کی کاوش اور سعی کی بدولت قرآنِ کریم اور حدیث شریف ہم تک پہنچی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظیم الشان ہستی تک ہماری رسائی کا عالم اسباب میں یہی اکابر بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور جہاں ان اکابر سے (خصوصاً حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ) علمی اور تحقیقی رسہ کشی کی گئی ہے، تو حاشا و کلا ثم حاشا و کلا کہ اس سے ان کی تذلیل اور تحقیر مراد نہیں کیونکہ ان کی تذلیل کو بفحوائے حدیث من عادیٰ لی ولیا فقد بارزتہ بالحرب۔ اللہ

تعالیٰ کی ذات سے اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھتا ہوں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) بلکہ جہاں بھی ان اکابر سے اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ صرف ان کی پیش کردہ دلیل کی خامی بتلانا مقصود ہے، وکل احد یؤخذ عنہ ویترك الا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک بات اور خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ راقم الحروف نے فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے مفہوم کو اختصاراً اپنی عبارت میں پیش کیا ہے، مگر صرف بعض مواقع پر الفاظ بھی انھیں کے ہیں جہاں انتہیٰ بلفظہٖ یا بلفظہٖ وغیرہ لکھ کر اشارہ کر دیا ہے۔ ہاں البتہ ان کی کتابوں کے حوالے ضرور درج کر دیے گئے ہیں تاکہ مزید تسلّی اور اطمینان کے لیے اصل کتاب کی طرف بآسانی مراجعت کی جا سکے۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا علم ہے۔ معصومیت کا دعوےٰ کب ہو سکتا ہے؟ اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بغیر معصوم ہے کون؟ و العصمۃ بیدہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

چوتھا باب

قرآنِ کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ و اتباعِ تابعینؒ وغیرہم سے بلکہ جمہور امت سے یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے اور جہری نمازوں میں تو مخالف اجماع اور شاذ و منکر ہے۔ قرآن کریم، حدیث شریف اور اجماع امت کے بعد کسی اور دلیل کی نہ گنجایش ہے اور نہ ضرورت، لیکن ہم محض تکمیلِ فائدہ کے لیے نہایت اختصار سے چند عقلی ترجیحی اور قیاسی دلائل بھی اس باب میں عرض کردیتے ہیں تاکہ اصولِ فقہ کی رُو سے قرآنِ کریم[1]، حدیث[2] شریف، اجماعِ[3] امت اور قیاس[4] کے جملہ دلائل سے آپ کو جمہور اہلِ اسلام کا محقق مسئلہ معلوم ہوجائے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ وغیرہ کسی قسم کی قرأت کرنا درست اور صحیح نہیں ہے۔

پہلی دلیل: علامہ حازمیؒ[1] (المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی حدیث ظاہر

---

[1] ابوبکر محمدؒ بن موسیٰؒ بن عثمان الشافعیؒ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، البارع اور النسابہ تھے، نیز لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، حجت، نبیل، زاہد، عابد، متورع اور من الائمۃ الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۴ صفحہ ۱۵۱) اور علامہ تاج الدین السبکیؒ (المتوفی ۷۷۱ھ) ان کو امام متقن اور مبرز لکھتے ہیں (طبقات الشافعیہ، جلد ۴ صفحہ ۱۸۹)

قرآن کے موافق ہو، اور دوسرے طرف کی ایسی نہ ہو، تو وہ حدیث قابلِ اخذ اور حجت ہوگی جو ظاہر قرآن کے موافق ہوگی۔ (کتاب الاعتبار صـ۱۱) امام کے پیچھے ترکِ قرأت کی روایتیں نہ صرف یہ کہ ظاہر قرآن کے مطابق ہیں، بلکہ آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ کا شانِ نزول ہی بالاجماع مسئلہ خلف الامام ہے، جس کی پوری تشریح باب اوّل میں عرض کی جاچکی ہے اور فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ روایات کی تائید میں قرآنِ کریم کی کوئی آیت موجود نہیں ہے، لہٰذا جمہور کے مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام نے صـ۵۲۹ اور صـ۵۳۰ میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بالکل غیر متعلق ہے۔ اوّلاً — اس لیے کہ انصات واستماع قرأت فی السر کے منافی ہیں۔ کما مرّ وثانیاً — خلف الامام کی قید سے روایت نہ صحیح ہے اور نہ مشہور پھر اس سے تخصیص کیسی؟ وثالثاً — اختلاف نفسِ وجوب فاتحہ کا نہیں ہے جس کے لیے انھوں نے تین آیتیں پیش کی ہیں۔ (جو اصل مسئلہ سے بھی غیر متعلق ہیں) بلکہ اختلاف وجوب یا ترک فاتحہ خلف الامام میں ہے اور مقتدی کے لیے بحالتِ قرأت امام جواز اور اباحت قرأت کے لیے کوئی آیت موجود نہیں ہے محض کشید ہے بخلاف ترکِ قرأۃ خلف الامام کے کہ اس پر بالاجماع آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ دلیل ہے۔

دوسری دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک جانب کی حدیث پر اکثر امت کا عمل ہو اور دوسری جانب اتنا عمل نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جس پر جمہور امت کا اتفاق ہوگا۔ (ایضاً صـ۱) اور امام کے پیچھے قرأت کے ترک کرنے کا مسئلہ جمہور امت کے اقوال اور عبارات سے آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی مانعین قرأت خلف الامام کی احادیث اور مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۱ میں اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ بالکل ناکام ہے کیونکہ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید اور تطبیق و ترجیح کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں دلیلیں مساوی ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور نزاع محض فاتحہ کے ایجاب کا نہیں جس کی حدیث صحیح ہے بلکہ فاتحہ برائے مقتدی میں نزاع ہے اور آیت انصات قطعی ہے وہ بھلا حضرت ابوہریرہؓ کی ضعیف حدیث سے کیونکر منسوخ ہو سکتی ہے؟ اور معدودے چند حضرات صحابہ کرامؓ کے بغیر باقی تمام حضرات قرنِ اوّل میں خلف الامام

قرأۃ کے منکر تھے اور بعد کے لوگوں کی اکثریت کا تو مؤلف مذکور کو بھی دبی زبان سے اقرار ہے اور قرأۃ خلف الامام سے منع کرنیوالے بے شمار حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ تھے بلکہ وہ تو منہ میں پتھر اور مٹی ڈالنے پر بھی اتر سے ہوئے تھے اور احناف کا مذہب باحوالہ گذر چکا ہے کہ منع قرأۃ خلف الامام ہے۔ اس لیے ترک القرأۃ خلف الامام جمہور کا مسلک ہونا واضح ہے۔ لا شك فیه۔

تیسری دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی حدیث کے ساتھ آپ کا عمل بھی موجود ہو۔ اور دوسری طرف صرف آپ کا قول ہو تو آپ کی اس حدیث کو ترجیح ہوگی جس پر آپ کا قول اور فعل دونوں موجود ہوں۔ (کتاب الاعتبار ص ۱۱) اور باب دوم میں آپ کی بہت سی قولی صحیح اور مرفوع حدیثوں کے علاوہ حدیث ۱۳ میں آپ کا آخری عمل بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ آپنے نظر بظاہر ساری سورۃ فاتحہ ترک کی اور آپ کے سامنے حضرت ابو بکرہؓ کی عملی اور فعلی حدیث بھی نقل کی جا چکی ہے۔ اور ایسی کوئی روایت بسندِ صحیح نہیں پیش کی جاسکتی کہ آپ نے اقتداء کی حالت میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ہے۔ ومن ادعی فعلیہ البیان دیدہ باید، اگر قرأت خلف الامام کی روایتیں صحیح بھی ہوں تب بھی ان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی حالانکہ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ اس میں بھی مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۳۲ میں کلام کیا ہے مگر معقول نہیں کیونکہ باحوالہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آپ پہلے مقتدی تھے۔ پھر آپ نے امامت اختیار کی اور بالاجماع اور باقرارِ مؤلف مذکور قرأت سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اور وہی آپ سے چھوٹ گئی تھی اور بایں ہمہ نماز ہوگئی، قرأت سے نماز مراد لینا بے دلیل ہے اور یہ ترک فاتحہ کُلاً یا بعضاً عذر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اقتداء کی وجہ سے تھا۔

چوتھی دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی روایت قیاس کے موافق ہو اور دوسری قیاس کے موافق نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جو قیاس کے مطابق ہوگی (کتاب الاعتبار ص۱۱) اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا قیاس کے مطابق ہے، اور فریق ثانی کا بھی اس امر پر اتفاق ہے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت اور اسی

طرح مقتدیوں کو جہر بالقرأۃ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت اور جہر سے پڑھنا امام کا فریضہ ہے تو اس پر سورۂ فاتحہ کی قرأت کو قیاس کرلیں۔ ہاں اگر کسی صحیح سند کے ساتھ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرأت کرنے کی اجازت ہوتی تو الگ بات تھی۔ اس صورت میں قیاس نص کے مقابلہ میں باطل ہوتا۔ مگر خلف الامام کی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے، جیسا کہ بیان ہوگا۔ مؤلف خیر الکلام کا فاتحہ کو نماز کی صحت کے لیے شرط قرار دینا اور قرآن کی قرأت کو رکن قرار دینا بجا ہے مگر مقتدی کے لیے دونوں شرط نہیں اور نزاع صرف اس میں ہے اور ما زاد کو بالاجماع عدم رکن قرار دینا غیر مسلّم ہے قرأت کے سلسلے میں فاتحہ اور ما زاد کا ایک ہی حکم ہے امام اور منفرد کے لیے دونوں ہیں اور اور مقتدی کے لیے دونوں نہیں۔ اس لیے ترک قرأۃ للمقتدی ہی قیاس کے مطابق ہے۔

پانچویں دلیل: اگر ایک طرف کی حدیث مُحَرِّم اور دوسری طرف کی مُبیح ہو تو مُحَرِّم کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حظر مقدم باشد بر جانب اباحت (بدور الاہلہ ص ۱۸) اور یہ گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فاستمعوا لہ وانصتوا اور واذا قرأ فانصتوا وغیرہ امر کے الفاظ سے مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے برحق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم اور امر کا خلاف کرنا یقیناً حرام ہے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے جو تہدیدی الفاظ نقل ہو چکے ہیں (کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے منہ میں چنگاری ہو، خاک ہو، نتن ہوں، پتھر ہوں وغیرہ وغیرہ) وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اس لیے مُحَرِّم کو مُبیح پر ترجیح ہوگی۔ اور اس لحاظ سے بھی جمہور کی دلیل کا پلہ بھاری رہے گا۔ مؤلف خیر الکلام کا ایجاب فاتحہ خلف الامام کا دعویٰ کرکے اور ترکِ قرأت کو تحیر سے تعبیر کرکے ترجیح دینا مردود ہے کیونکہ ایجابِ فاتحہ خلف الامام کی جب سرے سے کوئی حدیث ہی صحیح نہیں تو پھر راجح و مرجوح کا کیا سوال؟ اور قرآن کریم و حدیث شریف سے ثابت ہے، کہ مقتدی کو خلف الامام استماع و انصات کا وجوبی حکم ہے پھر تخیر کہاں سے؟

چھٹی دلیل: اس امر پر تمام محدثینؒ اور فقہاءؒ کا اتفاق ہے جن میں خصوصیت سے حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ قابلِ ذکر ہیں کہ امام کا سُترہ مقتدیوں کو کافی ہے اور ان کو الگ سُترے

کی ضرورت نہیں ہے (دیکھئے بخاری جلد ا ص ۱۷ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۳۵۲) جب وہی امام، نماز اور مقتدی جمع ہیں تو امام کی قرأت مقتدیوں کو کیوں کافی نہیں ہے؟ جب کہ ماسوا علی الفاتحۃ کی قرأت میں سب کے نزدیک امام کفایت کرتا ہے۔[1] مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ سُترہ نماز کے ارکان اور شرائط سے نہیں قرأۃ نماز کے ارکان سے ہے..... الخ صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسے سُترہ رکن نہیں اسی طرح مقتدی کے لیے قرأت بھی رکن نہیں مطلق نماز کا جھگڑا نہیں بات مقتدی کی ہو رہی ہے اور جیسے سُترہ آگے ہونے کی وجہ سے بقول مؤلف خیر الکلام بمنزلہ کعبہ ہے اور سب کے لیے ایک ہی کعبہ کافی ہے تو اسی طرح امام بھی سب کے آگے ہوتا ہے اور قرأت میں سب کی کفایت کرتا ہے۔ لہٰذا امام کی قرأت اور سُترہ سب کے لیے کافی ہے۔

ساتویں دلیل: صاحبِ امر کے آخری قول و فعل سے بظاہر یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ پہلا قول اور فعل منسوخ قرار دیا جائے۔ اور اس سے کیا کم ہو سکتا ہے کہ اگر آخری عمل ناسخ نہ ہو۔ تب بھی ترجیح تو اس کو بہر حال ہو گی۔ جیسا کہ حضرت امام بخاریؒ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے وانما یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری جلد ا ص ۹۶)

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں، الامام یحمل عن المأمومین السھو وکذا القرأۃ عند الجمھور (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۶) امام سہو میں اور جمہور کے نزدیک قرأت میں مقتدیوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ اور حضرت عبد اللہ رضؓ بن عباسؓ نے ایک جنازہ پر بلند آواز سے قرأت کی۔ پھر ارشاد فرمایا، وانما جھرت لاعلمکم انھا سنۃ والامام کفاھا (منتقٰی ص ۲۶۴) میں نے جہراً اس لیے قرأت کی ہے تاکہ تمہیں اس کا سنت ہونا معلوم ہو جائے ورنہ امام کی قرأت کافی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث آتی ہے لا صلوٰۃ الا بخطبۃٍ کہ خطبہ کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی، حالانکہ فریقِ ثانی بھی متفق ہے کہ خطبہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۷۷) بہر حال جب امام ماسوا علی الفاتحۃ سُترہ، سہو اور خطبہ وغیرہ میں کفایت کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ باقرارِ فریقِ ثانی تو قرأت میں بھی یقیناً وہ کفایت کر سکتا ہے۔

یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سب سے آخری فعل ہی قابلِ عمل ہوگا۔ اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری نماز میں باقرار قاضی شوکانی رحؒ پوری سورۃ فاتحہ بحالت اقتدار ترک کی۔ مگر آپ کی نماز صحیح ہوگئی اور آپ کے آخری فعل کے حجت ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام کا حضور علیہ السلام کی ابتداءً اقتداء کا اور پھر ترک فاتحہ کُلاًّ یا بعضاً کا انکار کرنا بالکل مکابرہ ہے۔ جب یہ روایات سے ثابت ہے کہ امر تو انکار کا کیا معنیٰ؟ باقی نماز میں قیام وقعود اور نیابت وغیرہ میں عذر تو شریعت نے خود بتایا ہے مگر قرأت اور ترک قرأت میں عذر اور غیر عذر کا کوئی فرق نہیں کیا اس لیے قرأت یا ترک قرأت کو دیگر امور پر قیاس کرنا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے قیاس مع الفارق ہے جو قابل سماعت نہیں ہے۔

آٹھویں دلیل: آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الامام ضامن[1] امام ضامن اور کفیل ہے ضامن اور کفیل جب قرض وغیرہ ادا کردے تو اصل مقروض سبکدوش ہوجائے گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کے ابتداءً اس لیے جنازے نہیں پڑھائے تھے کہ وہ مقروض تھے اور ان کے پاس قرض کی ادائیگی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور جب ان کے قرض کو ان حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنے ذمہ لے لیا جو زندہ تھے۔ اور ان کے کفیل اور ضامن بن گئے تو آپ نے اصل کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے ان کا جنازہ پڑھا دیا۔

---

[1] یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الامام ضامن امام مقتدیوں کا ضامن اور کفیل ہے۔ یہ روایت ابوداود جلد ۱ ص ۸۴، ترمذی جلد ۱ ص ۲۹، معجم صغیر طبرانی ص ۱۲۳، اور مسند احمد جلد ۲ ص ۴۱۹ وغیرہ میں موجود ہے۔ صاحب تنقیح کہتے ہیں کہ مسند احمد کی روایت علیٰ شرط مسلم صحیح ہے اور علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سند صحیح ہے (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۵۷) علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ بزارؒ نے یہ روایت بیان کی ہے: ورجالہ کلھم موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے بھی مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الامام ضامن (الحدیث) علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ نے اور طبرانیؒ نے معجم کبیر میں یہ روایت بیان کی ہے ورجالہ موثقون طبرانی کے سب راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲)

(دیکھیے بخاری ومسلم وغیرہ) باقی باریک فقہی تدقیقات کا یہ مقام نہیں ہے ہم ان کو یہاں نہیں چھیڑتے۔ لہٰذا جب امام سورۂ فاتحہ کی قرأت کرلے تو مقتدیوں کو کافی ہوگی جیسے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت بالاتفاق مقتدیوں سے ساقط ہے اور امام کی قرآت ہی کفایت کرتی ہے۔ مؤلف خیرالکلام صہ ۵۳۵ میں لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا بہت سے آدمیوں نے سو سو روپیہ ادا کرنا ہو تو یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کفیل ان سب کی اور اپنی طرف سے ایک سو روپے دے کر سب کی ذمہ داری سے بری ہوجاتے ۔۔۔۔ الخ

الجواب: مگر یہ سب کچھ ان کی قلتِ فہم کا نتیجہ ہے کیونکہ یہاں ایک آدمی کا بہت سے آدمیوں نے نہیں دینا بلکہ کئی آدمیوں پر صرف سو روپیہ ہے اور اس کو کفیل ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ قرآت جماعت کی نماز میں صرف ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ میں تو فریقِ ثانی کو بھی مُسلّم ہے کہ امام اور کفیل سب کی طرف سے ادا کر رہا ہے۔ منفرد ہوتے تو ان کو خود پڑھنی ہوتی، لیکن یہاں بحث تو مقتدی کی ہورہی ہے اور اس پر سرے سے قرآت ہی نہیں جو ہے وہ امام ادا کر رہا ہے۔

نویں دلیل: امام طحاویؒ نے ترکِ قرآت خلف الامام پر متعدد مرفوع حدیثیں اور آثار حضرات صحابہ کرام رضؓ و تابعینؒ وغیرہم نقل کرنے کے بعد اپنی عادت کے مطابق نظر فقہی اور عقلی دلیل یوں بیان کی ہے۔ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ شریک ہوجائے اور سورۂ فاتحہ اس سے کلیتہً چھوٹ چکی ہو تو جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک (جس کی تحقیق اپنے مقام پر آئیگی۔ اور دو مرفوع روایتیں اور متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال پہلے نقل بھی ہوچکے ہیں) اس کی وہ رکعت بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر تکبیر تحریمہ اور قیام (جس میں کم از کم تکبیر تحریمہ ادا ہوسکتا ہو) کی طرح مقتدی پر سورۂ فاتحہ بھی پڑھنی لازم اور فرض اور رکن ہوتی تو جیسے تکبیر تحریمہ اور قیام اس سے ساقط نہیں ہوتے اسی طرح اس پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی فرض ہوتا اور بغیر اس کے اس کی نماز نہ ہوسکتی۔ حالانکہ جمہور کے نزدیک اس کی یہ رکعت بالکل صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب (محصلہ طحاوی جلد اصہ ۱۲۸) مؤلف خیرالکلام کہتے ہیں کہ رکوع میں ملنے سے رکعت کا ہوجانا ان احادیث کے منافی نہیں جن میں آتا ہے کہ نماز میں ایک بار فاتحہ پڑھنی چاہیے جیسا کہ ہدایہ اور فتح الباری کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔ ہاں ان احادیث کے منافی ہے

جن میں ہر ہر رکعت میں فاتحہ کا ذکر آتا ہے اس صورت کو خاص کر لیا جائے گا یا عذر شرعی پر محمول ہوگا۔ (محصلہ ص ۵۳۶)

الجواب: جس طرح یہ صورت رکوع والی رکعت کے منافی نہیں، اسی طرح یہ ان احادیث کے عین مطابق ہے جن میں قرأت صرف امام کا فریضہ بتلایا گیا ہے باقی مقتدی کے لیے ہر ہر رکعت میں بلکہ کسی بھی رکعت میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے نہ تو یہاں منافاۃ کا سوال ہے اور نہ تخصیص اور عذر شرعی پر حمل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

دسویں دلیل: بحر العلوم، حجۃ الاسلام اور شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح (المتوفی ۱۲۹۷ھ) بانی دار العلوم دیوبند نے عقلی رنگ میں یہ مسئلہ یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر چیز کا صرف ایک طول اور ایک ہی عرض ہوتا ہے۔ سو باعتبار طول کے ایک رکعت ایک نماز ہے اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور باعتبار عرض کے امام اور مقتدی کی نماز ایک ہے۔ تو یہاں بھی ایک ہی سورۂ فاتحہ کافی ہوگی جس کو امام ادا کر رہا ہے۔ اور اگر امام اور مقتدی کے لیے الگ الگ اور جُدا جُدا سورۂ فاتحہ ضروری ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ایک چیز کے لیے ایک سے زیادہ عرض ثابت ہو اور یہ اصول موضوعہ کے خلاف ہے (توثیق الکلام صہ ۹، تبغییر)، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ہر رکن چونکہ امام اور مقتدی کو الگ الگ ادا کرنا پڑتا ہے پس قرأت بھی ہر ایک کو الگ الگ ادا کرنی چاہیے۔ (بلفظہ صہ ۵۳۹)

الجواب: جب قرأت مقتدی کے لیے رکن ہی نہیں تو اس کے لیے الگ پڑھنے کا کیا سوال؟ مقتدی کا رکن تو صرف استماع و انصات ہے جس کو وہ ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت آپ حضرات کے نزدیک بھی مقتدی پر نہیں ہے۔

گیارھویں دلیل: مولانا موصوفؒ فرماتے ہیں کہ بسلسلۂ قرأت امام اور مقتدی کی مثال ایسی سمجھ لیں جیسے سواری اور مسافر، مسافر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ گاڑی، موٹر، بس، جہاز اور ٹانگہ وغیرہ میں اطمینان سے سوار ہو کر بیٹھ جائے۔ گاڑی وغیرہ حرکت کرے گی تو مسافر کی مسافت خود بخود طے ہوتی جائے گی اور مسافر کو ساتھ ساتھ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالذات حرکت گاڑی کی ہے مگر بالعرض مسافر کی۔ اور باوجودیکہ مسافر آرام کے ساتھ گاڑی وغیرہ میں

بیٹھا رہتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسافر نے اتنا راستہ طے کیا ہے۔ اسی طرح امام جو بمنزلہ گاڑی کے ہے قرأت کرتا جائے گا اور یہی قرأت مقتدی کو کافی ہو گی (توثیق الکلام ص۱، ص۲ تبخییص) مولانا کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کیونکہ ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت میں فریق ثانی بھی متفق ہے کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے اور اگر سورۂ فاتحہ کی قرأۃ مقتدیوں کو کافی نہ ہو تو اس مثال کے پیش نظر مطلب یہ ہو گا کہ ایک دو اشٹیشن تک مسافر گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا چلا جائے اور پھر گاڑی میں بیٹھ جائے۔ جہاں تک گاڑی کا تعلق ہے اس کا سفر خود بخود طے ہوتا جائے گا۔ لیکن طبعی، شرعی اور دیگر ضروریات میں خود کوشش اور کاوش کرنی پڑیگی۔ اور بغیر اپنی ہمت اور حرکت کے دیگر ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔ مشہور ہے کہ حرکت ہی میں برکت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب گاڑی کی مسافت طے ہو جائے گی تو اپنے گاؤں محلہ اور گھر تک پہنچنے کے لیے خود عمل کی ضرورت ہے، اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں باقی رکوع وسجود، تسبیح وتشہد وغیرہ میں مقتدی کو خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔ مؤلف خیر الکلام کا امام کی نماز کو حقیقت اور مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھ کر جواب میں دونوں کی نماز کو حقیقتہً سے تعبیر کرنا اور اس پر جواب کی بنیاد رکھنا بالکل غلط ہے نماز تو امام اور مقتدی دونوں کی حقیقتہً ہے، ہاں قرأت میں فرق ہے، امام حقیقی قرأت کرتا ہے اور مقتدی کی قرأت حکمی ہے اور ہم نے کتاب میں اس کی تصریح کر دی تھی کہ اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں ... الخ لہٰذا مؤلف مذکور کا ہماری عبارت سے مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھنا غلط ہے۔

بارھویں دلیل: شمس العلماء، مؤرخ اسلام علامہ شبلی نعمانیؒ (المتوفی ۱۳۳۲ھ) نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حالات میں ایک واقعہ نقل کیا ہے (جس کا خلاصہ راقم کی عبارت میں یہ ہے) کہ چند آدمی[1] مل کر مسئلہ خلف الامام پر امام صاحبؒ سے بحث کرنے آئے، آپ نے فرمایا کہ میں

---

[1] یہ واقعہ مناقب موفق جلد ا ص۱۱۷ و ص۱۷۲ میں مذکور ہے ان جماعۃ من اھل المدینۃ جاؤا الی ابی حنیفۃ رحؒ لیناظروہ فی القرأۃ خلف الامام اھ اور اسی طرح مناقب کردری جلد ا ص۱۲۱ میں بھی ہے اور نواب صاحبؒ بھی اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔ وحکایتی کہ از امام اعظمؒ در بارۂ الزام خصم باختیار یکی برائے مناظرہ از میان جماعۃ وبودن الزام او الزام جماعۃ نقل کردہ اند (باقی اگلے صفحہ پر)

اکیلا اتنے آدمیوں سے کیسے بحث کر سکتا ہوں ؟ ایک آدمی کو اپنا وکیل اور مختار بنالو کہ اس کی فتح تمہاری فتح اور اس کی شکست تمہاری شکست متصور ہو، چنانچہ وہ سب اس پر راضی ہو گئے اور اپنا ایک وکیل انھوں نے انتخاب کر لیا۔ جب وکیل نے بحث شروع کی۔ تو حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مسئلہ تو حل ہو چکا ہے۔ وہ بولا کیسے ؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب تم اکیلے سب کی طرف سے وکیل ہو کر گفت گو کر رہے ہو اور تمہاری بات ان سب کی بات سمجھی جاتی ہے تو اسی طرح امام کی قرأت سب مقتدیوں کی قرأت سمجھی جائیگی وہ سب شکست تسلیم کرتے ہوئے لاجواب ہو کر چلے گئے۔ (سیرت النعمان ا ص۵۶)

مبارک پوری صاحبؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ امام صاحبؒ کی طرف اس واقعہ کی نسبت غلط ہے۔ کیونکہ امام جب وکیل ہے تو قیام، رکوع، سجود، تشہد اور سلام وغیرہ جملہ امور میں امام کو وکیل ہونا چاہیے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص) لیکن مبارکپوری صاحبؒ کا یہ اعتراض محض ہیچ اور باطل ہے۔ اس کی پوری تشریح گذر چکی ہے کہ امام مقتدیوں کا وکیل صرف قرأتِ قرآن میں ہے، باقی امور میں ان کا وکیل نہیں ہے اور اس کو ایسا سمجھ لیں جیسے بادشاہ کے حضور میں ایک وفد اپنی معروضات پیش کرنے کے لیے حاضر ہو۔ گفت گو تو صرف وفد کا وکیل اور پارٹی لیڈر ہی کرے گا۔ لیکن ارکان وفد کی طرف سے پارٹی لیڈر کی تائید بھی ضروری ہے، قرأت قرآنِ کریم کو اصل معروضات اور تسبیحات و تشہد وغیرہ کو اس کی تائید سمجھ لیجئے۔

نواب صاحبؒ کی یہ عبارت نقل کی جا چکی ہے کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہمہ قرأت قرآنِ کریم است فقط (دلیل الطالب ص۲۹۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ و قول نبویؐ اذا قرأ فانصتوا و قول من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ دال است برآنکہ امام متحمل قرأت است از سامع (بدور الاہلہ ص ۵۱) اس لیے مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض

(باقی پچھلا صفحہ) لطیفۂ شاعرانہ و مجرد تجویز عقلی بنش نیست در مقام استدلال و احتجاج بنصوص قابل التفات نمی تواند شد اھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۴) ہم نے بھی اس واقعہ کو قرآن و حدیث کے دلائل کی مد میں پیش نہیں کیا بلکہ عقلی دلائل میں نقل کر کے نواب صاحبؒ کی عقلی تجویز کی تائید کی ہے۔

سراسر باطل ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد سوفی صدی صحیح ہے۔ تو لف خیر الکلام ص ۵۳۷ میں لکھتے ہیں کہ امام وکیل نہیں بلکہ مقتدیٰ ہے اور ہر نمازی صرف اپنے لیے نماز پڑھتا ہے اور ہر نمازی رب سے باتیں کرتا ہے اور مناجات صرف فاتحہ پڑھنے میں ہوتی ہے اور فاتحہ فرض ہے اور دعا ہے اور یہ امام اور مقتدی دونوں پر لازم ہے۔ (محصلہ)

الجواب: جب صحیح حدیث میں الامام ضامن آتا ہے تو اس کی کفالت اور ضمانت کا انکار کون سنتا ہے، وہ مقتدیٰ بھی ہے اور کفیل بھی ہے۔ مقتدیٰ تمام ارکان وافعال میں ہے اور کفیل صرف قرأت میں ہے اور نمازی نماز خدا تعالیٰ کے لیے پڑھتا ہے جس کا ثواب نمازی کو ملتا ہے اور بے شک نمازی اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے مگر وہ مناجات صرف ثناء اور تسبیحات وغیرہ ہی میں ہے قرأت میں تو اس کو صرف انصات واستماع کا حکم ہے جیسا کہ اس کے دلائل گذر چکے ہیں اور مناجات کو صرف فاتحہ میں بند کر دینا عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ سارا قرآن کریم اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اور سب تسبیحات اس سے سرگوشی ہے اور اوّل سے آخر تک نماز اس سے ہم کلامی ہے۔ باقی امور میں اصالۃً مقتدی خود عمل کرتا ہے اور قرأۃ میں اس کا امام وکالۃً سرگوشی کرتا ہے اور فاتحہ صرف امام پر لازم ہے۔ مقتدی کا فریضہ صرف انصات واستماع ہے، مقتدی پر فاتحہ فرض نہیں ہے۔ فاتحہ دعاء ہے، لیکن مقتدی حکماً دعا خواں ہے اور آمین سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

حضرات! ابھی ترجیحی، عقلی اور قیاسی دلائل اور بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، مگر ہمارا مقصد دلائل کا استقصاء اور استیعاب نہیں ہے، بلکہ عامۃ المسلمین کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ترک القرأۃ خلف الامام صرف احناف ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ جمہور اہلِ اسلام کا مسلک ہے اور جمہور اپنے اس محقق مسلک پر قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ واتباع تابعینؒ وغیرہم اور اجماعِ اُمت اور قیاس سے ٹھوس وزنی اور صحیح معیاری دلائل اور براہین پیش کرتے ہیں اور وہ ہرگز بلا دلیل نہیں ہیں جیسا کہ

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ہم بطور تبرک اس باب کو قرآن کریم کی ایک آیت کے ایک حصہ پر ختم کرتے ہیں، جیسا کہ پہلا باب بھی قرآن کریم کی آیت ہی سے شروع ہوا تھا۔ کہ اوّل بآخر نسبتے دارد۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا۔ اور آخر میں نہایت اِخلاص اور دلسوزی کے ساتھ فریق ثانی سے استدعا ہے کہ وہ اپنے اس غلو آمیز نظریہ سے باز آجائے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ اِس پوری کتاب کو پیشِ نظر رکھ کر انصاف سے فرمائیں کہ کس کس کی نماز باطل، کالعدم، بیکار اور ناقص ہوگی؟ غور تو کیجئے کہ جمہور امت کی نمازوں پر یہ حکم لگانا کیسی کھلی گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اور گویا اس اعلان کے مطابق جمہور امت نماز پڑھتے ہوئے بھی بے نماز ہی ٹھہرے اور تارک صلوٰۃ کے بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ کس مسلمان سے مخفی ہو سکتی ہیں؟ فریق ثانی نے احناف کے مقتدر علماء حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ و حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنی رح کی خدمت میں یہ اعلان پیش کیا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ راقم الحروف، دارالعلوم دیوبند کا خوشہ چین اور ان اکابر کے فضالہ علم اور پس خوردہ سے فیضیاب ہوا ہے۔ اس لیے اس حقیر پر یہ لازم تھا کہ اپنے محسن اکابر کا مسلک بیان کرتا اور ان سے سوءِ ظن کو دور کرتا۔ نیز فقیر فروعی مسائل میں اپنے اکابر کی طرح حنفی ہے۔ اس لیے فریق ثانی کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک ہمارے کسی حنفی بھائی کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کر کے انعام لے (بلفظہٖ فصل الخطاب ص۱) اور انعام کی بابت وہ یوں لکھتے ہیں اور مخالفین کو ایک ہزار روپے کا انعامی کھلا چیلنج دیا ہے (بلفظہٖ فصل الخطاب ص۱) اب فریق ثانی کو دیانتہً از خود ہی یہ انعام دے دینا چاہئے۔ ورنہ اگر ہم چاہیں تو قانونی اور آئینی طور پر لے سکتے ہیں اور انہیں دینا پڑے گا۔ اور اس سے کیا کم ہے کہ — ع: شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی

حضرات! آپ دیکھ چکے کہ ہمارا مسلک کیا ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں؟ — ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارمرا

آخری التماس۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ جس طرح جمہور اہلِ اسلام کے دلائل اور براہین پیش کرنے کا صحیح حق تھا، میں ادا نہیں کر سکا۔ اہلِ علم حضرات سے التماس اور التجاء ہے کہ وہ مجھے میری کوتاہیوں اور لغزشوں پر مطلع فرماتے رہیں۔ کیونکہ ایک نوعمر آدمی سے جس کو اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا بھی پورا احساس اور اقرار ہو۔ اور ایسے اہم مسئلہ میں جس میں حضرت امام بخاریؒ اور حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ ائمہ حدیث اور فرسانِ علم نے خامہ فرسائی کی ہو، لغزشوں کا صادر ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ سے نہایت اخلاص اور صدق دل سے دعا ہے کہ وہ حقیر کو جملہ جسمانی و روحانی، ظاہری اور باطنی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ، محدثینؒ اور فقہاءؒ اور جمہور اہلِ اسلام کی محبت اور اطاعت کا صحیح جذبہ عطا فرمائے جن کا ذکر موجبِ رحمتِ خداوندی ہے ؎

پلینے میں آگیا کہاں لپٹی ہیں اڑ کے مستیاں
اتنی ہے تند مئے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

جلد دوم میں فریقِ ثانی کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لیا جائے گا کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ ومتبعیہٖ اجمعین۔

ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر
خطیب جامع گکھڑ، ضلع گوجرانوالہ
۳ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ مطابق
۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء